

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

خواندنیوں کی آن لائن کتب خانہ

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

دسمبر

DECEMBER

2016



READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ماڈل: نینا بتول

میک اپ: رز بیوٹی پارلر

فوتو گرافی: موسیٰ رضا

WWW.PAKSOCIETY.COM

RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY

FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

www.paksociety.com

چیف ایڈیٹر
سکالر محمد محمود

ایڈیٹر
سعدی محمود جعفری، بلال جعفری
نمائندہ امریکہ، قراچ جعفری
E-Mail: frazafr@eol.com
نمائندہ UAE، عمیر علی جعفری
E-Mail: saqrh@emirates.net.ae
نمائندہ لندن، شبانہ آصف خان
آرٹسٹ: جنید انصار

رد الابطحس

مکتبہ
رد الابطحس

۱۱۹-۱۲۰-۱۲۱

۱۲۱-۱۲۰-۱۱۹

۱۲۱-۱۲۰-۱۱۹



مستقل سلسلے

۲۲۸	صالحہ محمود	۷	سند لیے	صالحہ محمود	ردائے جنت
۲۵۴	ثریا اقبال	۲۳۳	کچن	صدف سعد	ردا کی ڈائری
۲۵۷	شہلا مشائق	۲۳۳	سنگھار	شہلا مشائق	ذرا بھر سے کہنا
۲۳۵	نورین ملک	۲۴۰	اشعار	نورین ملک	خوشبو
۲۵۲	ادارہ	۲۳۷	دوستوں کے نام پیغام	نورین ملک	اس ماہ میں





دسمبر کی سردیاں پچھلی یادوں سے لپیٹی ہوئی کہانیاں زندگی کے ساتھ ہوتی ہے۔ موسم اور رنگ انسان کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ زندگی کا عکس انسان کے وجود سے کبھی الگ نہیں ہوتا۔ ہم کہیں بھی جائیں ہمارا سایہ ساتھ ہوتا ہے۔ رات کی تاریکیوں میں مجھے لکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ آج بھی قلم دست گریباں ہے، کتابوں میں رکھی ہوئی رنگین تصویریں جو میں رکھ کر بھول گئی تھی۔ اچانک بھولے بسرے دوستوں کی طرح کبھی کتابوں میں کبھی ڈائریوں میں مل جاتی ہیں۔ یہ صفحات زندگی کے ہیں جو کہ کبھی خود سے الگ نہیں ہو سکتے۔ یہ میری کہانی نہیں ہم سب کی کہانی ہے۔ کہانی تو ایک ہی ہوتی ہے۔ ہر قلم کی سوچ الگ الگ منفرد انداز میں صفحہ قرطاس پر اترتی ہے۔ سورنگ اور موسم سب ایک جیسے ہیں کہانی میں رنگ آپ نے بھرنے ہیں۔ دسمبر کی جتنی کہانیاں تھیں میں نے سب کو شامل اشاعت کیا تا کہ آپ یہ رات یہ موسم انجوائے کر سکیں۔ رب العزت سے دعا کریں کہ آنے والا اکل خیر کا ہو، جب سورج طلوع ہو تو خیر عافیت ہم اللہ کی امان میں ہوں۔ بھارت کی بڑھتی ہوئی شیطانی حرکتیں ہمارے ملک کی آزادی پر مشکلات پیدا کر رہی ہیں۔ اگرچہ صبر اور استقامت کا ہماری سرحدوں کے محافظ ثبوت دے رہے ہیں۔ پاکستانی ایٹمی طاقت کی زد میں بھارت کے بیشتر علاقے آسکتے ہیں۔ ایٹمی تباہ کاریاں دونوں ممالک کے لیے نقصان دہ ہیں لیکن جب گیڈر کی موت آتی ہے تو وہ پاکستان کا رخ کرے گا اور عالم انسانیت کے لیے عبرت کا نشان بن جائے گا۔ اللہ سے خیر کی دعا مانگتے رہنا چاہیے۔

موسم کی سردیاں اور یہ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اور خوش کن لمحات کا ایک تصور کہ رذا آپ کے پاس موجود ہے۔ سرد موسم میں سرد موسم کی کہانیاں گرم لمحوں اور آتش دان کے پاس کافیاں اور چائے کا مزہ دیں گی۔ سو جب تک کے لیے ہم آپ کو اللہ حافظ کہتے ہیں فون کالز اور سندھیوں میں رابطہ رکھیے نئے لکھنے والوں کو ہم ردا گائیڈ کارنر میں ضرور جگہ دیتے ہیں اور ہم انہیں یہ بات بتاتے ہیں کہ ایک ناول، ناولٹ، افسانہ کیسے لکھتے ہیں تو آپ ردا گائیڈ کارنر میں ضرور شامل رہیں۔ سندھیہ لکھیے یہ ہماری رہنمائی کا ایک ذریعہ ہے۔

آپی

WWW.PAKSOCIETY.COM

رواڈ انجسٹ [6] دسمبر 2016ء

دلچسپ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا۔ بالفاظ قرآنی (ترجمہ) ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔“ (الاحزاب: 21)۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند کرتا ہے جو قرآنی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرے۔

ایک صاحب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو بس قرآن کی تعلیمات کے مطابق تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تمام انسانوں کے لیے مثالی زندگی تھی لہذا جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شب و روز کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بھرپور زندگی گزاری ہے کہ ہر فرد بشر کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی ہے۔

انسانی زندگی میں خوشی، غمی، حادثات، بیماریاں اور صدمات ناگزیر ہیں۔ ہر انسان کو ان حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی یہ سارے مرحلے آئے اور ان مراحل میں سے گزرنے کا انداز نبوی زندگی میں موجود ہے۔ جن کاموں کو معاشرے میں گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کام کر کے انسانیت کے اس طبقے کے لیے مثال قائم کر دی

تاکہ کوئی بھیٹر بکریاں چرانے والا یا مزدور، موچی، اپنے آپ کو کم تر نہ سمجھے اور نہ ہی معاشرے میں اسے نیچ سمجھا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکپن میں بکریاں بھی چرائیں۔ گھر کے کام خود کیے۔ اپنے جوتوں کو مرمت بھی کیا۔ بلکہ دوسرے ضرورت مندوں کے بھی کام کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناداری کا زمانہ بھی دیکھا اور بڑے صبر و ثبات کے ساتھ وقت گزارا۔ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں کھانا پکنا اور بھی فاقہ ہوتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی امتیاز کو پسند نہ کرتے اور اپنی باری بر سوازی پر بیٹھتے اور دوسروں کے ساتھ پیدل بھی چلتے جب کہ بعض صحابہ سوار یوں پر ہوتے۔ سفر کے دوران کہیں پڑاؤ کرتے۔ کھانے پکانے کی نوبت آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کے ساتھ مساوی کام کرتے۔ بھی چولہا جلانے میں مدد دیتے اور بھی آگ جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کر کے لاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اجتماعی خوشی کے مواقع بھی آئے۔

مکی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی کی گئی۔ دشمنوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زخمی کیا۔ برا بھلا کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر ممکن طریقے سے ستایا اور مطالبہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام پھیلانے سے باز رہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آئی۔ نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گالی کا

جواب گالی سے دیا اور نہ دل شکستہ ہو کر اپنا مشن چھوڑا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خادم سے وہ کام کرواتے جو اگر خود کرنا پڑے تو اس میں عار محسوس نہ ہو۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم خادم کو وہی کھلاتے جو خود کھاتے اور وہی پہناتے جو خود پہنتے۔ خادم سے ہونے والی کوتاہیوں اور غلطیوں کو بڑی فراخ دلی سے برداشت کر لیتے اور خادم کو برا بھلا نہ کہتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ نکاح کیے اور اپنی تمام بیویوں کے ساتھ یکساں حسن سلوک کے ساتھ رہے۔ کسی بیوی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی طرح کی شکایت نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا ہے اور دیکھو میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب سے زیادہ حسن سلوک کرنے والا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں، جو سادگی کا نمونہ تھیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعتدال کی روش پسند کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال کی اجازت دی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چلا کہ ایک صحابی نے رات بھر جاگ کر نفل نمازیں پڑھنے کا ارادہ کیا ہے، دوسرے نے لگا تار روزے رکھنے کا ارادہ کیا ہے، ایک نے کہا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا تاکہ خاندانی زندگی سے دور رہ کر بس نیک کاموں میں لگا رہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کو تنبیہ فرمائی اور بتایا کہ میرا طریقہ دیکھو، رات کو سوتا بھی ہوں اور جاگ کر نماز بھی پڑھتا ہوں۔ لگا تار نفل روزے نہیں رکھتا، بلکہ کبھی رکھتا ہوں کبھی چھوڑتا ہوں۔ میرے بیوی بچے ہیں، ان کے حقوق بھی ادا کرتا ہوں۔

ایسا نہیں ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بیمار ہی نہ ہوئے ہوں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوتے تو دعائیہ کلمات پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتے اور وہ ہاتھ تمام جسم پر پھیر لیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماروں کی تیمارداری کی۔ تیمارداری کو اجر و ثواب کا باعث بتایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار کو یہ کہہ کر تسلی دیتے کہ یہ بیماری تمہارے گناہ مٹا دے گی۔

وفات کسی اپنے کی ہو یا پرانے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم خالق سمجھ کر صبر کے ساتھ برداشت کرتے۔ کسی عزیز کی وفات ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آبدیدہ ہو جاتے۔ اس صدمے کو اللہ کی رضا سمجھتے اور متعلقین کو صبر کرنے کو کہتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید دشمن ہو گئے (اس کی مذمت میں سورۃ الہلب نازل ہوئی) ان کے بیٹوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کو طلاق دے دیں۔ بیٹیوں کی طلاق کا یہ صدمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برداشت کرنا پڑا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتے داروں اور ہمسایوں کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو از حد تکلیفیں پہنچیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کیا گیا، کئی طریقوں سے ستایا گیا، راستے میں کانٹے بچھائے گئے، طعنوں و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔ ابولہب کا مکان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے ساتھ تھا وہ اور ان کی بیوی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمہ وقت دشمن تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی انتقامی کارروائی نہ کی بلکہ ان کی بدسلوکی کا جواب خوش اخلاقی سے دیا۔

صحرانوں کی انکلیوں میں عشق

”اچھا یہ بتاؤ عابد جوفا گیا؟“
”ہاں کل دوپہر کی فلائٹ سے انڈونیشیا چلا گیا۔“

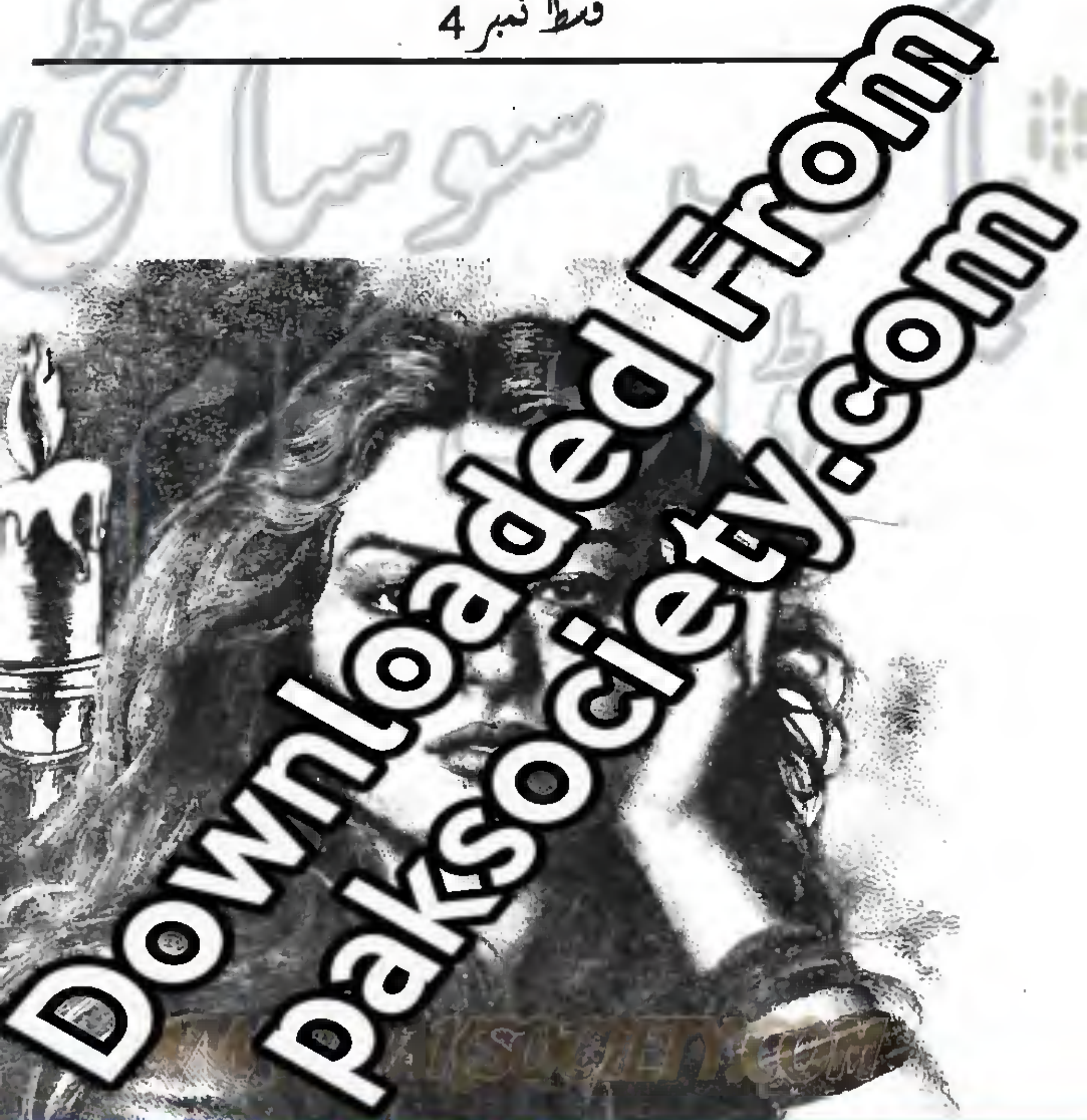
Downloaded from PAKSOCIETY.COM



”تم نے میری بات کی عابد جوفا سے کہ میں اس کے ساتھ پارٹنرشپ میں انٹرنشڈ ہوں۔“
”ہاں کی تھی وہ کہنے لگا کہ ایک دو ماہ میں پھر پاکستان کا چکر لگائے گا جب میرے ٹام کروڑ سے مینٹنگ
رکھے گا۔“ مفرورانہ مسکراہٹ سمیت وہ اسے دیکھ رہی تھی۔
”اچھا ہے نا جب تک شاید سہد وڑائچ بھی آجائے۔“
”سہد وڑائچ.....؟“ ذکی نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔
”یہ سہد وڑائچ کون ہے؟“

”ارے بھول گئے بتایا تو تھا سہد وڑائچ تھائی لینڈ، دبئی، سری لنکا اور لندن کا سب سے بڑا بیوپاری ہے۔
وہ حسن کو منہ مانگی قیمت میں خرید و فروخت کرتا ہے۔ سہد وڑائچ کی صبح کہاں گزرتی ہے اور رات کون سے

فقط نمبر 4



ملک میں یہ کوئی نہیں جانتا وہ ایک پل میں ادھر تو ایک پل میں ادھر اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“

”تم نے دیکھا ہے اسے؟“

”نہیں مگر سینا بائی بتا رہی تھی کے آج سے دس یا پندرہ سال پہلے وہ یہاں پاکستان آیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایسا غائب ہوا کوئی نہیں جانتا وہ کہاں ہے۔“

”تمہیں سہد و راج سے ملنے کی خواہش نہیں ہے؟“

”اپنے ٹام کروڑ سے ملنے اور دیکھنے کے بعد اب کسی سے کوئی ملنے یا دیکھنے کی خواہش نہیں ہے۔“ اس نے لپائی نظروں سے ذکی کو دیکھا۔

”اور ایک بات بتاؤ، تم کیا ایئر فورس میں ہو جو پولیس والوں کی طرح مجھ سے سوال پر سوال کر رہے ہو۔“ اس نے شاکی نظروں سے ذکی کو دیکھا تھا۔

”میری جان! وہ اس لیے کہ میں اب صرف تمہارے ساتھ ہر ملک میں گھوم پھرنا چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی کو صرف تمہارے ساتھ انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ ہر پل ہر لمحہ تمہارے لیے اپنے لیے یادگار بنانا چاہتا ہوں۔“ وہ نشلی باتوں کا جال اس پر بن رہا تھا اور وہ اس کی چالاک و شاطرانہ باتوں کی وادیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

”ٹام کروڑ آئی لو یو۔“

”لو یو ٹو۔“ وہ دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

”از ایلا.....!“ انیق واحدی نے بہت دور سے از ایلا کو آواز دی تھی۔ اتنے شور شرابے میں اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس تک انیق واحدی کی آواز نہیں پہنچ رہی ہے اس لیے اس نے ویٹر کے ذریعے بلایا۔

”میڈم! آپ کو وہاں انیق سر بلار ہے ہیں۔“ از ایلا جو ذکی کی نشلی باتوں میں بد ہوش تھی۔ ویٹر کی بات پر چونک گئی اس نے پہلے ویٹر کو پھر رخ موڑ کے دور کھڑے انیق واحدی کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اشارے سے اسے بلارہا تھا۔ از ایلا سمجھ گئی کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

”ایکسیکوز می۔“ از ایلا، ذکی کو ایکسیکوز کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے انیق واحدی کی طرف بڑھی۔

”سب خیریت تو ہے، اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟“

”بات ہی کچھ ایسی ہے پریشانی والی تم سنو گی تو تم بھی پریشان ہو جاؤ گی۔“

”اب پہیلیاں بھجوانا بند کرو اصل بات کرو۔“ وہ زچ ہو گئی تھی کیونکہ وہ اس وقت اپنے پسندیدہ شکار کو جال میں پھنسا رہی تھی۔

”یہاں نہیں سینا بائی کے پاس چلو وہیں کرتے ہیں بات۔“

”اچھا۔“ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ ذکی اسی کی جانب بغور دیکھ رہا تھا۔ از ایلا کے دیکھنے پر اپنا آدھا گلاس بجاڈر تک اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

”چلو ٹھیک ہے تم چلو میں پانچ منٹ میں پہنچتی ہوں۔“

”تم سمجھ نہیں رہی ہو از ایلا! ہمارے پاس وقت نہیں ہے تم اپنے ٹام کروڑ سے بعد میں مل لینا مگر ابھی نی الحال میرے ساتھ چلو۔“ انیق واحدی کو ہلکا سا غصہ آ گیا۔

”او کے بابا چلو۔“ وہ پھر بغیر ذکی سے ملے انیق واحدی کے ہمراہ ہوئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ انجسٹ [12] دسمبر 2016ء

”کیا بکواس کر رہے ہو ایسے کیسے ہو سکتا ہے ان ساری لڑکیوں کو پانی کی بوتل پر چڑھانے کے بعد میں نے ہی اس پانی والی بوتل کو روانہ کیا تھا اور عابد جوفا بھی میرے سامنے ہی ایئر پورٹ کے اندر تک داخل ہوا تھا۔ جب مجھے تسلی ہو گئی کہ عابد جوفا جہاز میں بیٹھ گیا ہے۔ جہاز فلائی کر گیا ہے تب ہی میں وہاں سے ہٹی ہوں۔“

”یہی بات سمجھ نہیں آرہی کہ اگر عابد جوفا ایئر وینیشیا نہیں گیا تو کہاں گیا ہے۔“ جتنا حیران پریشان انیق واحدی تھا اس سے کہیں زیادہ از ایلا اور سنیتا بانی تھیں۔

”ایک بات بتاؤ تمہیں کیسے پتا چلا کہ عابد جوفا ایئر وینیشیا نہیں پہنچا؟“ سنیتا بانی کب سے یہ سوال کرنا چاہ رہی تھی۔

”پچھلے چار گھنٹے سے عابد جوفا کی گرل فرینڈ صنم ربی مجھے کوئی سو بار کال کر چکی ہے اور وہ اس قدر غصے میں ہے کہ بس نہیں چل رہا موبائل سے نکل کر ہی مجھے شوٹ کر دے۔“ انیق واحدی نے دونوں کو باری باری دیکھا تھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے یہ کام کس کا ہو سکتا ہے؟“ از ایلا کے چہرے کا بھی رنگ فق ہو گیا تھا۔

”یہی تو مجھے بھی سمجھ نہیں آرہا۔“ اس نے پرسوج نظروں سے از ایلا کو دیکھا۔

”اچھا ایک بات بتاؤ عابد جوفا پاکستان آیا ہے یہ بات کس کس کو معلوم تھی؟“

”ہم تینوں کے علاوہ شبنم جانتی تھی۔“ از ایلا نے جھٹ کہا۔

”شبنم.....! کہیں شبنم نے تو پولیس کو انفارم نہیں کیا۔“

”نہیں..... نہیں شبنم ایسا کبھی نہیں کرے گی اس کو پھلا عابد جوفا سے کیا نقصان تھا۔ بلکہ اس کا توفانہ ہی کر کے گیا ہے۔“ سنیتا بانی نے فوراً شبنم کی طرف داری کی تھی۔

”تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو سنیتا بانی؟“ انیق واحدی نے سوالیہ نظروں سے سنیتا بانی کے میک اپ سے کیے گئے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔

”وہ اس لیے کیونکہ میں شبنم کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ وہ مرنے کو جائے گی مگر غداری نہیں کرے گی۔“

”چلو تم کہتی ہو تو میں مان لیتا ہوں۔“ انیق واحدی نے کہا۔

”مگر مجھے پھر بھی شک ہے شبنم پر۔“ از ایلا کو تو ویسے بھی اس سے چڑھتی تھی۔

”اچھا ایک بات اور بتاؤ تم اپنے نام کروڑ کو کتنا جانتی ہو۔ جسے ابھی تک اپنے حسن کے جال میں پھانس نہیں سکی ہو۔“ انیق واحدی نے طنزیہ نظروں سے از ایلا کے چمکتے خوب صورت چہرے کو دیکھا تھا۔ ”یہ تم مجھ سے کس لب و لہجے میں بات کر رہے ہو۔ بھول گئے ابھی جو نام کروڑ نے مجھے پچاس لاکھ کا چیک دیا تھا۔ اس میں سے آدھی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ڈالی ہے۔“ از ایلا کو انیق واحدی کا یہ تصحیک آمیز انداز سخت ناگوار لگا تھا۔

سنیتا بانی نے حیران نظروں سے از ایلا کو دیکھا کیونکہ یہ والی بات اس کے علم میں نہیں تھی۔

”پچاس لاکھ.....! از ایلا! تو نے مجھے تو یہ بات نہیں بتائی تھی۔“ سنیتا بانی کو اپنا حصہ نہ ملنے کا دکھ تھا۔ غم ستا رہا تھا کہ اسے از ایلا نے حصہ کیوں نہیں دیا۔

”ہاں ابھی دو دن پہلے ہی نام کروڑ نے مجھے پچاس لاکھ کا چیک دیا ہے اور فارکانڈ انفارمیشن کے نام

کروڑ ایک بزنس ٹائیکون ہے وہ بھی ہماری ہی کلاس کا ہے۔“ از ایلا نے تلخی سے انیق واحدی کو دیکھا تھا۔
 ”ہماری کلاس کا مطلب؟“ از ایلا کے رخ انداز کی اس نے رتی بھر بھی پرواہ نہیں کی تھی۔
 ”وہ عابد جوفا سے پارٹنر شپ کرنا چاہتا ہے مگر عابد جوفا نے کہا کہ وہ اگلے ماہ پھر چکر لگائے گا اور تم کچھ اور
 کہہ رہے ہو اور غلط سمجھ گئی رہے ہو۔“ از ایلا نے ناراضی سے رخ موڑ لیا تھا۔ انیق واحدی کو اس کی ناراضی
 بہت کھلی تھی وہ اس کو ناراض کر کے اپنے پیروں پر کھلاڑی نہیں مارنا چاہتا تھا۔
 ”آئی ایم سوری میری جان! میں نے کچھ زیادہ ہی اوور ری ایکٹ کر دیا۔“ انیق واحدی نے از ایلا کے
 گلے میں اپنا بازو ڈالا تھا۔

”چل از ایلا! اب مان جاوہ منا تو رہا ہے۔“ سنیتا بائی نے بھی از ایلا کی ناراضی دور کرنا چاہی۔
 ”او کے مان جانی ہوں مگر اس سے کہہ دو آج کے بعد مجھ سے اس انداز میں بات نہیں کرے۔“ اس نے
 روٹھے پن سے کہا۔
 ”پراس نہیں کروں گا۔“ اس نے جھک کر از ایلا کے رخسار پر اپنے لب رکھ دیے۔ از ایلا مسکرا دی۔
 ساتھ سنیتا بائی کا بھی بے ہنگم تہقہہ ہال کمرے میں گونجا تھا۔
 ”اب ہم اصل پوائنٹ تو بھول ہی گئے۔“ انیق واحدی نے اچانک سے کہا۔
 ”وہ کیا؟“

”یار اس بلا کا کیا کروں؟“
 ”کس بلا کا؟“ دونوں نے نا سنجھی کی کیفیت میں انیق واحدی کو دیکھا تھا۔
 ”صنم رلی جس نے میری جان کھائی ہوئی ہے۔“
 ”ٹھیک کہتے ہو تم۔“
 ”یہ تو پھر سے اس کا فون آگیا۔“ انیق واحدی نے اپنا سیل فون ان دونوں کے آگے کیا جہاں صنم رلی کی
 کال آرہی تھی۔

”میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ انسپکٹر از کار علوی کے ہاتھ اگر عابد جوفا لگ گیا تو عابد جوفا کی لاش بھی نہیں
 ملے گی۔“

”ایسا کیا طرم خان ہے وہ انسپکٹر از کار علوی۔“
 ”تم اسے جانتی نہیں ہو اس لیے کہہ رہی ہو۔“
 ”ارے از ایلا کے ہوشربا حسن سے کوئی آج تک بچا ہے۔ میرے خسن کا زہر جس نے چکھا ہے وہ
 میرے قدموں میں ڈھیر ہوا ہے۔“ از ایلا نے مغرورانہ انداز میں انیق واحدی کو دیکھا تھا۔
 ”وہ تو ہے دیکھ لو اب میں بھی پوری طرح تمہارے حسن کا اسیر ہوں۔“ انیق واحدی نے کہتے اس کی
 عریاں کمر میں بازو ڈال کر اس کی گردن پر جا بجا نشان چھوڑنا چلا گیا تھا۔
 ”کہو تو میں چلی جاؤں۔“ سنیتا بائی ہستی ہوئی دونوں کی چھیڑ خانی دیکھنے لگی۔

”ہاں سنیتا بائی! تو جا اور دروازہ بند کر دینا آج رات میں یہیں رکنے والا ہوں بہت دن ہو گئے از ایلا کے
 ساتھ وقت گزارے۔“ وہ از ایلا کے چہرے پر جھکتا چلا گیا تھا۔ از ایلا مسکرا دی۔ سنیتا بائی اپنا بھاری بھر کم و جو
 اٹھائے وہاں سے چلی آئی تھی۔

”میرا خیال ہے ہم عابد جوفا اور صنم ربی کو ڈسکس کرنے والے تھے۔“
 ”چو کہے میں ڈال ان کو اس وقت، بعد میں دیکھیں گے ابھی تو مجھے صرف اور صرف یہ جام پینا ہے۔“
 اس نے ازا بیلہ کے پورے جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا تھا۔

☆.....☆

”کیا بات ہے اماں! کیا سوچ رہی ہو؟“ اجیارہ نے کپڑے دھونے کی مشین لگائی ہوئی تھی۔ وہ مشین میں صرف اور کپڑے ڈال رہی تھی مگر نظر بلیقیں آراء پر بھی تھی جو تخت پر بیٹھی کسی بہت ہی گہری سوچ میں غلطاں تھیں۔ اجیارہ وہیں بلیقیں آراء کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”آں..... ہاں..... نہیں کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ چونک کر اجیارہ کا چہرہ دیکھنے لگی تھیں۔
 ”نہیں اماں! کوئی تو بات ہے کوئی پریشانی ہے جو تم کو پریشان کر رہی ہے۔“ اجیارہ نے بلیقیں آراء کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”مجھے نہیں بتاؤ گی؟“
 بلیقیں آراء نے ایک گہری سانس لی۔ ”زینت کا انتظار کر رہی ہوں آج پندرہ دن ہو گئے مگر ابھی تک زینت نہیں آئی۔“

زینت خالہ کا تو اجیارہ کو بھی انتظار تھا وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تھا حالانکہ لڑکے والے اسے پسند کر گئے تھے مگر ابھی تک فون کر کے انہیں اپنے گھر آنے کو نہیں کہا اور نہ ہی زینت خالہ آئی تھیں۔
 ”ہو سکتا ہے کسی کام میں مصروف ہوں۔“

”پھر بھی تھوڑی دیر کو تو آتی وہاں کیا بات ہوئی کچھ تو بتاتی اس رشتے کے لیے میں بہت خوش ہوں۔“
 اسی اثناء میں دروازے پر دستک بھی ہوئی اور واشنگ مشین کی بیل بھی۔ زینت خالہ اندر داخل ہوئیں۔
 اجیارہ نے خوش اخلاقی سے انہیں سلام کیا تھا۔

”السلام علیکم زینت خالہ!“
 ”وعلیکم السلام بیٹی جیتی رہو خوش رہو اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔“ زینت خالہ کی پڑمردہ مرجھائی سی آواز افسردہ سا چہرہ اجیارہ کے دل میں کچھ کھٹکا سا ہوا۔ کوئی انہونی ہو گئی ہو شاید، وہ وہاں سے کھڑی ہو گئی اور مشین میں سے کپڑے نکالنے لگی۔

”سلام بلیقیں آراء بہن۔“ زینت تھکی تھکی سی بلیقیں آراء کے پاس دونوں پیراؤں پر اٹھا کے بیٹھ گئی۔
 ”وعلیکم السلام! زینت کہاں غائب ہو گئی تھیں تم۔“ زینت کا بجھا بجھا چہرہ دیکھ کر زینت کے دل میں بھی کچھ شک سا ہوا مگر اپنا وہم سمجھ کر جھٹکا دیا۔

”بلیقیں آراء بہن اصل میں.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں اور وہیں کھڑی اجیارہ کو دیکھنے لگیں۔
 زینت کی نظروں کا اشارہ بلیقیں آراء سمجھ گئی تھیں۔

”اجیارہ!“

”جی اماں!“

”بیٹا! زینت کے لیے اور میرے لیے جائے تو لے آؤ۔“
 ”جی اچھا اماں!“ اجیارہ کو بھی جاننے کی جستجوئی آغواںات لگتا ہے اس لیے وہ کچن میں تو آ گئی مگر کھڑکی

کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

”ہاں زینت! بولو سب خیریت تو ہے نا تم مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہو۔“ بلقیس آراء نے بے صبری سے کہا تھا۔ ان کے لب و لہجے میں آنکھوں میں کیا کیا سوالات تھے زینت سب جانتی اور سمجھتی تھیں۔

”بلقیس بہن میں اجیارہ کے لیے انشاء اللہ اس سے بھی اچھا اور بہترین رشتہ لاؤں گی۔“ کتنی مشکلوں سے زینت نے کہا تھا وہی جانتی تھیں۔

”میں کبھی نہیں زینت! اس بات کا کہنے کا مقصد ہے ابھی جو رشتہ لائی تھیں اس کا کیا ہوا کیا کہا ان لوگوں نے۔“

”چھوڑو نا بلقیس بہن! وہ لوگ ہماری اجیارہ بیٹی کے لائق ہی نہیں تھے۔“

”لائق نہیں تھے مطلب ایسا کیوں کہہ رہی ہو زینت کھل کر صاف صاف بات کرو میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔“ بلقیس آراء کے دل میں ہول اٹھنے لگے تھے۔

”میں تمہیں نہیں بتانا چاہ رہی تھی تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو بتاتی ہوں ان کم ظرف، بد نصیبوں نے ہماری اجیارہ بیٹی پر الزام لگایا ہے، بہتان لگایا۔ نہایت ہی گھٹیا لوگ ہیں، مجھ سے ہی پہچاننے میں غلطی ہو گئی۔“

زینت کی آنکھوں میں نمی سی بھرنے لگی تھی۔

”ک..... کی..... کیا..... الزام..... زینت؟“ بلقیس آراء کے جسم سے تو جیسے روح ہی نکلنے لگی تھی۔

”یہی کہ اجیارہ کا کسی رکشے والے سے چکر چل رہا ہے اور ہمیں ایسی بد کردار آوارہ صفت کی بہو اپنے بیٹے کے لیے نہیں چاہیے۔“ زینت کا دل خون خون ہو گیا تھا۔

”کیا.....؟“ بلقیس آراء پر تو جیسے آسمان ٹوٹ کے گرا ہو زمین پیروں تلے کھسک گئی ہو۔ اتنا بڑا الزام ان کی معصوم بیٹی پر وہ تو شبنم کے پہلے قطرے کی طرح صاف و شفاف کردار کی مالک ہے تو پھر اتنا بڑا الزام، بہتان کیوں..... کیا وجہ ہے۔“

اندرا اجیارہ کے سر پر بھی ایسا لگا کہ اس گھر کی ساری مضبوط دیواریں آگریں ہوں۔ کھڑکی کی چوکٹ نہ تھام لی ہوئی تو یقیناً وہ زمین بوس ہو چکی ہوتی۔

”بلقیس بہن!“ زینت نے بلقیس آراء کی سکتہ جیسی کیفیت دیکھی تو گھبرا کے رہ گئیں۔

”بے شک منع کر دیتے اس رشتے سے مگر اتنا بڑا الزام گھٹیا بہتان تو نہیں لگاتے میری معصوم پاکیزہ بچی پر۔“ بلقیس آراء کی آنکھوں سے چند موتی ٹوٹ کر گرے تھے۔

”اجیارہ بیٹی کی معصومیت پاکیزہ صاف و شفاف کردار کی تو میں بھی قسم کھاتی ہوں مگر ان لوگوں کو کیا غلط فہمی ہوئی کس نے جا کر غلط بیانی کی میں نہیں جانتی۔“ زینت کی آنکھوں میں بھی اس رشتے کا نکل جانے کا افسوس اور دکھ تھا۔

”میری اس دس سالہ فیلڈ میں یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ کسی کی بیٹی پر ایسا گھٹیا الزام لگا کر لڑکی کو رنجیکٹ کیا گیا ہو۔ وہ بھی اجیارہ بیٹی.....! جسے میں سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔ عزیز رشتہتی ہوں۔“ بلقیس بہن میری کوئی بیٹی تو نہیں مگر یہ میرا اللہ گواہ ہے کہ اجیارہ کو میں اپنی بیٹی سمجھتی ہوں بلکہ بہت پیاری ہے مجھے اجیارہ بیٹی۔“ زینت کی آنکھوں سے اشک سے بہنے لگے تھے۔

”میں جانتی ہوں زینت کے تم اجیارہ کو بہت چاہتی ہو مگر میری با کردار بیٹی کے ساتھ ایسا ہو گا یہ تصور میں

بھی نہیں سوچا تھا۔ ہم شریف اور خاندانی لوگوں کے لیے یہ بہت بڑی بات ہے کہ کوئی ہماری عزتوں پر انگلی اٹھائے۔“

”اماں!“ پیچھے سے اجیارہ نے بلقیس آراء کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ بلقیس آراء نے پلٹ کر دیکھا۔
”میری بچی۔“ بلقیس آراء نے سسکتے ہوئے اپنی دونوں بائیں پھیلا دیں۔ اجیارہ ان میں سا گئی۔ اجیارہ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

”میری معصوم پھولوں جیسی بیٹی پر جس نے بھی اتنا گھٹیا الزام لگایا ہے اللہ اسے ضرور سزا دے گا۔“ انہوں نے اپنے سینے میں چھپی اجیارہ کے سر پر بوسہ دیا تھا۔

”تم فکر مت کرو بلقیس بہن! انشاء اللہ ہماری اجیارہ کا نصیب بہت روشن ہوگا۔ اتنا شاندار کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔“ زینت نے شفقت سے اجیارہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

وہ تو شکر تھا کہ دعا آج گھر میں نہیں تھی ورنہ بلقیس آراء جانتی تھیں وہ خوش ہوتی اجیارہ کے رشتے کا ٹوٹ جانے پر۔

”ان شاء اللہ.....“ بلقیس آراء نے دل سے دعا کی تھی۔

”اب چھوڑیں اس قصے کو میں چائے لے کر آتی ہوں اور ساتھ زینت خالہ کی پسند کے شای کباب بھی۔“ اس نے بمشکل اپنے دل کو سنبھالا تھا اور وہاں سے اٹھی کچن میں چلی آئی۔ زینت اور بلقیس آراء اپنی باتوں میں لگ گئیں۔

”السلام علیکم زینت خالہ!“ اسی دوران دعا اپنی ماں کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کی چپکتی آواز پر زینت نے عجیب سے انداز میں اسے دیکھا تھا اور سر کے اشارے سے جواب دیا۔

”چلو اچھا ہوا تم یہاں ہی مل گئیں تو تمہارا کارڈ میں تمہیں یہیں دے دیتی ہوں۔“ دعا نے اپنی ماں سے شادی کا کارڈ لے کر زینت خالہ کے آگے بڑھایا۔

”کیسا کارڈ؟“ زینت نے کارڈ لے کر اس کا خوشی سے چمکتا چہرہ دیکھا تھا۔
”ارے میری بیٹی کی شادی کا کارڈ اسی ہفتے میری بیٹی کی شادی ہے۔ اللہ کا کریم ہے بہت اچھا رشتہ آیا ہے میری بیٹی کا۔ چٹ پٹ بیاہ والا حساب ہے۔“ دعا کی ماں فخریہ انداز میں بول رہی تھیں۔

”لو بلقیس یہ تمہارا کارڈ ہے۔“ انہوں نے ایک کارڈ بلقیس آراء کی سمت بڑھایا تھا۔
بلقیس آراء نے وہ کارڈ لے خاموشی سے لے لیا۔

”مبارک باد نہیں دوگی بلقیس!“ دعا کی امی نے بلقیس آراء کا پڑھنا سا چہرہ دیکھا تھا۔
”ہاں کیوں نہیں بہت بہت مبارک ہو انشاء اللہ میں ضرور آؤں گی۔“ جھوٹی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے بلقیس آراء نے انہیں دیکھا تھا۔

”کوثر! بڑی جلدی کر رہی ہو اپنی بیٹی کی شادی، کس نے لگا دیا رشتہ۔“ زینت نے شکی نظروں سے دعا کی امی کو دیکھا تھا۔

”بس زینت! اللہ کی دین سے رشتہ آگیا اور میں نے ذرا دیر کے بغیر ہاں کر دی بھلا کون اتنے اچھے رشتے چھوڑتا ہے اور ایک بات بتاؤ تمہیں کیا خوشی نہیں ہوئی میری بیٹی کی جلدی شادی ہونے کی حالانکہ تم تو خود رشتے لگاتی ہو۔“ کوثر کو زینت کا انداز سخت ناگوار گزرا تھا۔

”بس زینت! اللہ کی دین سے رشتہ آگیا اور میں نے ذرا دیر کے بغیر ہاں کر دی بھلا کون اتنے اچھے رشتے چھوڑتا ہے اور ایک بات بتاؤ تمہیں کیا خوشی نہیں ہوئی میری بیٹی کی جلدی شادی ہونے کی حالانکہ تم تو خود رشتے لگاتی ہو۔“ کوثر کو زینت کا انداز سخت ناگوار گزرا تھا۔

”نہیں.....! کیوں خوشی نہیں ہوگی اللہ ہر لڑکی کا نصیب اچھا کرے۔ مگر تم ابھی پچھلے ہفتے پہلے ہی پریشان تھیں اپنی بیٹی کے لیے مجھ سے کہا تھا کہ کوئی اچھا رشتہ لگا دوں۔“

”ہاں کہا تھا مگر اللہ کو منظور نہیں تھا کہ تمہارے ہاتھوں میری بیٹی کا رشتہ لگتا اس لیے اس نے خود ہی بھیج دیا اتنا اچھا رشتہ اب اگر اور اچھے رشتے کا انتظار کرتی تو میری بیٹی تو بیٹھی ہی رہتی اور میں اتنی نہ عقل بند ماں تو ہوں نہیں کہ اپنی بیٹی پر یہ ظلم کروں۔“ ان کا طعنان کا اشارہ وہاں بیٹھی بلقیس آراء، زینت اور اجیارہ اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔

”اچھا خیر میں بھی کس بحث میں پڑ گئی مجھے تو یہ کارڈ دینا تھا اور دعا کو بھی اپنے گھر لے جاتی آخر کو ایک ہی بہن ہے تیار یاں بھی اسی کو کرنی ہیں۔“

”ای امی آپ رکیں میں بس اپنا بیک تیار کر کے لاتی ہوں۔“ دعا خوشی سے مسکراتی ہوئی اپنے بیدروم کی سمت بڑھ گئی۔

”اور سناؤ بلقیس اجیارہ کا کہیں رشتہ و شہ لگا۔“ زخموں پر نمک پاشی کرنا تو کوثر کا بہترین مشغلہ تھا۔

”ہاں میں دیکھ رہی ہوں جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ ملتا ہے ہم بھی انتظار نہیں کریں گے۔“ بلقیس آراء سے پہلے زینت نے جھٹ سے کہا تھا۔

”ویکھو بلقیس! میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اچھے رشتے سے تمہاری کیا مراد ہے۔ بھی سب کو سب کچھ تو نہیں مل جاتا ناب لڑکا اچھا ہے اس کا گھر اپنا ہے تو نوکری یا اپنا کاروبار اپنا نہیں یا یہ دونوں اچھے ہیں اور گھر کرائے کا تو پھر لڑکی گھر ہی بیٹھی رہے گی۔“

”ہوں اوں.....“ زینت اس کی ان کڑوی زہریلی باتوں کا جواب ابھی اچھی طرح کھری کھری سنا کے دے دیتی اگر بلقیس آراء نے اس کا ہاتھ دبا کر اشارے سے خاموش رہنے کے لیے نہ کہا ہوتا۔

”کوثر ہم تمہاری بیٹی کی شادی میں ضرور آئیں گے۔“ بلقیس آراء نے بات ختم کرنے کو کہا تھا۔

”چلو امی! میں نے اپنا سامان رکھ لیا۔“ دعا اپنا بڑا سا سوٹ کیس گھسیٹتی ہوئی لے آئی تھی۔

”اچھا بھی ہمیں اجازت دیجیے باہر رکشہ کھڑا ہے دعا کا سامان چھوڑ کے پھر ہمیں مارکیٹ کو بھی نکلنا ہے۔“

کوثر کھڑی ہو گئی اور باہر کی جانب رخ موڑ کے اچانک سے پلٹی تھیں۔

”اجیارہ تم بھی ضرور آنا بیٹا!“

”جی آئی میں کوشش کروں گی۔“ دھیمے سے جواب دیا۔

”چلیں امی دیر ہو رہی ہے۔“

”ہاں ہاں چلو۔“ وہ دونوں پھر کی نہیں چلتی چلی گئیں اجیارہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ان کا مذاق اڑا رہی ہوں۔ ان کے منہ پر طمانچہ مار کے گئی ہوں۔

”کیوں خاموش کر دیا بلقیس بہن تم نے مجھے ایسی کھری کھری سنائی کہ زندگی بھر یاد رکھتی۔“

”زینت! کچھڑ میں پتھر پھینکنے سے پہنچیں اپنے ہی دامن پر آتے ہیں۔ کوثر نے یہ سب بول کر اپنے منہ کا مزہ لیا ہے اگر ہم بھی اسی کی جہالت میں اس کا ساتھ دیتے تو اس میں اور ہم میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ رہا میری بیٹی کا تو یقیناً میری اجیارہ بیٹی کا نصیب بہت اچھا ہے مجھے اپنے اللہ پر پورا پورا بھروسہ ہے بے شک وہ دلوں کے حال جانتا ہے۔“ بلقیس آراء نے اجیارہ کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگا کر کہنے سے لگا لیا تھا۔

”ان شاء اللہ بلیس بہن! ہماری اجیارہ محل میں راج کرے گی۔“ زینت نے بھی جھک کر اجیارہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”ایک بات اور کہوں گی مگر بردامت ماننا۔“

”ہاں کہو۔“

”مجھے تمہاری بہو ایک آنکھ نہیں بھاتی دیکھا نہیں تم نے نہ سلام نہ دعا اور نہ تم سے اور اجیارہ سے مل کر گئی نہ ہی بول کر گئی۔“

”اس کی جتنی عقل تھی اس نے کام کیا۔“

”میں تو تمہیں آخری وقت تک منع کرتی رہی کہ مت کرو یہ شادی شہیر کے لیے میں تمہیں لڑکی دکھاؤں گی مگر تم نے میری ایک نہ مانی۔ نیکی کا تمہارے سر پر بھوت سوار تھا۔“

”کیا کر سکتے ہیں اب زینت اس کو بھی اسی گھر میں آنا تھا۔ اس کا نصیب جو شہیر کے ساتھ لکھا جا چکا تھا۔“

”معاف کرنا بلیس بہن! غلطیاں ہماری اپنی ہوتی ہیں اور قصور وار نصیب کو ٹھہراتے ہیں۔“ اچھا اب زیادہ غصہ مت کرو اجیارہ جاؤ اور کچھ کھانے کو لے آؤ دوپہر کا ناٹم ہو رہا ہے آج زینت ہمارے ساتھ ہی کھانا کھائیں گی۔“ بلیس آراء مسکراتے ہوئے زینت کو دیکھنے لگی تھیں جو غصے میں بھی آگئی تھی۔

”جی بہتر ماں! میں ابھی کھانا گرم کر کے دسترخوان لگا دیتی ہوں۔ اجیارہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔“

”میں تو نہیں جاؤں گی اس شادی میں۔“ زینت نے وہ شادی کارڈ سائیڈ پر بٹھا تھا۔

”بری بات جو بھی ہے جیسی بھی ناراضی ہے مگر بیٹی کی شادی ہے بلایا ہے تو چلیں گے۔“ پھر دونوں اپنی پرانی باتوں بحث و مباحثہ میں لگ گئیں۔

☆.....☆

”السلام علیکم!“ سبرینہ جو فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں پیچھے پلٹ کر دیکھا تو فون ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”امبرین.....“ فرط جذبات سے ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”سبرینہ آما!“ امبرین جیسے کسی معصوم بچے کی طرح ان کی طرف لپکی اور ان کے سینے سے لگ کر بلک

بلک کر رو دیں۔ آنکھیں اشک بار تو خود سبرینہ کی بھی تھیں۔

”آج لگا ہے میں اپنی ماں کے سینے سے لگی ہوں اتنے سال بیت گئے یہ خوشبو محسوس ہوئے۔“ امبرین

کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

”پکی میں بھی تو تڑپتی ہوں تمہارے لیے تمہیں دیکھنے کے لیے یہ آنکھیں ترس گئی تھیں۔ بہت چھوٹی سی

تھیں تم جب ہماری اماں کا انتقال ہو گیا۔ میں نے ہی تمہاری دیکھ بھال کی تمہاری ہر خواہش خوشی پوری کی تم کو

خود سے الگ نہیں کیا کبھی بھی۔ یہی ڈر تھا کہ جانے تمہاری شادی کہاں ہو جائے تم مجھ سے دور ہو جاؤ اسی

لیے اپنے دیور سے ہی تمہاری شادی کر دی کہ تم میری نظروں کے سامنے رہو گی مگر قسمت۔“ سبرینہ نے

امبرین کو خود سے الگ کیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ لیا تھا۔

”قسمت نے ہم دونوں محبت کرنے والی بہنوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا اتفاقاً صلہ بڑھادیا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

19 دسمبر 2016ء

ایک دوسرے کی شکل دیکھنے سے بھی ترس گئے۔“

”سبرینہ آیا!“ امبرین سے بولا نہیں جا رہا تھا ان کا پورا وجود کپکپاہٹ کی زد میں تھا۔

”ماما.....“ سبکتگین حیدر ترمذی آگے بڑھا تھا اور امبرین کو دونوں شانوں سے تھام لیا۔ سبرینہ کی نظر سبکتگین حیدر ترمذی پر پڑی۔ ان کی متا جاگ اٹھی۔ وہ جودل میں گلی، شکوہ ناراضی جانے کہاں سو گئے تھے وہ دردِ جوانیوں نے غنوی کو دیکھ دیکھ کر سہا وہ سب تو جیسے وہ بھول ہی گئی تھیں۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ جو بچہ ان کے اس وقت سامنے کھڑا ہے پندرہ سال انہی کی گود میں پروان چڑھا ہے جس کی انہوں نے امبرین سے زیادہ دیکھ بھال اس کی جائز خواہشوں کا خیال رکھا تھا۔

”سبکتگین میرا بچہ.....“ اور پھر سبرینہ اس کے لمبے چوڑے سینے میں سما سی گئی تھیں کل تک جو چھوٹا سا بچہ ان کی آغوش میں چھپ جایا کرتا تھا آج ماشاء اللہ سے وہ کتنا بڑا کبر و جوان ہو گیا ہے۔ ان کے قد سے بھی اونچا کہ وہ اس کے کمر کی بازو تک آرہی تھیں۔

”کیسے ہو میری جان بھول گئے تھے اپنی آنی ماما کو۔“ ناچا تے ہوئے بھی ان کے لبوں سے شکوہ در آیا ان کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو کسی موتیوں کی لڑی کی طرح بہنے لگے تھے۔ سبکتگین حیدر ترمذی نے سختی سے اپنے جڑے بھینچ لیے کے دماغ کی ہری نیلی سیس ابھرنے لگی تھیں۔ اپنے آنسوؤں کی کمی کو اپنی گلا سز کے پیچھے چھپی ذہین آنکھوں میں ہی چھپا لیا تھا۔

”بھولا نہیں جاتا ہے آنی ماما جو یاد آتے ہیں آپ کی ماما آپ کی خوشبو تو میرے خون میں میری نسوں میں دوڑ رہی ہے پھر یاد آنا بھول جانا اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ سبکتگین حیدر ترمذی نے احترام و ادب سے ان کے سر پر بوسہ لیا تھا۔

”جاتے ہوئے اتنے سے تھے ایک گھنٹے کے جب تم میری گود میں آئے تھے۔“ سبرینہ نے سبکتگین حیدر ترمذی کے چہرے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”جانتا ہوں آنی ماما اسی لیے تو ماما سے زیادہ آپ کے قریب تھا ہر بات آپ سے شیر کرتا تھا۔“ سبکتگین حیدر ترمذی نے سبرینہ کے بہتے آنسو صاف کیے تھے۔

☆.....☆

خاقان ترمذی اور عفان ترمذی دو ہی بھائی تھے۔ خاقان ترمذی کی شادی سبرینہ سے ان کی پسند سے ہی ہوئی تھی۔ سبرینہ کی شادی کے بعد ہی ان کے والدین کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت امبرین صرف بارہ سال کی تھیں ان کے اکیلا ہونے کی وجہ سے سبرینہ اور خاقان ترمذی انہیں اپنے ہی گھر لے آئے تھے۔ سبرینہ اپنی بہن امبرین کو بے انتہا چاہتی تھیں انہوں نے انٹر کیا تو یہ خیال ستانے لگا کہ جانے کہاں ان کا نصیب جڑا ہے؟ کہاں شادی ہو؟ ان کے سسرال والے کیسے ہوں گے اس لیے یہ ان کا اور خاقان ترمذی کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ امبرین کو خود سے اور اس گھر سے الگ نہ کرنے کا ایک ہی حل ہے کہ ان کی شادی خاقان ترمذی کے چھوٹے بھائی عفان ترمذی سے کر دی جائے جو نہایت ہی سلجھے اور سنجیدہ انسان تھے۔ اس لیے جب عفان ترمذی سے بات کی تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ امبرین سے اپنی خواہش پوچھی تو وہ اسی خیال سے خوش ہو گئیں کہ اپنی ماں جیسی بہن سے کبھی بھی الگ نہیں ہوں گی۔ دونوں کا سادگی سے نکاح کر دیا گیا۔ اپنی زندگی سے عفان ترمذی اور امبرین خوش و مطمئن تھے۔ بہت جلد ہی ان کی زندگی میں ایک گول مٹول سرخ،

سفید ساننھا منا مہمان بھی آگیا۔ سبکیگین حیدر ترمذی جیسے عفان ترمذی نے سبرینہ کی گود میں ڈال دیا تھا۔ سبرینہ کی خوشی کا تو جیسے کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا وہ سبکیگین حیدر ترمذی کے لیے کیا کچھ نہ کر دیں اس کائنات کی کون سی ایسی خوشی ہو جو سبکیگین حیدر ترمذی کے آگے ڈھیر کر دیں۔ ترمذی دلا میں سبکیگین حیدر ترمذی کی شرارتیں، ہنسی، قلقاریاں ہی گونجتی رہتی تھیں۔

اسے جو بھی چاہیے ہوتا کوئی بھی فرمائش و خواہش وہ سب سبرینہ ہی پوری کرتی تھیں۔ اسی لیے تو وہ امبرین سے زیادہ سبرینہ کے قریب زیادہ تھا۔ ہر بات انہی سے ہی شیئر کرتا تھا مگر کبھی بھی امبرین کو چیلنسی یا احساس کمتری نہیں ہوئی کہ ان کا اکلو تاحت جگر اپنی ماں سے زیادہ اپنی آئی ماما کے قریب ہے۔ بلکہ وہ تو خوش تھیں کہ سبکیگین حیدر ترمذی کی دیکھ بھال، تربیت و پرورش ان کی ماں جیسی بہن کے ہاتھوں ہو رہی ہے۔ سبرینہ کی شادی کو بہت سال ہو گئے تھے مگر آج تک ان کی گود بے شک اپنی سگی اولاد سے سونی ضرور تھی۔ سبکیگین حیدر ترمذی کو پا کر انہیں کبھی بے اولادی کا احساس نہیں ہوا مگر سبکیگین حیدر ترمذی آٹھ سال کا تھا کہ ان کو ڈاکٹر نے پریکٹسٹ ہونے کی نوید سنائی گویا ان کی زندگی میں بہار آگئی۔ دل کا ایک کونا جو سوکھا پڑا تھا جسے انہوں نے سب سے چھپایا تھا۔ اب بہار ہی بہار آگئی تھی۔ پھول ہی پھول ہر سو خوشیاں بکھیر گئی تھیں۔ غنوی کے زندگی میں آنے سے گویا زندگی ہی مکمل ہو گئی تھی اور سبکیگین حیدر ترمذی کی تو جیسے عید ہی ہو گئی تھی۔ غنوی کے زندگی میں آنے سے گویا زندگی ہی مکمل ہو گئی تھی اور سبکیگین حیدر ترمذی کی تو جیسے عید ہی ہو گئی تھی۔ غنوی جیسی پیاری سی نازک سی باری ڈول کو گود میں لیے لیے پورے گھر کے چکر کاٹتا اسے کھلونوں سے کھلاتا۔ اپنی ساری پاکٹ منی وہ غنوی پر ہی کرچ کر دیتا تھا۔ زندگی بہت خوب صورت و حسین ہو گئی تھی۔ دکھ کی معمولی سی بھی پرچھائی نہیں تھی ان کی زندگی میں مگر..... ایک موڑ ایسا بھی آیا کہ ان خوشیوں بھری زندگی کو کسی کی بد نظر لگ چکی تھی۔ ان سب کی پرسکون زندگی میں ایسی آگ لگی کہ سب ایک دوسرے سے پھڑک گئے۔ الگ ہو گئے تھے کہ کوئی بھی نہ چاہتے ہوئے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے تک کار وادار نہیں تھا۔

سبکیگین حیدر ترمذی آج پندرہ سال کا ہو گیا تھا۔ اس کی برتھ ڈے سلیمیر ہٹ کی جارہی تھی۔ سب نے ہی اسے مہنگے تحفے دیئے تھے۔ عفان ترمذی نے اسے بائیک گفٹ کی تھی اور خاقان ترمذی نے اسی کی فرمائش پر اسے نیو ماڈل کی گاڑی گفٹ کی تھی۔ سبرینہ نے اسے سچے موبائل اور سب سے بڑی بات کہ غنوی نے اسے اپنی پاکٹ منی سے ایک مہنگا ترین لیپ ٹاپ گفٹ کیا تھا۔

”بھئی ڈیڈو! سب سے مہنگا اور قیمتی تحفہ میرے لیے یہ ہے جو مجھے میری باری ڈول نے دیا ہے۔“

”یس آف کورس مائی چائلڈ۔“ زندگی کی گاڑی یونہی چلتی رہتی اگر سبکیگین حیدر ترمذی کا ٹکراؤ اپنے برابر میں آئے اس نئے بنگلے میں اس شخص سے نہ ہوا ہوتا۔

”ہلو!“ اس شخص نے سبکیگین حیدر ترمذی سے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”وہ شخص کوئی پائیس پچیس سال کا ہوگا۔“

”ہائے۔“ سبکیگین حیدر ترمذی نے بھی مسکرا کے ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔

”مائی نیم از سہدا اینڈ یو۔“

”میرا نام سبکیگین ہے۔“

”گڈ..... آؤ میرے ساتھ ایک کپ کافی کا ہو جائے۔“

”کافی.....!“ سبکتگین حیدر ترمذی نے پرسوج نظروں سے پہلے سہد کو پھر پیچھے پلٹ کر اپنے بنگلے کو دیکھا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو فکر مت کرو میں تمہیں اغوا نہیں کروں گا۔“ سہد نے مسکراتے ہوئے اس کے پرسوج چہرے کو دیکھا تھا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے وہ ایک چولی مجھے اندر اپنی باربی ڈول کو پڑھانا تھا یہ اس کے ٹیوشن کا ٹائم ہے۔“

”یار ابھی تو صرف پانچ بجے ہیں پڑھالینا اپنی باربی ڈول کو چھ بجے تک۔“ سہد نے اپنی کلائی میں بندھی اپنی ہینڈ واچ دیکھی جو نہایت ہی قیمتی اور مہنگی تھی۔

”اوکے۔“

اور یہ پہلا قدم تھا جو اس خاندان کو ایک دوسرے سے الگ کر گیا۔

سبکتگین حیدر ترمذی اپنے اس پہلے اٹھتے قدم پر جتنا پچھتا تا کم تھا کہ کاش وہ واپس پلٹ جاتا۔ نہیں جاتا سہد کے ساتھ اس کے بنگلے میں مگر تقدیر میں ایسا بھی لکھا تھا اور جو ہوتا ہوتا ہے چاہے کتنا بھی سر پیٹ لو وہ ہو کر رہتا ہے۔ کیونکہ ہماری زندگی اس لفظ ”کاش“ پر ہی مبنی ہے۔

سات سالہ غنوی اپنا اسکول بیک لیے ہال میں کوئی دو گھنٹے سے سبکتگین حیدر ترمذی کا ویٹ کر رہی تھی۔

”غنوی! چاند پڑھ لیا؟“ سہرینہ وہاں کسی کام سے آئی تھیں تو غنوی کو بیٹھے دیکھا۔

”نومما! حیدر بھیا ابھی تک نہیں آئے کل میرا میسج ہے۔“

غنوی کو سبکتگین نام لینا بہت مشکل لگتا تھا اس لیے وہ اسے حیدر ہی کہتی تھی۔

رات کے نو بجنے والے ہیں سبکتگین ابھی تک گھر نہیں آئے ایسی لاپرواہی تو وہ نہیں کرتے۔“ سہرینہ نے منہ ہی منہ میں خود سے کہا تھا ان کا دل بھی گھبرا رہا تھا وہ سبکتگین حیدر ترمذی کے لیے فکر مند ہو گئی تھیں۔

”کیا بات ہے سہرینہ آیا آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں سب خیریت تو ہے نا؟“ امبرین کچن میں عفان ترمذی کے لیے دودھ لینے آئی تھیں وہ اندر جا رہی تھیں کہ سہرینہ پران کی نظر پڑی وہ ان کے پاس آ گئیں۔

”امبرین! سبکتگین نہیں آئے ابھی تک دیکھو رات کے نو بجنے والے ہیں۔“

”ایک منٹ میں فون کرتی ہوں۔“ انہوں نے ٹیبل سے اپنا سیل فون اٹھایا اور سبکتگین حیدر ترمذی کو کال ملائی۔

”اس دوران وہ غنوی کے بارے میں بھی پوچھ چکی تھیں کہ آج سبکتگین حیدر ترمذی نے غنوی کو بھی نہیں پڑھایا۔“

کچھ دیر بعد کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

”سہرینہ آیا! سبکتگین آدھے گھنٹے میں آ رہا ہے۔ اب آپ اس کی اچھی طرح کلاس لیجیے اور آج غنوی گڑیا کو میں پڑھاؤں گی۔“ امبرین نے غنوی کو گود میں بھر اس کا بیگ اٹھایا اور اپنے بیڈروم میں لے آئیں۔

سبکتگین حیدر ترمذی اپنے وعدے کے مطابق آدھے گھنٹے بعد آ چکا تھا۔ سہرینہ کے دل کو فرائد آیا اسے دیکھ کر سہرینہ نے اسے سمجھایا۔

اب یہ ہر روز ہونے لگا۔ سبکتگین حیدر ترمذی پہلے دن اگر تین گھنٹے غائب تھا گھر سے تو دوسرے دن یہ ٹائم

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

بڑھا اور ہر روز بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہر روز سیرینہ، امیرین سمجھاتی ڈانٹتی وہ ہر روز ان کی ڈانٹ سنتا اور ان سے وعدہ کرتا کہ اگلے دن ایسا نہیں ہوگا مگر وہ اگلا دن بھی نہیں آیا۔ بات خاقان ترمذی اور عفان ترمذی تک پہنچ گئی۔ ان دونوں نے بھی کافی سمجھایا بلکہ عفان ترمذی نے بہت ڈانٹا ٹھیک ٹھاک کلاس لی تھی۔ سبکتگین حیدر ترمذی پندرہ سال کی عمر میں جس طرف قدم بڑھا چکا تھا وہاں سے واپس آنا اس کے لیے اب بہت مشکل لگ رہا تھا۔ یہ وہ دلدل تھی جس میں وہ پھنسا تو پھنستا ہی چلا گیا تھا۔ اس کی سرگرمیاں نہ صرف بڑھتی جا رہی تھیں بلکہ اب تو گھر کے سب لوگوں کے لیے مشکوک بھی ہوتی جا رہی تھیں۔

اس کی اپنی سرگرمیوں اور مشکوک حرکتوں کی وجہ سے اس سے بائیک اور گاڑی کی چابی لے لی گئی تھی مگر ان لوگوں کو یہ علم نہیں تھا کہ سبکتگین حیدر ترمذی کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”تم میرا ایک کام کرو گے؟“ سہد نے ڈرنک کا گلاس سبکتگین حیدر ترمذی کی سمت بڑھایا۔
 ”آپ بھول رہے ہیں کہ اب تک میں نے ہی آپ کے سارے کام کیے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ڈرنک کا گلاس تھام لیا تھا۔

”آئی نو، مجھے تم پر ایسے تو اتنا بھروسہ نہیں ہے۔“ وہ اپنا گلاس لے کر اس کے سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”یہ لو.....“ ایک بلیک کلر کا بیگ تھادکھنے میں بالکل ڈالٹ جیسا تھا مگر وہ ڈالٹ نہیں تھا۔
 ”یہ کیا ہے؟“

”اس میں بہت ہی قیمتی سامان ہے۔ میموری کارڈ، چپ، سم کارڈ وغیرہ تمہیں صرف یہ کرنا ہے اس بیگ کو کل صبح نو بجے پر مل ہوٹل میں لے جانا ہے یہ جسے دینا ہے وہ آدی خود تمہارے پاس آئے گا۔“
 ”اوکے ڈن کام ہو جائے گا بلکہ مجھیں کام ہو گیا۔“

”تمہاری یہی ادا تو میرا دل جیت گئی۔ اچھا چلو آؤ ایک نئی سیکسی وڈیو اپ لوڈ ہوئی ہے آؤ وہ دیکھتے ہیں۔“
 اس رات وہ گھر میں دس بجے تک آ گیا تھا۔ اپنے بیڈروم میں گیا وہ بیگ اس نے اپنی الماری میں چھپا کے رکھ دیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد غنوی اپنا بیگ لیے سبکتگین حیدر ترمذی کے بیڈروم میں داخل ہوئی۔
 ”ارے باری ڈول تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔“ آہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

”جی حیدر بھیا! کیونکہ آج ہر حال میں مجھے آپ سے ہی پڑھنا ہے۔“ وہ بیگ سمیت دھرتا مار کر کے اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔
 ”اوکے چلو آؤ۔“

سبکتگین حیدر ترمذی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ آج سہد نے اسے بہت پلا دی تھی اور جو ڈیو اس نے آج اسے دکھائی تھی اس کا نشہ آنکھوں سمیت سر پر چڑھا ہوا تھا۔ بھکی بھکی سی نظر پاس بیٹھی غنوی پر اٹھیں اس کا چھوٹا سا خوبصورت چہرہ اور پتھر اس نے غنوی کا بیگ ساری کتابیں کا پیاں ایک طرف پھینک کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ شیطان پوری طرح اس پر حاوی ہو چکا تھا۔ وہ معصوم سی غنوی چپتی چلائی رہی۔

”بہت ہو گئی ہے امیرین! حد ہوتی ہے آپ جانتی ہیں سبکتگین کی سرگرمیاں.....! کیسے کیسے دوست بنائے ہوئے ہیں اس نے اور یہ جو برابر میں سہد نام کا لڑکا آیا ہے پوری سوسائٹی برا بھلا بول رہی ہے اس کو، باہر سے آیا ہے اور کیا کرنے آیا ہے کسی کو کچھ نہیں پتا، سب نے اس کے گھر میں ہر روز ایک نئی گاڑی آتے

جاتے دیکھی ہے جس میں لڑکے لڑکیاں عریاں لباس میں بے ہودہ حرکتیں کرتے پائے گئے ہیں اور ایسے لوگوں سے ہمارے سبکدوش کی دوستی ہو، میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کے خلاف تو میں نے پولیس میں کیپٹین کر دی ہے مگر آج سبکدوش کی بھی میرے ہاتھوں کلاس ہے۔“ عفان ترمذی بہت غصے میں تھے۔

شاکد تو امبرین بھی نہیں مگر وہ عفان ترمذی کے آگے کچھ بول کر ان کے غصے کو مزید ہوا نہیں دینا چاہتی تھیں۔ وہ دونوں باہر آئے تو سامنے ہی خاقان ترمذی اور سرینہ کو پریشان حال دیکھا۔

”کیا ہوا بھابی! آپ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہیں؟“

”عفان! غنوی کے چیخنے چلانے کی آواز آئی ہے پتا نہیں کیا ہوا ہے۔“

”آپ پریشان مت ہوں میں دیکھتا ہوں۔“

آخری چیخ ”مما.....!“

آواز سبکدوش حیدر ترمذی کے بیڈروم سے آئی تھی۔ وہ چاروں اسی سمت بھاگے تھے۔ دھڑکنے دروازہ کھولا سامنے کے منظر نے جیسے چاروں پر اس جنگل کی دیواروں کو ان کے سروں پر گرا دیا ہو۔

خون میں لت پت غنوی بیڈ پر بے سود پڑی تھی۔ سبکدوش حیدر ترمذی ایک سائیڈ میں کھڑا تھا اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔

”سبکدوش.....“

خاقان ترمذی نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا کہ وہ دور جا کر گرنا تھا۔

”بھائی صاحب آپ پہلے غنوی کو دیکھئے اسے ہوش نہیں آرہا ہے۔“ عفان ترمذی نے بے جان سی مردہ حالت میں بے سدھ بڑی غنوی کے گال پر ہاتھ تھپتھپایا مگر وہ ہوش میں نہیں آرہی تھی۔ دل اندر سے بہت ڈر گیا تھا کہیں وہ مرنے نہیں گئی۔

”اللہ نہ کرے۔“ عفان ترمذی نے فوراً اپنی سوچ کو ملامت کی تھی۔

خاقان ترمذی اور عفان ترمذی فوراً غنوی کو گود میں لے کر اسپتال بھاگے تھے۔ جاتی ہوئی سرینہ نے آنسو بھری آنکھوں سے سبکدوش کو دیکھا تھا مگر کچھ بھی نہیں کہا ایک لفظ شکایت کا بھی نہیں۔

اور یہ ان کا سبکدوش حیدر ترمذی کو دیکھنا آخری دیکھنا تھا۔ ان آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ جیسے وہ زبان سے تو نہیں مگر اپنے بہتے آنسوؤں سے بیان کر گئی تھیں۔ ان بہتی آنکھوں میں آخری لفظ جو تھا وہ تھا۔

”کیوں؟“

اور سبکدوش حیدر ترمذی جیسے اس پل مر گیا تھا، وہ نادانستگی میں جو بہت بڑی غلطی بہت بڑا گناہ کر گیا تھا۔ اس کا کفارہ شاید مگر بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔

”سبکدوش.....!“ امبرین اس کے پاس آئیں اور اس کا کارپکڑ کے جھنجھوڑ دیا تھا۔

”کیا..... کیا..... تم نے..... کچھ اندازہ ہے..... تم نے..... اوہ..... سبکدوش.....“ امبرین کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں انہوں نے اپنا سراپے گال اپنا سینہ پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے آنسو جیسے آنکھوں میں اس کائنات کا سمندر اٹھ رہا ہو جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

”سبکدوش! غنوی سات سال کی ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ تم نے ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی کیسے لیا۔ آج میں مر گئی سبکدوش مر گئی میں.....“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سبکدوش حیدر ترمذی کے سینے پر مارنا

شروع کر دیا تھا۔

”تم نے آج مجھے مار دیا، میری ماں جیسی بہن کو زندہ درگور کر دیا۔ وہ بہن جنہوں نے مجھ سے زیادہ تمہیں چاہا، پیار کیا تمہاری ہر خواہش پوری کی اور تم نے کیا کیا تم نے انہی کے گھر کے چراغ کو بجھا دیا سبکدین!..... ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ درد سے دل جیسے سینے سے باہر آ رہا تھا۔ سبکدین حیدر ترمذی پر چیخ چیخ کے ان کے گلے میں خراش ہو گئی تھی۔ ان کی آواز بند ہو گئی تھی مگر.....

سامنے کھڑا سبکدین حیدر ترمذی جیسے اس پل اس لمحے..... اندھا، بہرا، گونگا ہو گیا تھا وہ اس وقت ایک بے جان لاش بن چکا تھا۔ جس پر امبرین کے اس طرح چیخنے چلانے، رونے مینا کرنے اور یہاں تک کے مارنے کا رتی بھرا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ امبرین فرش پر ای کے قدموں میں بیٹھتی چلی گئی تھیں۔

☆.....☆

”خاقان! غنوی بیٹی کے ساتھ بڑی بے رحمی سے کسی نے زیادتی کی ہے اور دوسری بات کہ یہ تو سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے ہمیں پولیس کو انعام کرنا چاہیے۔“ ڈاکٹر راحیل خاقان ترمذی کے فیملی ڈاکٹر ہی نہیں بچپن کے فرینڈ اور کلاس فیلو بھی تھے۔

”راحیل وہ سب ہم بعد میں دیکھ لیں گے تم پہلے میری بیٹی کو بچاؤ۔“ خاقان ترمذی کے لہجے میں ٹوٹی پھوٹی کرچھوں کی چمک تھی وہ اس وقت ایک بار اہوا باب تھا جو چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔

”اس کی فکر مت کرو تم ٹریٹمنٹ شروع ہو گئی ہے مگر میرے یار غنوی بہت چھوٹی سی ہے۔ ابھی جانتے ہو اس واقعے کا اس کے اعصاب پر اس کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ہو سکتا ہے۔“

”بھائی صاحب! راحیل بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں پولیس میں کمپلین کر دینی چاہیے۔“ عفان ترمذی نے یہ سب کس مشکل سے کہا یہ صرف وہ یا ان کا رب ہی جانتا ہے۔

”نہیں پولیس میں کوئی کمپلین نہیں ہوگی۔“ سرینہ نے اچانک سے ان تینوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ تینوں نے سرینہ کی جانب دیکھا تھا۔

”مگر بھابی جان!“ عفان نے کچھ کہنے کے لیے کہا ہی تھا کہ سرینہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں کچھ بولنے سے روک دیا تھا اور پھر ڈاکٹر راحیل کی جانب بڑھیں۔

”ڈاکٹر صاحب آپ مجھے بس اتنا بتا دیجئے کہ غنوی بچ جائے گی یا نہیں۔“ ہر احساس سے عاری وہ اس وقت صرف ایک ماں تھیں۔ ایک بدنصیب بیٹی کی ماں انہیں اس وقت صرف ایک رشتہ یاد تھا۔ باقی کے سارے رشتے انہوں نے بہت پیچھے چھوڑ دیئے تھے۔ بلکہ زمین کے نیچے بہت گہرائی میں کہیں دفن کر دیئے تھے۔

”جی سرینہ بھابی! غنوی بیٹی بچ جائے گی لیکن.....“

”بس ڈاکٹر صاحبہ اس سے آگے مجھے نہ ہی کچھ سننا ہے اور نہ ہی کسی سے کچھ کہنا ہے۔ میں غنوی کو لے کر اس ملک سے باہر چلی جاؤں گی جہاں کسی بھی واقعے کے اثر کا معمولی سا بھی شائبہ تک نہیں ہوگا۔“

جس لب و لہجے جس انداز میں انہوں نے حتمی فیصلہ کیا تھا عفان ترمذی اور خاقان ترمذی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ دونوں میں سے کسی کی بھی ہمت نہیں ہوئی کہ سرینہ کے فیصلے کے آگے ایک لفظ بھی بول سکیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

برادراڈجسٹ 25 دسمبر 2016

سبرینہ اور خاقان ترمذی غنوی کو بلے کڑا مریکہ آگئے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ سب کچھ ان کی سوچ کے مطابق ہوگا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ غنوی اس ہولناک رات کو اس اذیت و تکلیف بھری رات واقعے کو بھول جائے گی فراموش کر دے گی وہ سب جو اس نے سہا، برداشت کیا مگر نہیں..... یہ تو ان دونوں کی سب سے بڑی بھول تھی۔ جس بھرم میں وہ جی رہے تھے وہ یا تو ان کی غلط فہمی تھی یا پھر خوش فہمی۔

غنوی کو ہر رات دورے پڑتے یہاں تک کہ بھی کبھی خود کو نقصان بھی پہنچا لیتی تھی۔ ایسے وقت میں اس کو سنبھالنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ سوائے خاقان ترمذی اور سبرینہ کے جتنی مشکل سے سبرینہ نے غنوی کو سنبھالا تھا یہ صرف وہ یا ان کا رب جانتا تھا۔ بہت محنت و جدوجہد سے وہ بہت حد تک غنوی کے دل و دماغ سے اس واقعے کو بھلانے میں کامیاب بھی ہو گئی تھیں۔ چودہ سال بعد انہوں نے اپنی سرزمین پاکستان پر قدم دھرا تھا۔ بے شک پاکستان اور کراچی سے ان کی بہت سی خوشگوار، ناخوشگوار تکلیف بھری اذیت بھری یادیں وابستہ تھیں مگر صرف غنوی کی خاطر وہ کچھ بھی یاد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ سوچنا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ صرف غنوی کو اس کے روشن مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔ باقی انہیں کچھ یاد نہ تھا اور نہ ہی یاد رکھنا چاہتی تھیں۔

☆.....☆

”قیصر.....!“
”ہوں..... کیسے۔“

چوہدری قیصر عسکری لیپ ٹاپ پر بزنس کی کوئی فائل دیکھ رہے تھے۔ رشنا قیصر اپنے نواسے سنی کو پڑھا رہی تھیں۔

”میں جو بات آپ سے کرنا چاہتی ہوں اگر آپ اپنا یہ لیپ ٹاپ بند کر دیں تو میری دیر کو تو مجھ پر مہربانی ہو گی۔“ رشنا قیصر نے بھی سنی کا بیک گلوں کے سائڈ میں رکھا اور اس کو گیم دے کر ایک سائڈ پر بٹھا دیا تاکہ وہ انہیں ڈسٹرب نہ کرے۔

”یہ کیسے کر دی میں نے آپ پر مہربانی اب فرمائیے۔“ چوہدری قیصر عسکری نے مسکراتے ہوئے لیپ ٹاپ بند کیا اور رخ ان کی جانب موڑ لیا تھا۔

”میں یہ سوچ رہی تھی کہ ایراش کا انٹرسٹ طلسم کی طرف بہت بڑھ گیا ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ یہ کوئی ہمارا وقت تو ہے نہیں کہ ایراش میرج ہو یا ملگنی کے بعد گھومنا وغیرہ ہوتا تھا۔“

”آپ اپنی گھمبیر پہلیاں بچھو رہی ہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ ٹو دا پوائنٹ پر آجائیں۔“
”ٹو دا پوائنٹ یہ ہے کہ جب ایراش کو طلسم اور طلسم کو ایراش میں اتنا انٹرسٹ ہے تو کیوں ناں ہم ایراش کے لیے طلسم کا رشتہ ہی لے جائیں۔“

”بات تو آپ کی درست ہے رشنا۔“

”اب دیکھیے ناں ہمارا معاشرہ جس رخ پر جا رہا ہے وہ سب ہمارے سامنے ہے۔ بری صحبت آج کل بچے بہت جلد پکڑتے ہیں اور پھر ایسے قدم اٹھا لیتے ہیں کہ ماں باپ کے لیے باصط شرمندگی کی بات ہوتی ہے۔“

”یہ بات بھی آپ کی بالکل ٹھیک ہے اور آج کل تو ویسے بھی بہت کچھ سننے میں آ رہا ہے تو پھر آپ کوئی دن مقرر کر لیں آپ اور زینرہ چلے جائے طلسم کے ہاں۔“

”تو آپ کو اس رشتے سے کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟“ رشنا قیصر نے پھر بھی اپنے دل کا وہ ہم ظاہر کر دیا

”اس میں اعتراض والی تو کوئی بات نہیں ہے رشنا آپ اگر ایسا کر رہی ہیں تو یقیناً سوچ سمجھ کر ہی کر رہی ہوں گی۔ مجھے نہ آپ کے فیصلے پر کل کوئی شبہ تھا اور نہ کبھی آگے ہوگا کیونکہ میں جانتا ہوں آپ کا ہر فیصلہ درست ہوتا ہے۔“ چوہدری قیصر عسکری نے فخریہ نظروں سے اپنی شریک حیات کو دیکھا تھا۔ رشنا قیصر ہولے سے مسکرا دیں۔

”تو ٹھیک ہے پھر میں اسی ہفتے چلی جاؤں گی طلسم کا ہاتھ مانگنے۔“

”بھئی تمہیں بھی تو پتا چلے کون کس کا ہاتھ مانگ رہا ہے۔“ زئیرہ ہاتھ میں بہت سارے شاپنگ بیگز لیے چلی آرہی تھی۔ اس نے سارے بیگز سامنے کانچ کی ٹیبل پر رکھ دیئے۔

”لگتا ہے ہماری بیٹی آج پورا شاپنگ مال اٹھالائی ہے۔“ چوہدری قیصر عسکری نے کانچ کی ٹیبل پر دھرے سارے شاپنگ بیگز پر ایک نظر ڈالی تھی۔

”ظاہری بات ہے ڈیڑا! باہر سے میاں کی کمائی آرہی ہے دونوں ہاتھوں سے اڑائے گی۔“ اسی اثناء میں وہاں ایراش عسکری بھی گاڑی کی چابی گھماتا اپنے بیڈروم سے چلا آیا تھا۔

”کیوں میاں کی کمائی کیوں خرچ کروں گی میں وہ تو سب بینک میں جمع ہو رہی ہے ابھی تو میں اپنے مام ڈیڑے کے پاس ہوں تو ظاہر ہے انہی کا پیسہ خرچ کروں گی۔“ زئیرہ نے بھی کراہ سا جواب دیا تھا۔

”دیکھ لی ڈیڑا! اس کی چالاکی اس نے تو سارے ہوشیار سائنسدانوں کو بھی مات دے دی۔“

”ویسے مائی چائلڈ زئیرہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی ہے ابھی یہ اپنے باپ کے گھر ہے تو باپ کا سارا پیسہ اس کا ہے اور اس کے میاں کے پاس جانے کے بعد بھی ایسا ہی ہے۔“ چوہدری قیصر عسکری نے شفقت سے اپنی اکلوتی چھٹی بیٹی کو دیکھا تھا۔

زئیرہ نے ایراش عسکری کو زبان چڑائی تھی۔

”مگر یاد رکھنا میرے پاس اس دولت سے بھی بڑی دولت ہے جو میں زئیرہ کو ہڑپنے نہیں دوں گا۔“

”اچھا وہ کیا ہے؟“ زئیرہ نے ایراش عسکری کو دیکھا۔

”میرے پاس ماں ہے۔“ وہ کہتا ہوا جھٹ سے رشنا قیصر کے برابر میں بیٹھ گیا اور ان کے گلے میں ہاتھ

ڈال کر ان کے شانے پر سر دھر دیا تھا۔

”میرا ڈیڑا۔“ رشنا قیصر نے شفقت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے ہاتھ پر بوسہ لیا۔

”وہ تو جب بیگم آئے گی تو پتا چلے گا۔“ زئیرہ نے پر مزاح انداز میں کہتے ہوئے ایراش عسکری کو چڑایا۔

”دیکھ لے لینا۔“

”اچھا ہاں بیگم سے یاد آیا یہاں کسی کے ہاتھ مانگنے کی بات ہو رہی تھی۔“ زئیرہ کو ایک دم سے یاد آیا تھا۔

”جی ہم لوگ ایراش کے رشتے کی بات کر رہے تھے۔“ رشنا قیصر نے دلار سے ایراش عسکری کو دیکھا۔

”مام اس کو کون اپنی لڑکی دے گا۔“ زئیرہ نے ہستے ہوئے اس کا مذاق اڑایا تھا۔

”اوہ ہیلو! تمہیں میری پاپولرٹی کا ابھی اندازہ نہیں ہے۔ لاکھوں لڑکیاں میری خوب صورتی میری

وجاہت پر مرتی ہیں صرف میری ایک نظر کی منتظر ہیں اور میرے قدموں میں ڈھیر۔“ ایراش عسکری نے اپنا

کارا اٹھاتے ہوئے مغرورانہ لب و لہجہ میں اپنا حسن چٹایا تھا۔

”لاکھوں، ہزاروں لڑکیوں کا تو نہیں پتا مگر ہاں آج کل سحر بانو کے بہت چرچے ہیں جو پوری طرح تمہارے عشق میں غوطہ زن ہے۔“

”ایک منٹ.....!“ چوہدری قیصر عسکری نے رشنا قیصر کو دیکھا۔

”رشنا آپ تو طلسم کا کہہ رہی تھیں اب یہ سحر بانو کا کیا قصہ ہے؟“

”پتا نہیں قیصر؟“ انہوں نے لاعلمی ظاہر کر دی۔

”ابراش! زنیہ کیا کہہ رہی ہے۔“

”مام اس کی تو عادت ہے ہانکتے رہنے کی اب آپ تو جانتی ہیں کہ کتنی ہی لڑکیاں میری خوب صورتی

میرے حسن کے پیچھے مری جا رہی ہیں ہوگی کوئی انہی میں سے ایک سحر بانو۔“ ابراش عسکری نے اس انداز میں

کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں۔

”مگر ہم تو اسی ہفتے تمہارا رشتہ لے کر طلسم کے گھر جا رہے ہیں۔ سحر بانو نے اگر کوئی ہنگامہ کر دیا تو۔“ رشنا

قیصر نے اپنا خدشہ ظاہر کیا تھا۔

”ہنگامہ تو وہ کر لے گی مام اپنی پوری فوج لے کر آئے گی ابراش کی شادی میں خوب ناچے گی گائے گی۔“

زنیہ نے پھر سے سسپنس پھیلا دیا تھا۔

”زنیہ کیا سسپنس پھیلا رہی ہو۔“

”دیکھو زنیہ! سیدھے سیدھے بتا دو ورنہ ٹھیک ٹھاک پٹو گی مجھ سے۔“ ابراش عسکری بھی اس کے سسپنس

پھیلانے سے زچ ہو گیا تھا۔

”بہت بری بات ہے باؤ جی۔ تم سحر بانو کو ایسے کیسے بھول سکتے ہو چہ چہ۔“

”باؤ جی۔“ ابراش عسکری نے زیر لب کہا تو ذہن کی اسکرین پر ایک زبردست دھماکا ہوا۔

”زنیہ یو.....!“ ابراش عسکری چتا ہوا اٹھا تھا۔ زنیہ تو کبھی ہی الرٹ فوراً سے مشتروہاں سے رفو چکر ہوتی تھی۔

”کوئی ہمیں بھی تو بتائے یہ سحر بانو کون ہے بھئی۔“ چوہدری قیصر عسکری نے رشنا قیصر کا مسکراتا چہرہ دیکھا

تھا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے زنیہ نے انہیں اس خواجہ سرا سحر بانو کے بارے میں بتایا وہ بھول گئی تھی مگر زنیہ کے

باؤ جی کہنے پر یاد آ گیا تھا۔

”ارے قیصر ایسی کوئی بات نہیں ہے سحر بانو ایک خواجہ سرا ہے زنیہ اسی کا ذکر کر رہی تھی۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ چوہدری قیصر عسکری تھوڑے جھینپ سے گئے تھے۔

”اگر میرا ایک ضروری فون نہ آیا ہوتا تو آج یہ میرے ہاتھوں شہید ہو جاتی۔“ ابراش عسکری تیزی سے

وہاں سے نکل رہا تھا۔

”ابراش.....“

”مام آکر بات کرتے ہیں۔“ وہ وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

”چلا گیا۔“ زنیہ دھپ سے آکر بیٹھی تھی۔

”کیوں بھائی کو اتنا چھیڑتی ہو۔“ رشنا قیصر نے اپنی اکلوتی بیٹی زنیہ کو دیکھا۔

”انجوائے مام انجوائے۔“

”اچھا تو یہ سب ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ ایک طرف، رشنا آپ بوں کرنا کہہ رہی ہیں بھابی کو بھی اپنے ساتھ لے

جائیے گا خاقان سے ہمارے فیملی ٹرمز ہی نہیں بزنس ٹرمز بھی بہت اچھے ہیں۔“
 ”جی بہتر میں ابھی تھوڑی دیر میں ہی انہیں فون کر دوں گی۔“

”اوکے۔“ وہ اپنا لپ ٹاپ اٹھائے کھڑے ہو گئے۔

”میں ذرا اپنے بیڈ روم میں جا رہا ہوں آپ یوں کریں ایک کپ گرم چائے بھیجو ادیس مجھے جلد از جلد یہ کچھ بزنس پوائنٹ مکمل کرنے ہیں۔“

”اوکے آپ چلیے میں خود لے کر آتی ہوں۔“

”ڈیڈ! میری شاپنگ تو دیکھتے جاتیے۔“ زنیہ نے شاپنگ بیگز اٹھائے۔

”بیٹا! آپ اپنی مام کو دکھائیے ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنے بیڈ روم کی جانب بڑھ گئے۔ زنیہ نے اپنی ساری شاپنگ رشناقیصر کو دکھائی۔

”بہت اچھے کپڑے لائی ہو، اچھا اب یہ سب سمیٹو میں ذرا تمہارے ڈیڈ کو چائے دوں پھر سیرینہ بھابی سے بھی بات کرنی ہے۔“

”اوکے۔“ وہ ہولے سے مسکرا دی۔ سب کچھ سائیڈ میں رکھ کے وہیں گیم کھیلتے سنی کی جانب بڑھی اور اس کو اپنی گود میں بھر لیا۔

”کیا کھیل رہے ہونا نوکے موبائل میں لاؤ مجھے بھی دکھاؤ۔“

☆.....☆

”غنوی جتنی تکلیف و اذیت سے گزری ہے اس سے کہیں زیادہ درد میں نے اور خاقان نے بھی سہا ہے۔ اس کا اتنا علاج اس کی دیکھ بھال کرنے کے باوجود بھی ایسا لگتا ہے کہ کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے اس کا ڈرو خوف اس کی ہڈیانی کیفیت اس کا سہم کر چھپ جانا سب کچھ فیس کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کا اعتماد یقین خود پر بھروسہ دوسروں پر بھروسہ کرنا، دوستی کرنا کسی سے بات چیت کرنا یہ سب ہمارے لیے ایک کڑا امتحان تھا۔“

وہ بولے جا رہی تھیں اور سبکدوش حیدر تریڑی سر جھکائے شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ جو غلطی اس سے نادانستگی میں سرزد ہوئی تھی۔ وہ ہر روز، ہر لمحہ، ہر پل، ہر سانس میں ہزار بار مرا تھا۔ ہر سانس میں ہزار بار مر کے جیتا تھا۔ یہ زندگی اس کی اگر اپنی ہوتی تو۔ ہینا اپنی ہی زندگی اپنے ہی جسم کا ایک ایک ریشہ کر دیتا خود کو ایسی عبرت ناک موت دیتا کہ دوسروں کے لیے عبرت کا نشان بن جاتا مگر نہیں یہ اس کا جینا اس کے اپنے لیے نہیں تھا اس کی آتی جاتی سانسیں کسی کے وعدوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھیں اور وہ تھیں اس کی اپنی سگی ماں امبرین۔ ہاں امبرین نے اس کو اپنی قسمیں وعدوں سے دوبارہ موت سے زندگی کی طرف کھینچا تھا۔ ورنہ اس رات وہ اپنی زندگی اپنے وجود کا خاتمہ کر چکا تھا۔

”غنوی کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کی ایک ہی دوست ہے عائرہ جس سے اس کی دوستی ہے۔ شاید جس کے ساتھ وہ کھل کر ہنستی مسکراتی خوش رہتی ہے۔ غنوی کی زندگی کا دائرہ بہت محدود ہے جس میں اس کی ماما، ڈیڈ اور عائرہ شامل ہیں اس کے علاوہ کوئی نہیں۔“

”سیرینہ آپا آپ نے غنوی کو کبھی ہمارے بارے میں نہیں بتایا؟“ امبرین نے بہت آس سے ان کو

دیکھا تھا۔

قیر چہو کے رہیں گی

شانزے اسپید سے گاڑی سڑک پر دوڑا رہی تھی۔ پچھلی گاڑی نے اوور ٹیک کیا تو شانزے کو جیسے آگ لگ گئی۔



”شانزے سے کوئی آگے نکل جائے، اس کی اتنی مجال۔“ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی بسیں سے کہتے اس نے گاڑی کی اسپینڈ بڑھادی اور ٹیک کرنے والی گاڑی کو خبر نہ تھی کہ اس نے شانزے کی شان میں کون سی گستاخی کر دی ہے۔

”دیکھا..... مجھ سے کوئی جیت کے دکھائے۔“ جبیں کو فاتحانہ نظروں سے دیکھتے اس نے پیچھے رہ جانے والی گاڑی کو دیکھا۔

”اچھا! اب اسپینڈ کم کرو، میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ جبیں اس سر پھری کے ساتھ ڈرائیو پر آتے یوں بھی ڈرتی تھی۔ ہر دو منٹ میں وہ ریس لگانے لگتی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ سامنے پولیس موبائلز کو دیکھتے شانزے نے کہا۔ ایک پولیس اہلکار ان کی گاڑی کو ہاتھ دے کر رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔

”غالباً کسی مخصوص کی تلاش ہے یا اسنیپ چیکنگ چل رہی ہے۔ روکو، اب یہاں کوئی تماشا نہ کرنا۔“ جبیں



خوشخبری

شاعری انٹرنیشنل انتخاب بہت
جلد منظر عام پر آرہا ہے

داستان دل ڈائجسٹ کی ٹیم شاعری انٹرنیشنل انتخاب شائع کر رہی ہے جس میں سب
شاعر شامل ہو سکتے ہیں اور جو شاعر نہیں وہ کسی بھی شاعر کی دو غزلیں انتخاب کر سکتے
ہیں انشاء اللہ یہ کتاب بہت جلد مارکیٹ میں آ رہی ہے شامل ہونے کے لیے آج ہی ہم
سے رابطہ کریں

اہم نوٹ: اس بک کے لیے دو غزلیں یا نظم دے سکتے ہیں اور ایک ہزار فیس ہوگی ان پیسوں کی کتابیں سینڈ کی جائیں گی

03225494228

abbasnadeem283@gmail.com

مزید معلومات کے لیے رابطہ

ابرونیہ اقبال، محرش ملی نقوی، آمنت رشید، ملائکہ خان، نندیم عباس ڈھکو،
نہت جنیں شیہ، نور بخاری، رحیمانہ اعجاز، داستان دل ٹیم

سلسلہ انچارج

اس انتخاب میں شامل لازمی ہوں انشاء اللہ یہ کتاب پاکستان کے علاوہ امریکہ، دوئی، سعودی
عرب کے علاوہ دیگر ممالک میں پڑھی جائے گی انشاء اللہ۔ اس میں ہر ممالک سے شامل ہو سکتے
ہیں۔ اور شامل ہونا بھی آسان ہے آپ اپنی پسند کی دو غزلیں دے سکتے ہیں اور جو فیس دیں
کنیں ان کی کتابیں مل جائیں گے ایسا چانس بار بار نہیں ملے گا اس لیے سب سے پہلے ہے کہ
آپ سب شامل ہوں مزید معلومات کے لیے واٹس اپ 03225494228 یا فیس بک
03377017753 پر رابطہ کریں شکریہ
مفتاب: داستان دل ڈائجسٹ ٹیم

کے سمجھانے پر اس نے گاڑی سائیڈ پر روکی اور گلاسز نیچے کیے۔

”نہیں!“ اہلکار اس تک آیا تو وہ رعونت سے بولی۔

”اسٹیپ چیکنگ چل رہی ہے اور آپ نے گلاسز بھی ہلیک لگا رکھے ہیں۔ ان کے خلاف کریک ڈاؤن چل رہا ہے۔“

اہلکار کے کہنے پر وہ چلائی۔ ”تو.....!“

اہلکار نے بے چاری نظروں سے شہر کی طرف دیکھا تو وہ ان تک آیا۔

”آپ لوگ پلیز باہر آ جائیں۔ ہم ہلیک گلاسز اتاریں گے۔“ ایس بی شہیر نے سہولت سے کہا۔

”آر یومیڈ! مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ شانزے کی رعونت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”گاڑی کے پیچر ز اور ڈرائیونگ لائسنس دکھائیں۔“ وہ نیچے اتر آئیں تو اہلکار کو اشارہ کر کے وہ ان سے گویا

ہوا اشارہ پاتے ہی اہلکار گلاسز پر کام کرنے لگا۔

”پیچر ز ہمارے نہیں کہاں ہیں اور ابھی میں اٹھارہ کی نہیں ہوئی اس لیے لائسنس نہیں بنا۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔

ایس بی شہیر چراغ پا ہو گیا۔

”آپ جانتی ہیں فرد جرم عائد ہو سکتا ہے بغیر لائسنس گاڑی چلانے پر؟“

”سوواٹ؟“ شانزے اسے سیریس نہیں لے رہی تھی۔

”سر پلیز! ہمیں جانے دیں ہم بہت ایمر جنسی میں ہیں۔ فرینڈ کی مدد کو اسپتال پہنچانا ہے سو کسی چیز کا دھیان

نہیں رہا۔“ جبیں نے جلدی سے جھوٹی کہانی گھڑی۔

”نی میل ہونے پر کوئی کارروائی نہیں کر رہا لیکن آئندہ اس طرح کی لاپرواہی نہیں ہونی چاہیے۔“ اس نے

سہولت سے کہا۔ شانزے کی نظر گاڑی پر پڑی تو وہ چیونگ چبانا بھول گئی۔

”ہاؤڈیر یو! قانون کے تم جیسے رکھوالوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، شہر میں جرائم، دہشت گردی پنپ

رہی ہے اور تم سچ راہ میں شہریوں کو روک کر اپنا بکواس کام کر رہے ہو۔ جاؤ جا کر ملک کو سدھارو پہلے۔“

شانزے کی کڑوی سیلی باتوں سے شہیر کے ماتھے پر بل آ گیا۔

”میم! میں آپ سے ایک پڑھی لکھی اور ذمہ دار شہری کے نامے تمیز سے بات کر رہا ہوں اور آپ اپنی

اوقات دکھا رہی ہیں۔ کسی کی بگڑی اولاد لگتی ہیں اور ہمیں نہ سکھائیں ہماری ڈیوٹی ہم آپ جیسے اے سی، ہیئر میں

بیٹھ کر ملک اور سسٹم کو گالی دینے والوں میں سے نہیں ہیں۔ دن بھر جان پھیلی میں لیے پھرتے ہیں۔ دولت کے

نشے میں چور آپ جانتی کیا ہیں پولیس فورس کے بارے میں۔“ شہیر نے کھری کھری سنائی۔

”تم جانتے نہیں میں کس کی اولاد ہوں۔“ شانزے نے ہاتھ میں لیا فون استعمال کرنے کے لیے سیدھا

کیا۔ شہیر نے جھپٹ کر فون لے لیا۔

”بہت ہی فضول اور پرانا ڈائلاگ ہے، جس کی بھی اولاد ہیں گھر جا کر تسلی سے اپنے والد محترم سے بات

کچے گا۔ بھلے وہ کوئی توپ چیز ہوں مجھے میری ڈیوٹی کرنی ہے۔“

”شانزے! ہوش کے ناخن لو کیا بکواس کر رہی ہو۔“ جبیں نے اسے قابو کیا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے فون چھیننے کی۔“ خود کو جبیں سے چھڑا کر وہ چڑھ دوڑی۔

اہلکار اپنا کام کر کے گاڑی سے نکل چکا تھا۔ شہیر نے کلائی سے پکڑ کر اس کی ہتھیلی پر زور سے فون مارا۔

”زیادہ بدتمیزی کی تو جو تھوڑی رعایت دی ہے واپس لے کر تھانے لے جاؤں گا۔ میڈیا کو بلاؤں گا اور آپ کے خاندان کا نام روشن کر دوں گا۔“ شہیر کی آنکھوں میں حد درجہ غصہ تھا۔ اس نے ہلکے سے پیچھے کی طرف دھکیل دیا شانزے کو جانے وہ اس کی دھمکی سے ڈر گئی تھی جو جیس کے کھینچنے پر چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

☆.....☆

عروش کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا۔ وہ حد سے زیادہ نروس تھی۔ گلی کے اسکول سے میٹرک اچھے نمبر میں پاس کر کے قریبی کالج سے گریجویشن کی ڈگری لی تھی۔ وہ بہت ذہین اسٹوڈنٹ تھی۔ ہمیشہ اچھے نمبر لیتی تھی۔ تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے محلے کے بچوں کو ٹیوشن دیتی تھی۔ قرآن پڑھاتی تھی۔ فارغ اوقات میں محلے والوں کے کپڑے بھی سیتی تھی۔ حیات صاحب گورنمنٹ ملازم تھے۔ گزر بسر بہت اچھی ہو رہی تھی۔ قناعت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی وجہ سے شکلیہ اس کے بیاہ کے لیے بھی جوڑ رہی تھیں۔ شکلیہ خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تھیں مگر میاں کی کمائی پر انہیں کوئی شرمندگی نہ تھی۔ دونوں ہی خوددار تھے۔ شکلیہ کی فیملی کے لاکھ چاہنے کے باوجود انہوں نے بھی کوئی مالی مدد نہیں لی۔

عروش کی پردوش بھی انہوں نے اپنے حالات کو مد نظر رکھ کر کی تھی۔ اس کی فطرت میں ماں، باپ کی تربیت کا ہر رنگ تھا جو اس کی شخصیت سے بھی جھلکتا تھا۔ فطری شرم و حیا، نامحرم سے حتی الامکان دوری اسے بہت ممتاز بناتا تھا۔ گریز اسکول پھر گریز کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب اس نے مخلوط یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ شکلیہ اور حیات صاحب کو عروش پر بہت بھروسہ تھا اس لیے جب اس نے ماسٹرز کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی بات کی تو انہوں نے انکار نہیں کیا۔ گریجویشن اس نے اتنے اچھے نمبرز سے کلیئر کیا تھا کہ تعلیم سے دور رکھنا اس کے ساتھ زیادتی ہوتی۔

یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی ہر طرف رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ اسٹاکس، کیڑوں، امپورٹڈ جوتوں، بیگز، گلاسز سے مزین ہر کوئی کسی نہ کسی برانڈ کا اسپیسڈ رنگ رہا تھا۔ اسے اپنی کم مائیگی پر بھی شرمندگی نہیں ہوئی تھی نہ وہ اس وجہ سے کنفیوژ تھی اتنے سارے چہروں کو ایک ساتھ وہ شاید پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ خصوصاً لڑکوں کے بلند و بانگ قہقہے پر سر پر جھاو پٹا بار بار ٹھیک کر رہی تھی۔

کلاس بھری ہوئی تھی۔ بیک مضبوطی سے پکڑے وہ اندر داخل ہوئی۔ بہت کم سیٹ خالی تھیں۔ اس پر سے اس کے حلیے پر کئی ایک نے ”اوکی“ آواز نکالی۔ کسی نے سیٹی بجائی۔ کچھ نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ تو کسی نے آثار قدیمہ، مومن جوڈو کہنا فرض سمجھا۔ تقریباً ساری سیٹ پر لڑکے قابض تھے اور ان ہی کے پاس جگہ بھی خالی تھی۔ لڑکیوں کے ساتھ ساری سیٹ بھر چکی تھیں۔

”جو بھی کہو پر ہے غضب کی پڑیا۔“ پہلی رو سے آواز آئی۔ اس میں ہمت نہ ہوئی کہ اسے کوئی جواب دے۔ وہ بیٹھنے کے لیے جگہ دیکھ رہی تھی جب اسی لڑکے نے ”مس پلینز“ کہہ کر قہقہہ لگایا۔ ایک اور لڑکی بھی کمرے میں داخل ہوئی۔ اسی لڑکے کے ساتھ والی چیئر پر بیٹھ کر دوسری چیئر اس کے لیے گھسیٹنے لگی۔

”بیٹھ بھی جاؤ، کوئی تمہارے لیے شاہی کرسی نہیں لائے گا۔“ اس نے بھی بیٹھنے میں عافیت جانی۔

”نام کیا ہے تمہارا؟ میں ردا ہوں۔“ اس لڑکی نے ہاتھ بڑھایا۔

”میں عروش ہوں۔“ اس نے ہاتھ تھام لیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ انجسٹ 33 دسمبر 2016ء

”اچھا نام ہے، معنی کیا ہیں؟“ اسے شاید بولنے کی بیماری تھی۔ عروش کو کوفت ہونے لگی۔

”جنت کا فرشتہ۔“ ناچار اسے بتانا پڑا۔

”ہے گائزلسن شی از آئجل آف آور کلاس۔“ وہی لڑکا اپنے ساتھیوں سے کہہ کر قہقہہ لگا رہا تھا۔ لیکچرار کے آنے پر سب خاموش ہو گئے۔ عروش نے سوچ لیا تھا وہ ردا کی کسی بات کا جواب نہیں دے گی۔

☆.....☆

جبیں کو اس کے گھر ڈراپ کر کے وہ پارکنگ پر آ کر رکی۔ باہر نکلی۔ سائیڈ میں لوہے کا روڈ تھا۔ اس نے وہ روڈ اٹھایا اور اس وقت تک پیچھے نہ ہٹی جب تک گاڑی ڈیج نہ ہو گئی۔ شور پر ملازموں اور سیکورٹی اہلکار بھاگے چلے آئے اور لب سے شانزے کی کارگزاری دیکھ رہے تھے۔

”ڈیڈ کہاں ہیں؟“ اندر کی طرف جاتے اس نے اشتیاق سے دریافت کیا۔ جس کے پاس گھر کے ایک ایک بندے کی رپورٹ ہوتی تھی۔ کون کب کہاں ہوتا ہے۔

”سر! دو گھنٹے پہلے میٹنگ کے لیے اسلام آباد گئے ہیں میم۔“ وہ سر جھکائے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

”کب تک آئیں گے؟“ وہ تیز تیز چلتی بول رہی تھی۔ اشتیاق بھی قدم سے قدم ملائے پر مجبور تھا۔ ”کل شام تک آئیں گے۔“

”بھائی کہاں ہے؟“ اگلا سوال ہوا۔

”وہ اپنی پرسنل انکٹیویٹی کے لیے نکلے ہیں۔ صبح واپسی ہوگی ان کی۔ کوئی پرابلم میم!“ وہ اس کے غصے کی وجہ جانتا چاہ رہا تھا۔

”ہے..... میں ڈیڈ سے ہی بات کروں گی۔“ شانزے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

”میم! گاڑی کا کیا کرنا ہے؟ سروس کے لیے بھیج دوں۔“ وہ اپنی ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔

”نہیں اسے وہیں رہنے دو۔ پوزیشن بھی نہ بدلنا۔ اس پر نظر پڑتی رہے گی تو انتقام لینے میں مزا آئے گا۔“ شانزے نے غصے میں کہا۔

”اوکے میم!“ بے تاثر چہرے کے ساتھ اشتیاق ملازموں کو گاڑی سے متعلق ہدایت دینے چلا گیا۔

”ایس پی شہیر تمہاری تو میں وردی اتروا کے دم لوں گی۔“ اپنے کمرے میں داخل ہو کر جوتے ہوا میں اچھا لیتے بیڈ پر گر گئی۔ ٹھیک کے احساس سے وجود سنگ رہا تھا۔

”دو کوڑی کے ایس پی کی اتنی مجال۔“ کروٹ بدلتی وہ سخت بے چین تھی۔

☆.....☆

وہ سخت بے چین تھی۔ یونیورسٹی سے گھر تک ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔ وہ نڈھال ہو گئی تھی۔ پہلا دن تعارف اور کلاسز کی ٹائمنگ اور لیکچرار کے انتخاب میں ہی گزر گیا۔ اس کی صورت دیکھ کر شکلیہ کی جان میں جان آئی۔ اتنی دور تعلیم کے لیے پہلی بار گھر سے نکلی تھی۔

”روز اتنی ہی دیر ہوا کمرے کی؟“ گھڑی چار بج رہی تھی۔ پانی کا گلاس تھماتے شکلیہ استفسار کر رہی تھیں۔

”جی میں نے ان ہی لیکچرار کی کلاس کا انتخاب کیا ہے جن کی ٹائمنگ جلدی کی ہے۔“ پانی پینے کے بعد

جواب دیا۔

”کیسا رہا پہلا دن؟“ ماں، بیٹی دوستوں کی طرح تھیں۔ اسکول، کالج سے واپس آ کر وہ سارے دن کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

34 دسمبر 2016

احوال سناتی تھی۔

”بہت الگ دنیا ہے ای! مجھے لگ رہا ہے میں نے ماسٹرز کرنے کا فیصلہ غلط کیا ہے۔ پرائیویٹ بھی کر سکتی تھی۔“ وہ ہنسوج آواز میں بولی۔

”آج پہلا دن تھا۔ آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گی۔ اتنا لمبا سفر تم نے پہلے کیا نہیں تا اس لیے پریشان ہو گئی ہو۔“ شکیلہ نے محبت سے کہا۔ تنہا اس کے صبح چہرے سے ظاہر تھی۔ اپنی حسین بیٹی انہیں بہت عزیز تھی۔ عزیز تو ہر بچہ ہوتا ہے مگر جو مان، فخر، غرور بن جائے جس کی وجہ سے لوگ ماں، باپ کی تربیت کی تعریف و توصیف کریں وہ بچہ عزیز از جان ہو جاتا ہے۔

”کھانا کھا کر آرام کر لو۔“

”جی میں فریش ہو کر آتی ہوں۔ آپ نے بھی نہیں کھایا ہوگا یقیناً۔“ اس نے جھوٹی ہنسی سے دیکھا۔ وہ مسکرا دیں۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تم باہر تھیں تو میرے حلق سے نوالہ کیسے اترتا؟“

”مجھے تو دیر ہو جایا کرے گی۔ آپ کھا لیجیے گا کل ہے، اتنی دیر تک بھوتی رہیں تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔“

وہ تہیہ کرتی چیخ کرنے کے خیال سے کمرے میں چلی گئی۔ اسے ماں کی محبت پر مان تھا۔

☆.....☆

اسے اپنے باپ بھائی پر بہت مان تھا کہ اگر وہ ابھی ہوتے تو شہیر کی بوٹیاں ہو چکی ہوتیں۔ مگر اسے کل کا انتظار کرنا تھا۔ جبیں آئی ہوئی تھی اور اسے شاپنگ پر چلنے کے لیے اصرار کر رہی تھی۔

”جب تک میں ایس پی شہیر کو اس کی اوقات یاد نہ دلاؤں۔ مجھے چین نہیں آئے گا۔“

”بات اتنی اہم نہیں ہے۔ میں نے تمہیں کل بھی سمجھایا تھا اور تم نے گاڑی کا بھی حشر کر دیا۔ دیکھ کر آرہی ہوں۔“

جبیں اس کی بہت اچھی دوست تھی۔

”بھائی کو بتا دیتی تو ایسا ہی حشر ابھی تک شہیر کا بھی ہو چکا ہوتا۔ ڈیڈے یہ کہہ کر اس کی وردی اتر واؤں گی جس کا بہت رعب جمار ہا تھا۔“ شانزے اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ جبیں نے ہار مان لی۔ بھینس کے آگے بین بجانے والی بات تھی جو ٹھان لے وہ کر کے دم لیتی تھی۔

”سی ویو چلتے ہیں، ڈیڈے کے آنے تک اگر میں اسی ماحول میں رہی تو خود کو بھی شوٹ کر لوں گی۔ شاپنگ پھر کسی دن کریں گے۔“ شانزے کے پلان پر جبیں سر ہلاتی میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ شانزے نے کپڑے نکالے اور چیخ کرنے چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں وہ سی ویو پر تھیں۔ مین روڈ چھوڑ کر وہ کچے پر اتر آئی۔ دائیں بائیں آگے پیچھے گاڑی دوڑاتی وہ سی ویو کے آخری پوائنٹ تک چلی گئی تھیں۔

تیز میوزک سنتی شانزے ریلیکس ہو کر گاڑی بند کر کے بیٹھ گئی تھی۔

”شانزے! بہت اندھیرا ہو گیا ہے، چلتے ہیں۔“ جبیں نے برگر کھاتے ارد گرد نظر دوڑاتے کہا۔ لوگوں کا ہجوم بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

”منہ بند رکھو، انجوائے کرنے دو۔ مشکل سے موڈ ٹھیک ہوا ہے۔ دوبارہ آف مت کرو۔ بہت ڈرپوک ہو

تم۔“ آنکھیں موندے شانزے نے ناگواری سے کہا۔

”ہوں میں ڈرپوک، میرے والد مل اوڑھیں۔ تمہاری طرح میری رگوں میں سیاسی گھرانے کا خون گردش نہیں کر رہا۔“ جبیں نے منہ بسورتے کہا۔ اسی وقت دروازہ کھول کر کسی نے جبیں کو ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دھکیلا۔ گیر پر گرتی جبیں کی چیخ بے ساختہ تھی۔ اسلحہ بردار شخص جبیں کی سیٹ پر قابض ہو چکا تھا۔ ایک اور شخص پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ان دونوں پر گن تانے بیٹھا تھا۔

”اگر شور مچایا تو دونوں کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔ لڑکی گاڑی چلا، جس طرح تو پچھلے ایک گھنٹے سے چلا رہی ہے۔“ شانزے کے بھی اوسان خطا ہو چکے تھے۔ خوفناک چہرے والا شانزے کی پہلی میں گن گسا کر بولا۔

”کیا جانتے ہو؟“ شانزے نے حواس بحال کیا۔ جبیں اس کے ساتھ لگی کانپ رہی تھی۔

”اپنے گھر کال کر اور 50 لاکھ منگوا آدھے گھنٹے کے اندر۔“ دونوں آگاہ ہو چکی تھیں کہ وہ شارٹ ٹرم اغوا کا شکار ہو چکی ہیں۔ جس میں کڈنیر آدھے گھنٹے تک سڑکوں پر گاڑی دوڑا کر رقم نکلواتا ہے اور پھر چلتا ہوتا ہے۔ شانزے نے آدرش کو کال کی۔

”بھائی میں اور جبیں سی دیو پر ہیں۔ شارٹ ٹرم کڈنیر نے آدھے گھنٹے میں 50 لاکھ کی ڈیمانڈ کی ہے۔“ شانزے کے بولنے پر آدرش دھاڑا۔

”ان کی تو میں دھجیاں اڑا دوں گا۔“

”زیادہ بڑکیاں نہ مارا اور پیسوں کا انتظام کر۔“ سیل فون قریب کرتے ساتھ بیٹھا بندہ رعب جما کے بولا۔

”تو نے نوروز علی خان کی بیٹی اور آدرش علی خان کی بہن کو اغوا کرنے کی جرأت کی ہے۔ تیری نسلیں اس حماقت کا تاوان بھگتیں گی۔“ آدرش کی دھاڑ پر کڈنیر کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سیاسی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اگر انہیں خبر ہوتی تو وہ کبھی اس طرح کی حماقت نہ کرتے۔ لوٹ مار اور اس طرح کی واردات کے لیے یہ علاقہ آسان ہدف تھا۔ یہاں اس سے پہلے بھی وہ کئی واردات کر کے کروڑوں روپے حاصل کر چکے تھے۔ امیروں کی بگڑی اولاد اسی طرح گاڑیوں میں موجود ہوتی تھیں اور وہ ان کی تنہائی کا اچھے سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ پیچھے والے نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”نکل چلتے ہیں۔“ آگے والے نے کہا۔

”لیکن یہ دونوں ہمیں پہچان چکی ہیں۔“ پیچھے والے نے احساس دلایا۔

”ہے تو سیاسی گھرانے کا گندہ خون ہماری جان تھوڑی چھوڑیں گی۔ ایسا کرتے ہیں دونوں کو مار دیتے ہیں۔“ پیچھے والا گن لوڈ کرتے بولا۔ دونوں کی جان حلق میں آگئی۔

”ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ پلیز ہمیں نہ مارو۔“ شانزے ہاتھ جوڑے گھٹکھیا رہی تھی۔ ساری بہادری کرو فر دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

”انہیں چھوڑنا غلطی ہوگی۔ جلدی فیصلہ کرو، پولیس تو بعد میں پہلے اس کا خاندان ہمیں پاتال سے ڈھونڈ نکالے گا۔ ان کے تو سوا ہے۔“ پیچھے والا مسلسل سامنے والے کو سمجھا رہا تھا۔

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ سامنے والا راضی ہو گیا۔ دونوں کو اپنی موت نظر آنے لگی۔

”میرا تعلق سیاسی گھرانے سے نہیں ہے مجھے جانے دو پلیز۔“ جبیں کے ہاتھ جوڑتے شانزے کو اپنے

کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے اپنی موت یقینی نظر آرہی تھی۔ کبیرہ و صغیرہ گناہوں کی معافی مانگتے اس نے کلمہ پڑھ لیا۔ جس نام پہچان پر اسے گھمنڈ تھا، ناز تھا، وہی اس کی موت کی وجہ بن گیا تھا۔ گن اس کی کنپٹی سے لگا ہوا تھا۔ وہ چاروں ارد گرد سے غافل ہو چکے تھے۔

”گن نیچے گر کے باہر نکلو۔“ شانزے کی آنکھ آواز پر کھلی۔ کڈنپیر کے بازو کو مروڑ کے کسی نے پیچھے کیا ہوا تھا اور ایک گن اس کی کنپٹی سے لگی ہوئی تھی۔ پیچھے بیٹھے بندے کو بھی دیگر لوگ قابو کر چکے تھے۔

”باہر نکلیں سب۔“ پرزور آواز پر شانزے اور جنیں بھی کپکپاتے پیروں سے باہر نکلتیں۔ شانزے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انسپکٹر شہیر اور پولیس کے جوانوں کو دیکھ رہی تھی۔ ہیڈ لائٹ کی روشن میں کڈنپیر زان کے زرنے میں تھے۔

کئی مہینوں سے انہیں اس مقام پر واردات کی اطلاع مل رہی تھی۔ اس گینگ کے پیچھے وہ کانی دنوں سے لگے ہوئے تھے۔ بلیک کار کو وہ کانی دیر سے واپس کر رہے تھے۔ انہیں اس گینگ کی کارروائی کا ہی انتظار تھا۔ جب انہوں نے اپنی کارروائی شروع کی تو شہیر اور اس کی پارٹی ایکشن میں آ گئی۔

دونوں کو موبائل میں ہٹھایا جا چکا تھا۔ شہیر ان کی طرف الیا۔

”اتنی رات کو اس اندھیری جگہ پر آپ لوگ کر کیا رہی تھیں؟“ وہ آتے ہی چلایا اور جب اس کی نظر دونوں کے چہرے پر پڑی تو وہ اور غصہ ہو گیا۔

”آپ... دونوں کو گھر پر چین نہیں ہے۔ یہ مقام اور یہ وقت مناسب ہے لڑکیوں کے لیے؟“ وہ خشمگین لگا ہوں سے گھور رہا تھا۔

”سر! ہم تفریح کے لیے آئے تھے۔“ جنیں نے بولنے کی سعی کی۔

”بیان ریکارڈ کروانے کے لیے آپ لوگوں کو چلنا پڑے گا پولیس اسٹیشن۔“ شانزے خاموشی سے شہیر کو دیکھ رہی تھی۔

اسی وقت کئی گاڑیوں کے ٹائر جڑے چرائے اور کھٹا کھٹ دروازے کھلے شہیر اور اہلکار اُلٹ ہو گئے۔ گارڈز پھیل چکے تھے۔ جدید اسلحے سے لیس وہاٹ کلف لگے سوٹ میں ملبوس آدرش علی خان جیب سے نکلا۔

”کہاں ہیں وہ کڈنپیر؟“ آدرش، شانزے کو ساتھ لگائے کھڑا استفسار کر رہا تھا۔ شہیر اور دیگر اہلکار آدرش علی خان اور گارڈز کی فوج کو دیکھ کر متعجب تھے۔ شہیر کو یاد آیا کہ کل وہ اپنے والد کا ذکر تو کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے بی سانس چھوڑی اور آدرش کو بخوردیکھنے لگا۔

”کیا معاملہ ہے؟“ آدرش، شہیر کی طرف آیا۔ شہیر اس کی رعونت اور انداز سے کسی قدر نالاں نظر آ رہا تھا۔ اس نے واقعے کی تفصیل گوش گزار کی۔

”سچ کہہ رہا ہے یہ؟“ آدرش، شانزے سے باز پرس کر رہا تھا۔ شہیر کا خون کھول اٹھا۔ ان سماجی کارکنوں کی اصلیت سے وہ بہت اچھی طرح آگاہ تھا۔

”جی بھائی! اگر یہ خوش قسمتی سے آج اس گینگ کو ٹارگٹ نہ کر رہے ہوتے تو آج میں زندہ نہ ہوتی۔“ شانزے نے سچائی بتائی۔

”کہاں ہے وہ دونوں خبیث؟ لے کر آؤ میں خود انہیں شوٹ کروں گا۔“ آدرش نے شہیر کو زرخیر غلام کی طرح حکم دیا جیسے وہ گورنمنٹ کا نہیں اس کا ملازم ہو۔

”سر! وہ پولیس اسٹیشن منتقل ہو چکے ہیں اگر یہاں ہوتے بھی تو میں آپ کو یہ شوق پورا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کارسرخ میں کسی کو مداخلت کی اجازت میرے سامنے نہیں ہے۔“ ٹھوس لہجے پر آدرش نے بغور اسے دیکھا۔

”غالباً نئی پوسٹنگ ہے، نیا جوش ہے، تب ہی تو یہ بھی دکھا رہے ہو۔“ آدرش نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔
”بھائی! انہوں نے میری جان بچائی ہے۔ آپ کو شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“ شانزے نے انہیں بھڑتے دیکھ کر کہا۔

”چلو تمہارے صدقے معاف کیا ورنہ میں اس لب و لہجے کا عادی نہیں۔“ آدرش، شانزے کو بازو کے گھیرے میں لیے آگے بڑھ گیا۔

”سر! بیان ریکارڈ کروانا پڑے گا لی بی کو۔“ اہلکار نے مودبانہ کہا۔
”گھر بھیج دینا بندے کو۔“ آدرش حکم سناتا جیب میں بیٹھ گیا۔ پورے کروفر سے اس کا قافلہ سیکنڈز میں مٹی اڑاتا چلا گیا۔

”سیاست کی ناجائز اولاد..... پولیس کو گھر کی لوٹڈی سمجھے بیٹھے ہیں۔“ اہلکار نے ناگواری سے کہا۔ شہبیر موبائل کی طرف بڑھا۔
”اچھائی کی توقع ان جیسوں سے رکھنا عبث ہے۔“ شہبیر کی رائے اچھی نہ تھی۔

☆.....☆

عروش کی رائے میں آج کا دن بہت تھکا دینے والا تھا۔ کھانا کھا کر وہ آرام کی غرض سے لیٹی ہی تھی کہ ٹیوشن پڑھنے والے بچے آ گئے۔

”آج چھٹی دے دیتیں۔“ سلالی مشین سنبھالتی شکلیہ اس کی تھکن کے پیش نظر کہہ رہی تھیں۔
”بچوں کے پیچہز ہونے والے ہیں، حرج ہو گا ان کا۔ ایک دن سے کیا ہو گا روز کی تھکن ہوگی، بیچ کرنا پڑے گا۔ یعنی کاسوٹ بھی اڈھورا تھا۔ وہ بھی سینا ہے۔“ بولتے بولتے اسے پڑوس کا سوٹ یاد آ گیا۔
”میں نے کر دی۔ تربائی رہتی تھی خالی وہ تو لے بھی گئی سوٹ۔“ شکلیہ نے جواب دیا۔ وہ سر ہلا کر بچوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ بچوں کی شفٹ بدلتی رہی ہر گھنٹے پر پہلے والے بچے چلے جاتے اور ان کی جگہ نئی کلاسز کے بچے لے لیتے۔

درمیان میں اٹھ کر اس نے چائے بھی بنالی، آٹھ بجے فارغ ہوئی تو روٹی بنانے کچن میں چلی آئی۔ شکلیہ منع کرتی رہی مگر اسے احساس تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں شکلیہ پر کام کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ حیات صاحب بھی آگئے تو تینوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ گورنمنٹ جاب کے بعد وہ دوست کی کپڑوں کی شاپ پر چلے جاتے تھے۔ کیش کاؤنٹران کے انڈر تھا۔ دکان میں موجود لڑکوں سے کام کروانا ان کی ذمہ داری تھی۔ ان کے دوست کی دو شاپ تھیں۔ ایک کی دیکھ بھال وہ خود کرتے تھے۔

حیات صاحب دن بھر کی روداد پوچھ رہے تھے۔
”لگن سے پڑھنا۔“ بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ سونے چلے گئے۔ دن بھر کی تھکن ان کی چال سے نمایاں تھی۔

برتن دھو کر کچن سمیٹ کر وہ اپنی جگہ سونے کے لیے لیٹی تو دیکھتی کہ رنے دہائی وی۔ صبح یونیورسٹی جانے کے

خیال سے اسے وہ لڑکایا دیا گیا جو بار بار کنٹ پاس کر رہا تھا۔ اسے وہ ذرا اچھا نہ لگا تھا۔
 ”ہیلو آنجل!“ عروش تیز تیز قدموں سے کلاس کی طرف جا رہی تھی جب وہی کل والا لڑکا اس کے ساتھ
 چلنے لگا۔ اس نے ٹھوڑی کے پاس سے سر پر اوڑھنا دھو پٹا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ چہرے پر ناگواری آگئی۔ اس کی
 جرات حیران کرنے کے ساتھ پریشان بھی کر رہی تھی۔ جانے کیوں اس نے اس کا پیچھا لے لیا تھا۔
 ”اف مڈل کلاس ادا میں۔“ وہ اور اس کے ساتھی ہنسنے لگے۔ وہ تیز تیز چلتے ان سے پہلے کلاس میں داخل
 ہو گئی اور پہلی خالی سیٹ پر جلدی سے بیٹھ گئی جیسے مزید ٹانگوں میں جان نہ ہو۔
 ”کیا ہوا؟“ بے دھیانی میں وہ رداء کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس کی اڑتی رنگت پر استفسار کر رہی تھی۔ اتنے
 میں وہ اور اس کے ساتھی عروش کو دیکھتے تہقہہ لگاتے سامنے سے گزر گئے۔

”کچھ کیا ان لوگوں نے؟“ عروش کے چہرے سے ناگواری ظاہر تھی۔ رداء استفسار کر رہی تھی۔ اس نے
 کوئی جواب نہ دیا۔ واپسی میں وہ اور رداء پوائنٹ کی طرف جا رہی تھیں جب رداء حسب معمول بولنے لگی۔
 ”منج کے رہنا، آدرش علی خان نام ہے، نوروز علی خان کا بیٹا ہے۔ پورا خاندان سیاسی ہے۔ اثر و رسوخ ان
 کے گھر کی ٹوڈی ہے۔ مجھے بھی کل ہی اس کا تعارف سننے کو ملا ہے۔“ رداء اسے اطلاع دے رہی تھی۔ عروش
 مزید ہراساں نظر آنے لگی۔ انداز سے جان تو گئی تھی کسی کی بگڑی اولاد ہے مگر اس کی جڑیں اتنی گہری ہوں گی
 اندازہ نہ تھا۔

”اس کے پاس تو بہت پیسہ ہوگا۔ پھر کراچی کی یونیورسٹی میں کیا کرنے آیا ہے؟ سیاستدانوں کی اولادیں تو
 باہر ہی پڑھتی ہیں۔“ ڈر کر چھپ کر اس نے کہا۔
 ”اس کا بہتر جواب تو یہ ہی دے سکتا ہے۔“ رداء کدھے اچکا کر شٹل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسٹوڈنٹ کا
 قافلہ شٹل میں سوار ہو رہا تھا۔



ان کا قافلہ پہنچا تو نوروز علی خان بھی انہیں پارکنگ میں مل گئے۔ انہوں نے خیرانی سے شانزے جہیں اور
 آدرش کو ساتھ آتے دیکھا۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“ انہیں غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ آدرش نے قصہ مختصر سنایا۔
 ”سیکوریٹی گارڈز کے بغیر تم نکلی کیوں؟“ وہ شانزے پر غصہ کرنے لگے۔ جہیں اس منظر میں مس فٹ تھی وہ
 سائیڈ پر ہو گئی۔ شانزے سے کوئی جواب نہ ملا تو اشتیاق زیر عتاب آیا۔
 ”سر! شانزے بی بی نے نہ صرف آج بلکہ کل بھی مجھے اور گارڈز کو ساتھ نہ لے جانے پر سخت باتیں سنائی
 تھیں۔ میں نے بہت کہا تھا۔“ اشتیاق سر جھکائے کہہ رہا تھا۔
 ”نیکسٹ ٹائم اگر اس قسم کی لاپرواہی دوبارہ ہوئی تو میں تم سب کو شوٹ کر دوں گا۔“ وہ آپے سے باہر ہو
 رہے تھے۔

”یہ گاڑی کی کیا حالت ہو رہی ہے؟“ ان کی نظر شانزے کی چیمٹی گاڑی پر پڑی۔ اشتیاق مدد طلب نظروں
 سے شانزے کو دیکھ رہا تھا۔

”ڈیڈ! تنگ کر رہی تھی تو میں نے غصے میں یہ حال کر دیا۔“ شانزے کے جواب پر نوروز مطمئن ہو گئے۔
 ”پھینک دو گاڑی کو۔“ حکم دیتے وہ اندر کی طرف چلنے لگے۔ شانزے اور آدرش نوروز کے ساتھ تھے۔ وہ

تینوں لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ اشتیاق موزب کھڑا تھا۔ گارڈز فاصلے پر موجودا لڑتے تھے۔
 ”شانزے تفصیل بتاؤ جو کچھ ہوا۔“ سگار سلگاتے وہ باریکی سے تفصیل سن رہے تھے۔
 ”ڈیڈ! ایس بی کچھ زیادہ اسٹیوڈیو دے رہا تھا۔“ نوروز نے گوش گزار کیا۔

”شانزے کی جان بچا کر احسان کیا ہے اس نے ہم پر، اشتیاق کل بلواؤ اسے گھر میں ملنا چاہتا ہوں۔“
 آدرش کو سمجھا کر اشتیاق کو ہدایت دی۔

”اوکے سر!“ اشتیاق سر ہلا کر رہ گیا۔
 ”کل سارا دن لنگر تقسیم کرو، بیس تیس بکروں کا صدقہ دو، شانزے بحفاظت آگئی ہے۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں تمہیں بھی نہ بخشا۔ تم کہاں تھے جب یہ لاپرواہی ہو رہی تھی؟“ اشتیاق کو ہدایت دے کر وہ آدرش سے نفی کش کر رہے تھے۔ وہ کسی قدر بوکھلا گیا۔ نفی میں سر ہلاتے وہ جان گئے وہ اپنی رنگینوں میں مگن تھا۔
 ”شانزے! آئندہ تم گارڈز کے بغیر نہیں جاؤ گی۔ یہ میرا حکم ہے۔“ نوروز علی خان کے آگے یوں بھی سب جپ ہو جاتے تھے۔ شانزے ان کی چپتی بیٹی تھی۔ ان کی جان قیدھی اس میں۔ وہ سر ہلا کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

بستر پر گری تو ایک بار پھر سارا منظر یاد کر کے جھرجھری لے کر رہ گئی۔ جو کچھ ہوا وہ اتنا غیر متوقع اور اچانک ہوا تھا کہ عقل قبول نہیں کر پا رہی تھی۔

”اگر وہ گولی چلا دیتا اور میں مرجاتی پھر؟ اس وقت مجھے قبر میں پہنچانے کی تیاری ہو رہی ہوتی اور پھر منکر نکیر میرا حساب کتاب کر رہے ہوتے۔ یا اللہ!“ وہ جھرجھری لے کر آنکھیں میچنے لگی۔ موت اور اندھیری قبر کا خوف ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا گیا تھا۔

”شہیر سفیان!“ شانزے نے زیر لب نام لے کر آنکھیں موندھ لیں۔ وجہ وہ زور آور پرسنالٹی رکھنے والے شہیر میں کوئی تو بات تھی جو وہ اس کے ذہن سے چپک گیا تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے شہیر ہی اس کی سوچوں کا مرکز تھا۔ پرسوج کا انداز بدل گیا تھا۔ شانزے کل جہاں اس سے خار کھائے بیٹھی تھی۔ آج اس کی مشکور تھی۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے گارڈز اور وی آئی بی پروٹوکول دیکھا تھا۔ ان دنوں وہ انگلینڈ کے اسکول سے اے لیول کر کے گھر آئی تھی۔ اس نے آزاد زندگی گزاری تھی۔ جب سے واپس آئی تھی خود کو قیدی محسوس کر رہی تھی۔ وہ پیچھے چلتے گارڈز کی فوج سے نالاں ہو جاتی تھی۔

نوروز علی خان کی بیٹی اور آدرش علی خان کی بہن ہونے کا ثبوت اس کی زبان اور رعونت بھرا انداز دیتا تھا۔ ضدنی، خود سر، پیسے اور پاور کا غرور اس کے ہر انداز سے جھلکتا تھا۔ شائستہ بیگم کو خبر ہوئی تو وہ اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ پیچھے ملازمہ تھال اٹھائے کھڑی تھی جس میں نظر اتارنے کی زبانے بھر کی چیزیں تھیں۔
 ”کتنی بار کہا ہے شانزے! یہ انگلینڈ نہیں ہے یہاں تمہیں گارڈ کے بغیر نہیں نکلنا مگر تم من مانی کرتی ہو۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو پھر.....؟“ شائستہ بیگم نظر اتار کر ہزار کے نوٹوں کی گڈی اس کے سر سے وار کر تھال میں رکھ کر ملازمہ کو جانے کا اشارہ کر کے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”مام! میں ٹھیک ہوں؟ آئندہ خیال رکھوں گی۔“ شانزے بحث نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ شائستہ بیگم دوپٹہ سر پر جمائے اس سے تفصیل سن رہی تھیں۔ شہیر سفیان کے ذکر پر شانزے کی آنکھیں چمکنے لگیں۔



عروش کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ جب صارم کی آمد ہوئی۔ وہ اندر کمرے میں شکلیہ سے باتیں کر رہا تھا۔ کچن میں آنا گوندھتی عروش کا ہر عضو ساعیت بن گیا۔ اس کی آواز سن کر فرحت کا احساس ہوا تھا۔ وہ آیا بھی دو ہفتوں بعد تھا۔ درپردہ وہ خفا بھی تھی۔ صارم پچھوڑا دیتا تھا۔ نو عمری میں ہی حنا نے حیات صاحب سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ حیات اور شکلیہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ صارم عباس ان کا چہیتا تھا۔

بہت ادب کرنے والا۔ محبت سے لبریز تھا۔ چھوٹی عمر سے ہی اچھے برے کی تمیز تھی۔ حیات اور شکلیہ نے ہاں کر دی تھی۔ ان کی بیٹی صارم عباس جیسے بندے کے ساتھ زندگی گزارے انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ وہ کلاس ٹاؤن میں تھی۔ جب اس کے سر پر دوپٹہ ڈال کر حنا نے اسے گلے لگا کر کہا تھا۔

”آج سے عروش میری بہو ہے۔“ وہ حیران پریشان سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ صارم عباس ان دنوں فرسٹ ایئر میں تھا۔ وہ شکلیہ کے ساتھ بیٹھا زیر لب مسکرا رہا تھا۔ چہرے کی خوشی سے صاف ظاہر تھا کہ اس میں اس کی رضا بھی شامل ہے۔

”جب تم تین سال کی تھیں تب ہی میں نے بھائی اور بھابی سے کہا تھا کہ تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی صارم کی دہن بنا کر۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟“ حنا اس سے پوچھ رہی تھیں۔ کم سنی کے باعث اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

”تمہیں صارم پسند ہے نا؟“ حنا شرارت کے موڈ میں تھیں۔ سب کے مسکراتے لبوں سے گھبرا کے وہ کمرے سے بھاگ گئی تھی۔

ساری رات پھوپھی کی باتیں اور صارم عباس کی نظریں یاد کر کے اس کے لب آپ ہی آپ مسکراتے رہے۔ کم عمری کی محبت بدلتے وقت کے ساتھ پروان چڑھ گئی تھی۔

صارم عباس بہت محبت کرنے والے سلجھے شخص کا نام تھا۔ اس نے کبھی حیات صاحب کو بیٹے کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کے لائق جو بھی کام ہوتا وہ سرانجام دیتا تھا۔ ان دنوں وہ ایم فل کر رہا تھا۔ عروش کو تعلیم جاری رکھنے کی ترغیب اسی نے دی تھی۔

دو دن سے وہ یونیورسٹی نہیں گیا تھا۔ نہ ہی اس نے عروش کو فون کیا تھا۔ اسے اندازہ تھا وہ خفا ہوگی تب ہی خود چلا آیا۔

”عروش! صارم کو آئے کتنی دیر ہوگئی تم نے چائے تک نہیں بنائی۔“ شکلیہ کچن میں آکر سرزنش کرنے لگیں۔ ”رہنے دیں ممانی! لوگ اب یونیورسٹی جانے لگے ہیں۔ فرصت نہیں ہوگی ان کے پاس ہم غریبوں کے لیے۔“ صارم بھی کچن کے دروازے پر کھڑا تھا۔

”السلام علیکم!“ گڑبڑا کر وہ جلدی سے پانی چولہے پر رکھنے لگی۔

”وعلیکم السلام!“ صارم عباس نے مسکراتی نظروں سے دشمن جاں کو دیکھا۔ ایک سکون رگوں میں سرایت کر گیا تھا۔ عروش کی محبت کی جڑیں اس کے اندر بہت گہری تھیں۔

”آپ مینشن نہ لیں ممانی! چائے کیا میں کھانا کھا کر جاؤں گا۔“ اس نے پلان بیچا۔

”ضرور، ویسے بھی نہاری بنی ہے تمہیں بہت پسند ہے نا، تم چائے پیو حیات بھی آنے والے ہوں گے۔

میں تب تک نماز عشاء پڑھ لوں۔ دیر ہو جائے تو سستی ہو جاتی ہے۔“ شکلیہ وضو کی نیت سے کمرے میں بنے واش روم کی طرف چلی گئیں۔ کچن کی دیوار سے ٹپک لگائے ہاتھ سینے پر بائیں سے وہ اسے پیڑے جاتا دیکھ رہا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔
”خفا ہو؟“

”کس بات پر؟“ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔ وہ بھرپور انداز سے مسکرایا۔ انرا تسک جتانے کا اس کا یہ ہی انداز ہوتا تھا۔

”دودن ہو گئے تمہیں یونیورسٹی جاتے، میں نے وش بھی نہیں کیا۔“ اس نے خود وجہ بتائی۔

”آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔

”بگلی مجھے فرق نہیں پڑے گا تو کے پڑے گا۔“ چہرے پر جھولتی لٹ کو کھینچا۔

”پچھلے دنوں اکیڈمی کی وجہ سے بہت مصروفیت رہی۔ پیپرز لے رہا تھا۔ اکیڈمی میں۔ ایک ہفتے سے طبیعت

ٹھیک نہیں تھی۔ دودن سے اکیڈمی بھی نہیں جا رہا ہوں۔ ابھی تھوڑی ہمت ہوئی تو چلا آیا تم سے ملنے۔“ احوال بتایا۔

”کیا ہوا تھا آپ کو؟“ اک پل میں ناراضی ختم کر کے فکر مندی سے پوچھنے لگی۔

”بخار تھا۔ بتایا کیوں نہیں؟“

”تم پریشان نہ ہو جاؤ اس لیے نہیں بتایا۔ پتا تھا منہ سجائے بیٹھی ہوگی۔“ اس کی فکر مندی، تڑپ اچھی لگ

رہی تھی۔ وہ ایک جان دو قالب تھے۔ چھوٹی سی چھوٹی بات ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ محبت کے علاوہ ان کے سچ دوستی کا گہرا رشتہ تھا۔

”آپ کی غیر حاضری پر ویسے بھی پریشان تھی۔“ وہ چائے نکالنے لگی۔

”اب تو بندہ حاضر ہے، بولو کیسا رہا تجربہ؟“

”بس ٹھیک ہے، عجیب سا ماحول ہے۔ لڑکیوں کی زیادہ تر دوستی لڑکوں سے ہے۔ کافی حد تک دونوں مخلوق

ایک دوسرے کو الو بنا رہی ہے، کچھ چھچھور پن ہے۔“ وہ آدرش اور اس جیسے لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر حقیقتاً دکھی تھی۔

”لڑکیوں نے لڑکوں سے اس لیے دوستی کر رکھی تھی کہ لڑکے اس کا خرچہ اٹھا رہے تھے۔ کھانے پینے کا بل، موبائل

کے کارڈز لوڈ کرواتی تھیں۔

”ماحول انسان بناتا ہے، نہ تم اس نیچر کی ہو، نہ تمہیں یہ سب اچھا لگا۔ تم بس اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔ کوئی

دشواری ہو تو مجھے بتا دینا، بلکہ میں ماموں سے بات کر لیتا ہوں، پوائنٹ میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میرے ساتھ جانا اور واپس آنا۔ تمہیں بھی پریشانی نہیں ہوگی اور ماموں، ممانی بھی تمہارے گھر آنے تک ٹینشن

میں نہیں رہیں گے۔“ ایسا ہی تھا وہ احساس کرنے والا۔ عروش کو کچھ سکون ہوا۔ ورنہ دودن کے طویل سفر نے

اسے بے زار کر دیا تھا۔

”یقین کرو بے چاری چینی گھل کر اپنا نام و نشان کھو چکی ہے۔ اب تو کپ دے دو۔“ اس کی باتیں سنتے۔

کپ میں چینی ڈال کر وہ چائے کس کر رہی تھی جس پر وہ بول پڑا۔

”اوہ سوری! دھیان نہیں رہا۔“ چمچ رکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔

”ظاہر ہے جب نظریں مجھ پر جمائے رکھو گی تو دھیان کہاں ہوگا چائے کی طرف۔“ اس نے چھیڑا۔

”اتنے بھی خوب صورت نہیں ہیں آپ۔“ چڑا گئی۔

”لیکن تم تو بونے سب لیتے اس نے بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بلش ہو کر دوبارہ روٹی کی

طرف متوجہ ہوئی۔ دن بھر کی تھکن زائل ہو چکی تھی۔

☆.....☆

”دن بھر کی تھکا دینے والی ڈیوٹی بھگتا کر وہ ڈیڑھ بجے گھر میں داخل ہوا تو سب سو رہے تھے۔ ملازم کو کافی کا کہہ کر وہ کمرے میں جانے لگا تو ماما اپنے کمرے سے نکل آئیں۔“

”والسلام! دیر ہو گئی؟“

”جی۔ آپ جاگ رہی ہیں؟“

”جب تک تمہاری صورت نہ دیکھ لوں نیند نہیں آتی۔ کھانا لگواؤں؟“ انہوں نے اس کے تھکے چہرے کو دیکھا۔

”بھوک نہیں ہے برگروغیرہ کھالیا تھا۔ صرف کافی کی طلب ہے منیر کو کہہ دیا ہے۔ آپ ریلیکس ہو کر آرام کریں۔“ برگروالی بات اس نے جھوٹ کہی تھی۔ نہ کہتا تو ماما زبردستی کھانا لگواتیں۔ اس وقت وہ صرف آرام کرنے کے موڈ میں تھا۔

”ڈیڈ گئے تھے فاطمہ آپ کے ساتھ ہاسپٹل؟“ وہ دن بھر کی روٹین میں بھولا نہیں تھا۔ ڈاکٹر کی اپائنٹمنٹ تھی۔

”ہاں! اللہ کا شکر ہے اب بہت بہتر ہے کنڈیشن۔ دوا دے کے سلایا ہے۔ بغیر ضد کیے بات مانی ہے آج۔“ ماما گوش گزار کر رہی تھیں۔ شبیر اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ بھی جا کر سوئیں۔ میں بھی چھینچ کر کے آرام کروں گا۔“ ماما سر ہلا کر منیر کو کافی کے ساتھ سینڈوچ بنانے کا کہنے پکن میں چلی گئیں۔ وہ شبیر کی روٹین سے واقف تھیں۔ اسے جھوٹ بولنا نہیں آتا تھا۔ برگرا سے ذرا پسند نہیں تھا اور اس نے بھوک میں کھایا ہو۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

فریش ہو کر ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں بستر پر لیٹا تو جسم کا ایک ایک جوڑ دکھنے لگا۔ منیر دستک دے کر آگیا۔ کافی کے ساتھ سینڈوچ اور ڈرائی فروٹس کی پلیٹ دیکھ کر اسے ماما پر بے ساختہ پیار آیا۔

”بی بی جی نے کہا ہے سینڈوچ لازم کھانے ہیں۔“ منیر پیغام دے کر جا چکا تھا۔ اس نے ٹی وی آن کر کے سینڈوچ اٹھالیا۔ نظریں کافی کنگ پر جمائے وہ گہری سوچ میں تھا۔

☆.....☆

اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے صارم عباس نے حیات صاحب اور شکیلہ سے عروش کے لیے پک اینڈ ڈراپ کی بات کر لی تھی۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ صارم بھی اسی یونیورسٹی سے ایم فل کر رہا تھا۔ اس کا بھی روز کا آنا جانا تھا۔ اچھا تھا دونوں ساتھ جاتے۔ انہیں بھی عروش کی طرف سے پریشانی نہ ہوئی۔

صبح حسب وعدہ وہ اسے پک کرنے آیا تھا۔ دوپہر سلیقے سے لیے بیک اٹھائے شکیلہ کو اللہ حافظ کہہ کر وہ باہر نکل آئی۔ وہ بائیک پر منتظر تھا۔

”دھیان سے چلانا بیٹا، اللہ کی امان میں۔“ شکیلہ دروازے تک آئیں۔ صارم کے ساتھ بائیک پر وہ پہلے بھی سفر کر چکی تھی مگر ایمر جنسی میں بھی بھیسو نے بلایا ہوا کوئی کام پڑ گیا ہو تب =

”صارم! آپ نے امی، ابا سے پریشان کیسے لی؟“

صارم عباس بیٹوں کی طرح تھا مگر اکیلے اس کے ساتھ وہ بہت کم کہیں گئی تھی۔ اسے روز کی پک اینڈ ڈراپ پر پریشان ملنے پر حیرانی تھی۔

”ماموں پہلے شش و پنج میں تھے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ میں نے کہہ دیا کہ لوگوں کی پروا کرنا چھوڑ دیں۔ ان کا تو کام ہی کہنا ہے اور پھر جب میں اپنی مستقبل کی بیوی کی ذمہ داری ابھی سے اٹھانا چاہ رہا ہوں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تم بلاوجہ مت سوچو انہیں مجھ پر اعتماد ہے۔“ وہ اس کے سوال کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔

”مجھے تو نہیں ہے۔“ اس نے شوخی سے کہا۔

”کیوں بی بی! میں نے کون سا آپ کو سر راہ چھیڑا ہے۔“ وہ بھی شوخی سے پوچھنے لگا۔ یونیورسٹی آچکی تھی۔ اسے اس کے ڈیپارٹمنٹ میں چھوڑ کر اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کا رخ کیا۔

☆.....☆

صبح تھانے کا رخ کیا تو اس کے سیل پر انجانے نمبر سے کال آئی۔ اشتیاق، نوروز صاحب کا پیغام اسے پہنچا رہا تھا۔

”سر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ شام پانچ بجے تشریف لے آئیے گا۔ وقت کا دھیان رکھیے گا۔ ٹھیک پانچ بجے۔“ شہیر نے ناگواری سے فون بند کر دیا۔

”کل کی کارروائی سے متعلق کال تھی؟“ ساتھی نے سوال کیا۔

”ہاں نوروز صاحب نے شام پانچ بجے ملنے کو بلایا ہے۔“ سیل فون میز پر رکھ کر ہیٹ اتاری۔

”خوش نصیب ہو جو ایسا بندہ انوائیٹ کر رہا ہے۔ انعام و اکرام کی بارش ہوگی تم پر آخر کو تم نے ان کی صاحبزادی کو بچا لیا ہے۔ ورنہ یہ کڈ پیئر تو اپنا کام کرویتے۔“ اس نے تو صوفی نظروں سے دیکھتے کہا۔

”یوں بھی کانشیل جمیل بیان ریکارڈ کرنے جائے گا تم اپنے ساتھ ہی لے جانا۔“ وہی بولے جا رہا تھا۔ جب کہ شہیر اس بلاوے کا پس منظر جانتا چاہ رہا تھا۔

بالآخر وہ اور کانشیل خرم ٹائم پر پہنچ گئے۔ ان کا استقبال اشتیاق نے کیا تھا۔ پر تکلف لاؤنج میں بٹھا کر وہ اندر پیغام دینے چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں نوروز علی خان اور آدرش آگے پیچھے داخل ہوئے اسی سلام دعا کے بعد نوروز علی خان نے ان کی توضیح کا حکم دیا۔

”سر ہمیں بیان ریکارڈ کرنا تھا۔ آپ میڈم کو بلو اوپن پلیز۔“ کانشیل کے اشارہ کرنے پر شہیر اصل مدعے کی طرف آیا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ ہم سیاسی لوگ ہیں اور ہمارا کام قانون کی مدد کرنا ہے۔“ کروفر سے بیٹھے نوروز گویا تھے۔

”ڈیڈ! بیان ریکارڈ کرانے کے بعد شانزے کا نام آئے گا اور کیا وہ دو ٹکے کے کڈ پیئر کے لیے عدالتوں میں گواہی دیتی پھرے گی۔“ آدرش، شہیر کو گھورتے نوروز سے ہم کلام تھا۔

”بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔“ نوروز علی خان کی زیرک نظریں شہیر پہ گڑھی تھیں۔

”لیکن سر! قانونی تقاضے پورے کرنے ہیں۔“ شہیر سفیان ان کھلاڑیوں کے انداز اچھی طرح پہچانتا تھا۔

”تم اپنے طور پر پورے کر لو سارے تقاضے، ہم نے تمہیں شکریہ کہنے کے لیے بلایا تھا۔“ نوروز کے اشارے پر اشتیاق ایک ایک لے آیا۔ اور شہیر کی طرف بڑھتا ہوا نوروز کے اشارے پر۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”یہ تمہارا انعام ہے۔ اس کے علاوہ پلاٹ، بنگلہ جو چاہو مانگ لو سب مل جائے گا۔“ بازو صوفے پر پھیلاتے وہ سگار کا کش لے رہا تھے۔ شہیر کے چہرے پر ناگواری تیزی سے پھیلی تھی جسے اس نے چھپانے کی کوشش بالکل نہیں کی۔

”تھینک یوسر! جو کچھ میں نے کیا وہ میری ڈیوٹی تھی اور مجھے خبر نہ تھی ٹارگٹ آپ کی بیٹی بننے والی ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو میں یہی کرتا۔ دیسے بھی ہم کئی مہینوں سے اس گروپ کی رکنی کر رہے تھے۔“ شہیر نے رسائیت سے انکار کر دیا۔

”یہ تمہاری جرأت و بہادری کا ہی انعام ہے۔ رکھ لو ہمیں خوشی ہوگی۔“ نوروز علی خان کی آنکھیں اسی پر گڑی تھیں۔

”آپ کی خوشی کی خاطر رکھ رہا ہوں۔ لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسے کسی ٹرسٹ کو دے دوں گا تاکہ وہاں کے بے سہارا مجبور لوگوں کی دعائیں آپ کو ملیں۔ چلتے ہیں سر، اللہ حافظ۔“ شہیر اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے سوچی آنکھیں پوری کھول کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ کاسٹیکل بیک لے چکا تھا۔ شہیر لاؤنج سے نکل آیا۔

”اکڑ دیکھی اس کی؟“ آدرش کو اس کا انداز کھل رہا تھا۔
”نیا نیا جوش ہے۔“ وہ مسکرائے۔

☆.....☆

”عروش کی مسکراہٹ کھونے لگی تھی۔ آدرش نے جیسے اسے تنگ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ آتے جاتے اس پر کمنٹ دینا جیسے اس کی عادت بن گئی تھی۔ وہ گوئی، بہری بن جاتی کوئی تاثر نہ دیتی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ صارم سے ذکر کرتی تو وہ غیرت میں جانے کیا کر گزرتا۔ ڈیپارٹمنٹ سے شکایت کرتی تو ایشو بن جاتا۔ وہ کوئی رسک لینا نہیں چاہ رہی تھی۔

”انجبل! آپ نے سر رحمن کا اسائنمنٹ بنا لیا ہے تو پلیز دے دیں۔ میں کاپی کروں گا۔“ آدرش بڑی شرافت سے بات کر رہا تھا۔ عروش کی خاموشی توڑنے کا اچھا حل نکالا تھا۔
”میں نے نہیں بنایا۔“ اسے جھوٹ بولنا نہیں آتا تھا۔ تب ہی زبان لڑکھڑا گئی۔
”تو پھر یہ فائل تمہارے چاچا کی ہے جس کی پچھنی پر بیٹھ کر روز آتی ہو۔“ عروش کی گود سے فائل اٹھا کر لہرانے لگا۔

”اپنی حد میں رہیں۔“ اسے بے ساختہ غصہ آ گیا۔ روز اول سے وہ اس کی بدتمیزی کو نظر انداز کر رہی تھی۔ اس کی خاموشی کو کمزوری جان کر وہ شیر ہو رہا تھا۔

”کیا ہے میری حد؟“ بھنویں اچکا کر وہ اس سے پوچھنے لگا۔
”عوام کے ووٹ سے سیٹ پر بیٹھ کر عوام کو ہی تنگ کرنا آپ لوگوں کا شیوہ ہے شاید۔“ وہ نہ تو اعتماد سے خالی تھی نہ گوئی۔ ایک چپ سو سکھ کے مصداق خاموش تھی مگر اس کا الٹا اثر دیکھ کر اسے اپنا اصل رنگ دکھانا پڑا۔ آدرش لال بھبھوکا ہو گیا۔ کلاس ان کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ وہ اسے جتا رہی تھی کہ وہ ووٹ کی بھیگ مانگنے والے کی اولاد ہے۔

”میرا اور آپ کا کوئی جھگڑا نہ تھا۔ نہ ہے اور نہ ہم دوست ہیں۔ آپ میرا ہی مجھ سے فاصلہ برقرار

رکھیں۔“ اپنی بات مکمل کر کے کلاس لیے بنا وہ کمرے سے نکل گئی۔ غصے اور جذبات میں وہ شاید زیادہ بول گئی تھی جس کا اسے احساس بھی ہوا۔

☆.....☆

شانزے کو احساس ہوا کہ اگر شبیر کو ذرا دیر ہو جاتی تو اس کا نہ جانے کیا ہوتا۔ دو دن ہو گئے تھے۔ شانزے گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ گزشتہ واقعے سے وہ بہت ڈر گئی تھی۔ جس نام پہچان پر اسے فخر تھا جس کا حوالہ سن کر لوگ اس کی تعظیم کرتے تھے وہی اس کی موت کا سبب بھی بن رہا تھا۔ جبیں نے جتنی خود غرضی کا مظاہرہ کیا تھا اس کے بعد اس نے جبیں کو کامیٹ نہیں کیا تھا جس کا احساس جبیں کو بھی تھا۔ تب ہی وہ معافی مانگنے خود چلی آئی تھی۔

”تمہاری غلطی نہیں ہے۔ موت کو سامنے دیکھ کر تمہاری جگہ میں ہوتی تو شاید میں بھی خود غرض ہو جاتی، اس اوکے۔“ جبیں کو اس کے انداز پر خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔

”تم ناراض نہیں ہو؟“ شانزے نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں زندہ ہوں اور اپنے آپ کو انسان بنانا چاہتی ہوں۔“ شانزے بیڈ سے ٹیک لگائے دونوں گھٹنوں پر ٹھوڑی لگائے پر سوچ بیٹھی تھی۔

☆.....☆

”انسان کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے جو آپ کی سوچ، ترجیحات کو بدل دیتا ہے۔ کل جب میں آنکھیں بند کیے مرنے سے پہلے کلمہ پڑھنے لگی تو یقین کرو مجھے کلمہ طیبہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ایک نہیں اس وقت میں نے کئی بار کوشش کی مگر نتیجہ صفر تھا۔ اس لمحے اگر میری موت واقع ہو جاتی تو میں کیا منہ دکھاتی اللہ کو۔“ شانزے پر سوچ انداز میں گویا تھی۔ اس واقعے کے بعد بڑی مثبت تبدیلی آئی تھی اس میں۔

”واقعی ہم ایس پی شبیر کا جتنا شکریہ ادا کریں کم ہے۔“ جبیں اس پل کو یاد کر کے تھرا گئی۔

☆.....☆

حقیقتاً آدرش علی خان تھرا گیا تھا۔ بظاہر معصوم و سادہ نظر آنے والی عروش اتنی بھی سادہ نہیں تھی جتنی نظر آتی تھی۔ اس نے خاموشی کی چادر اوڑھ رکھی تھی اور آج جب بولی تو اسے اس کا اصل چہرہ دکھا گئی۔

”آئے لائیک دس گرل!“ عرصہ بعد کسی نے آدرش علی کان کو حیران کیا ہے۔ وہ مسکرا کر سر ہلانے لگا۔

”یہ تو پتا نہ لگی۔“ اس کے ساتھی میں سے کوئی بولا۔

”دیکھنے میں کتنی سیدھی سادی ہے۔“ دوسرے نے لب کشائی کی۔

”حیرت ہے آدرش تو نے چپ چاپ اس کی بکواس سن لی۔ کیسے سب کے سامنے ذلیل کر گئی۔“ تیسرے نے غیرت دلائی۔

”سچ ہی کہا ہے، ہم عوام کے ووٹ سے ہی سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ اس میں غلط کیا ہے؟“ اس کے نارمل لب و لہجے پر تینوں ہی کو حیرت ہو رہی تھی۔

”تو ٹھیک ہے تا میرے بھائی..... کہیں لوشو کا چکر تو نہیں پال لیا ٹیکھی مرچ سے؟“ مبشر نے قیاس آرائی کی۔ اس کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”ہاں سوچا جاسکتا ہے۔ اچھی تو پہلی نظر میں ہی لگی تھی۔“ انداز پر سوچ تھا۔

”کہاں تو سونے کا چیمبر لے کر پیدا ہونے والا اور کہاں وہ...“ پھر سی جلنے والی مڈل کلاس لڑکی۔“ عزیر نے

”سیاست دانوں کے دل میں غریب عوام کے لیے بہت جگہ ہوتی ہے سنا تھا اب دیکھ بھی لیا۔“ حارث نے مذاق اڑایا۔ وہ پارکنگ سے اپنی بی ایم ڈبلیو نکال رہا تھا۔ تب ہی اس کی نظر قدرے فاصلے پر کھڑی عروش پر پڑی۔ بایک والے بندے کے ساتھ وہ جانے کے لیے بیٹھ رہی تھی۔ بایک والے نے کچھ کہا تھا جس پر وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔ اس کے لب بھنج گئے۔ دوستوں کے سامنے اس نے اپنا بھرم رکھ لیا تھا ورنہ جس طرح عروش نے اس کی بے عزتی کی تھی وہ سلگ رہا تھا۔

☆.....☆

شہیر کو نوروز کا انداز سلگا گیا تھا مگر وہ مضبوط اعصاب رکھتا تھا۔ فاطمہ کو لاؤنج میں دیکھ کر شہیر سفیان ان کی طرف آ گیا۔ کئی دنوں سے دونوں کی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ صبح وہ جلدی چلا جاتا تھا اور رات بھی دیر سے واپسی ہو رہی تھی۔ فاطمہ ہاتھ میں چھری اور دوسرے ہاتھ میں سیب پکڑے پیر کا معائنہ کر رہی تھی۔

”السلام علیکم! کیا حال ہیں؟“ شہیر ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ فاطمہ نے نظر اٹھا کر شہیر کو دیکھا اور مسکرائی۔

”والسلام! بڑے ہنڈسم لگ رہے ہو یونیفارم میں۔“

”یہ کیا ہوا؟“ شہیر کی نظر اس کے پیر سے بہتے خون پر پڑیں تو اس کی آواز تیز ہو گئی۔ ملازم کو آواز دے کر فرسٹ ایڈ باکس منگوا دیا۔

”کچھ نہیں ہوا تم پریشان نہ ہو۔ میں تو سیب کاٹ رہی تھی چھری پتا نہیں کیسے لگ گئی۔“ وہ اس کی پریشانی دیکھ کر سمجھا رہی تھیں۔ ملازم فرسٹ ایڈ باکس لے آیا۔ شہیر زخم صاف کر کے مرہم لگا رہا تھا۔

”درو تو نہیں ہو رہا، کوئی چین کھلاؤں؟“ فکر مندی سے استفسار کر رہا تھا۔ وہ نری سے مسکرائی اور نفی میں سر ہلانے لگی۔

”مجھے تو احساس ہی نہ ہوا زخم کا۔ میں تو حیرانی سے خون کو دیکھ رہی تھی۔“ وہ معصومیت سے گویا تھی۔ شہیر اسے محبت سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کے لیے سیب کاٹوں؟“ ہاتھ دھو کر شہیر سیب اور چھری لے کر اجازت مانگنے لگا۔ باتیں کرتے کرتے کئی قاشیں اس نے خود فاطمہ کے منہ میں ڈالیں وہ باتیں کرتی کھا رہی تھی۔ مہما بھی چلی آئیں اور شامل گفتگو ہو گئیں۔ شہیر کے میل فون پر کال آئی تو وہ اٹھ کر سائیڈ پر ہو گیا۔ ”السلام علیکم!“ انجانا نمبر تھا۔

”والسلام! شہیر سفیان بات کر رہے ہیں؟“ نسوانی آواز پر شہیر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ فاطمہ اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔ مہما نے بھی کچن کا رخ کیا تھا۔

”جی بات کر رہا ہوں، آپ کون؟“ اس نے اپنے کمرے کی طرف جانے والے زینے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”میں شانزے نوروز علی خان بات کر رہی ہوں۔“ شہیر کے قدم بے ساختہ ٹھٹھک گئے تھے۔ وہ شانزے کی کال ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا۔

”فرمائیے کیسے فون کیا؟“ اپنے کمرے میں داخل ہو کر سلائیڈ کھول کر بالکونی میں آکھڑا ہوا۔

”جی میں آپ کو پہلی ٹیکسٹ کرنا چاہ رہی تھی اس لیے کال کی۔“ شانزے نے جھجکتے ہوئے بول رہی تھی۔

”اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“ شہیر نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”آپ کے لیے نہ ہو مگر میرے لیے ہے۔ آپ کا احسان ہے میری زندگی پر.....“ شانزے اپنی بولے جا رہی تھی۔

”غالباً آپ کا اس بات پر عقیدہ نہیں ہے کہ موت کا دن متعین ہے۔ آپ کی موت اس دن کا سبب تقدیر نے نہیں لکھی تھی سو آپ بہ حیات ہیں اگر لکھی ہوتی تو میں کیا کوئی بھی آپ کو پروٹیکٹ نہیں کر سکتا تھا۔“ شہیر سفیان کی گھمبیر آواز شانزے کو سماعت کے رستے دل میں داخل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ پر سناٹائی کی طرح اس کی باتیں، آواز بھی بحر انگیز تھیں۔

”بے شک آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن میں آپ کو اپنا محسن مانتی رہوں گی ساری زندگی۔“
 ”مرضی ہے آپ کی۔ اوکے۔“ وہ کسی قدر چڑ گیا تھا۔ شانزے علی خان نے اسے کال کی تھی کوئی عام بات نہ تھی۔ وہ اس سر پھری اور اس کی فیملی سے واقف ہو چکا تھا۔ بات مکمل کر کے اس نے کال کا ٹاچا ہی تب ہی شانزے جلدی سے بول پڑی۔

”ایک اور بات کہنی تھی۔“
 ”کہیے۔“ احسان کرنے والے لہجے میں کہا۔ وہ جلد سے جلد بات ختم کرنا چاہ رہا تھا۔
 ”سوری.....! پہلی ملاقات کے لیے۔“ شانزے نے جھجکتے ہوئے کہا۔
 ”میں نے پولیس فورس کے بارے میں کچھ زیادہ غلط جملے کہے تھے۔“

”یہ راتوں رات پولیس فورس سے محبت اور اس کے لیے عزت کہاں سے آگئی آپ کے لہجے میں؟“ شہیر نے طنز یہ کہا۔ شانزے کسی قدر چھٹکی پڑ گئی۔
 ”اپنی دے اللہ حافظ۔“ شہیر نے کال کاٹ دی۔ بالکونی میں کھڑا آتی جاتی گاریوں پر نظریں جمائے وہ شانزے کی حرکت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆.....☆

پورا راستہ وہ آدرش علی خان کو سوچتی آئی تھی۔ وہ بہت ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ صارم عباس سارا وقت اس کی پریشانی پوچھتا رہا۔

”بی بی لو ہو گیا ہے۔“ بار بار پوچھنے پر اسے جھوٹ بولنا پڑا۔
 ”خیال رکھا کرو اپنا، چھوٹی موٹی سی ہو اور اتنی شدید گری ہے۔ آؤ پہلے کچھ پی لو کہیں بے ہوش ہی نہ ہو جاؤ۔“ صارم نے جوں کیفے پر پائیک روکی۔

”نہیں صارم! دیر ہو جائے گی۔ آپ چلیں۔“ وہ جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہ رہی تھی۔ بی ایم ڈبلیو میں بیٹھا آدرش علی خان جس طرح اسے گھور رہا تھا اس سے اس کی ہڈی میں سنساہٹ ہو رہی تھی۔
 ”پانچ منٹ لگیں گے اتر دو اور تم کسی لوفر، اٹھائی گیر کے ساتھ نہیں اپنے کزن اور منگیتر کے ساتھ ہو، چھپ کر نہیں مل رہے ہم۔“ صارم کے اصرار پر ٹاچا اسے اترنا پڑا۔ ٹاٹاں کرنے پر بھی صارم نے سینڈ ویج اور جوس منگو لیا۔

”عروش تم ڈرکس سے رہی ہو یا ر! میں ممائی کو بتا دوں گا ہم کیفے گئے تھے۔ میرے ساتھ بیٹھنا برا لگ رہا ہے؟“ وہ بار بار در در کو نظر دوڑا رہی تھی۔ دوپٹہ سختی سے لپٹ رہی تھی جس پر اسے بولنا پڑا۔

”صارم! آپ میرے لیے کیا ہیں یہ میں جانتی ہوں یا آپ۔ یہ اجنبی لوگ نہیں جانتے ان کی نظریں تو یہ کہہ رہی ہیں کہ لڑکی ڈیٹ پر آئی ہے اور مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا۔“ اس نے اپنی پریشانی بتائی۔ صارم کو بھی احساس ہوا اس سے پہلے وہ یوں پبلک پلس پر نہیں بیٹھے تھے۔

”سوری لیکن تمہاری طبیعت کی وجہ سے۔“ صارم اس گھڑی خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔

”مجھے خود سے زیادہ آپ پر بھروسہ ہے۔ آپ کو میری کتنی فکر ہے مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ آپ صفائی نہ دیں۔ آپ کی نیت سے بھی واقف ہوں۔ بس لوگوں کی نظریں بری لگ رہی ہیں۔“ اس نے مان بھٹسا۔

”اوکے جوس ختم کرو اور چلو۔“ ویٹر کو اشارے سے بلایا۔ وہ بڑی مسکراتی نظروں سے دونوں کو دیکھتے بل دے رہا تھا۔ صارم کے ماتھے پر بل پڑنے لگے۔ جس پر ویٹر کچھ سنجیدہ ہو گیا۔ اسے عروش کی بات سے انکار نہ تھا۔ ان کے رشتے کتنے پاکیزہ ہیں یہ وہ جانتے تھے دنیا والے نہیں۔

☆.....☆

شانزے جان گئی تھی کہ اس کے دل میں شہیر کے لیے کیا ہے۔ کال کٹ چکی تھی۔ شانزے حیرانی سے سیل فون کو دیکھ رہی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو وہ اسے دوبارہ کال کر کے گالیاں تو ضرور دیتی مگر دوسری طرف شہیر سفیان تھا جس کے لیے شانزے سوچنے لگی تھی۔

”چلو شہیر سفیان دیکھتی ہوں کہاں تک بھاگ سکتے ہو۔“ شانزے مسکراتے ہوئے اس کے تصور سے ہم کلام تھی۔ پھر تو جیسے شانزے نے اس کا پیچھا لے لیا۔ صبح گڈ مارنگ سے لے کر گڈ نائٹ تک کے ایس ایم ایس کرتی۔ شہیر نظر انداز کرتا رہا کہ تنگ آکر وہ خود تھک جائے گی مگر وہ مستقل مزاجی سے ڈلی ہوئی تھی۔ وہ سینئر کے ساتھ ایک آپریشن میں تھا جب مستقل اس کے سیل فون کی ٹون بجنے لگی۔

”سوری سر۔“ سینئر کے گھورنے پر اس نے سیل آف کر دیا۔ آپریشن کامیاب رہا تھا۔ بھتہ خور گرفتار ہو گئے تھے۔ معمول کی کارروائی کے بعد وہ گھر آیا۔ سیل آن کیا تو ان گنت ایس ایم ایس آئے ہوئے تھے۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ لمبی سانس لیتے اس نے کال کی۔ شانزے لیٹ کر لی وی دیکھ رہی تھی۔ سیل بجنے پر اٹھا کر دیکھا۔ شہیر سفیان کے چمکتے نام پر وہ اٹھ بیٹھی۔

”ہیلو۔“ اس نے کال ریسیو کی۔

”مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ کیوں مسلسل ایس ایم ایس کرتی رہتی ہیں۔ نہ میں آپ کی طرح فارغ ہوں نہ دماغ سے پیدل جو آپ کے پیچھے نفی ایس ایم ایس پر بیٹھا ہوتا رہوں۔ اب آپ کا کوئی ایس ایم ایس نہیں آنا چاہیے۔ ڈیلیٹ کر دیں میرا نمبر۔“ اپنی سنا کر بنا اس کی سنے شہیر نے کال کاٹ دی۔ شانزے ہونٹ سیکوڑ کے رہ گئی۔

”ہلا کو خان ہے بنائے کال کاٹ دیتا ہے۔ فیلنگز ہی نہیں ہیں کوئی۔“ شانزے نے منہ بناتے ایس ایم ایس کیا۔

”سوری! اگر آپ میری وجہ سے ڈسٹرب ہوئے آپ اہم ڈیوٹی پر ہوتے ہیں اور میں آپ کے کام میں خلل ڈالتی ہوں۔ میں آئندہ آپ کو ایس ایم ایس نہیں کروں گی۔“

ٹون پر شہیر نے سیل اٹھا کر دیکھا۔ یہ بتانے کے لیے بھی اس نے ایس ایم ایس ہی کیا تھا۔ نفی میں سر ہلاتے اس نے لمبی سانس لی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ انجسٹ 50 دسمبر 2016ء

صبح اٹھنے کے بعد معمول کی طرح پہلے سیل فون چیک کیا۔ آج کوئی ایس ایم ایس مسڈ کال نہیں تھا۔ وہ تیار ہونے لگا۔ ناشتے کی میز پر سب بیٹھے تھے ”السلام علیکم“ سب کو ساتھ دیکھ کر خوش گواریت کا احساس ہوا۔
 ”علیکم السلام! کہاں ہوتے ہو جوان، تمہاری تو شکل ہی نظر نہیں آتی۔“ ڈیڈا سے دیکھ کر جیسے توانا ہو گئے۔
 یونیفارم میں تک سبک سے تیار وہ بہت ہنڈسم لگ رہا تھا۔

”فرض جانفشانی سے ادا کرنے کی سستی کر رہا ہوں۔ آپ سنائیں کیسی چل رہی ہے۔ جم جا رہے ہیں؟“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ماما اس کے سامنے ناشتا رکھنے لگیں۔ اکیلے دل نہیں لگتا تم آ جاؤ جلدی تو پھر چلیں گے ساتھ۔“ ڈیڈا اور شہیر بہت اچھے دوست تھے۔

”شفٹ چینیج ہو تو پھر چلیں گے ساتھ۔“ باؤل میں کارن فلیکس ڈال کر اس نے تھر ماس سے دودھ اٹھایا۔
 ”بجو کو بھی جگادیتیں۔“ شہیر نے ماما سے کہا۔

”رات دیر تک میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی تھی۔ میں گئی تھی اٹھانے، اس نے کہا دیر سے اٹھے گی۔ اچھا ہے نیند پوری ہو جائے گی۔“ ماما کی اطلاع پر سر ہلانے لگا۔

”آفس جائیں گی آپ؟“ ماما ویڈنگ پلانر تھیں۔ شادی پارٹیز آرگنائز کرتی تھیں۔
 ”ہاں لیکن بارہ بجے تک جاؤں گی۔ ارے شہیر یاد آیا ایک صاحب ہیں نام یاد نہیں آ رہا انہوں نے تمہیں مسیج دینے کے لیے کہا تھا ان کی بیٹی کی شادی ہے۔ وہ پرستکی کچھ پولیس کے بندے تعینات کروانا چاہ رہے تھے شادی میں۔“ ماما کو یاد آیا تو انہوں نے پیغام دیا۔

”خیریت شادی میں؟“ تحیر کا اظہار کیا۔
 ”ان کی بیٹی میں کوئی لوفرائنڈ ہے۔ جب کہ لڑکی بہت پاک باز ہے۔ اب اس کی کہیں اور شادی ہو رہی ہے تو لڑکے نے دھمکی دی ہے کہ شادی نہیں ہونے دے گا۔ ہنگامہ کرے گا وغیرہ وغیرہ۔“

”اوکے! آپ ان کی شادی بھی پلان کر رہی ہیں؟“ سر ہلا کر اس نے سوال کیا۔
 ”نہیں بے چارے مڈل کلاس سے ہیں۔ کسی کے ریلیفنس سے مجھ تک پیغام پہنچایا۔“
 ”ماما نے کلیئر کیا۔“

”اوکے ہو جائے گا۔ آپ اب سیٹ نہ ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اس معاشرے میں لڑکی کے والدین کو کتنی مشکلات اٹھانا پڑتی ہیں۔ یہ سوچ کر ماما اب سیٹ ہو گئیں۔

☆.....☆

گھر آ کر بھی وہ اب سیٹ تھی۔ اسے اپنی مالی حیثیت اور اوقات کا اندازہ تھا۔ آدرش علی خان جیسے لوگوں سے دوستی یا دشمنی کے متعلق وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ٹیوشن کے لیے آئے بچوں کو غائب دماغی سے پڑھا رہی تھی۔ شکیلہ اس کے پر سوچ چہرے کی طرف بار بار دیکھ رہی تھیں۔ استفسار پر اس نے وہی بہانہ دہرایا جو صارف سے کیا تھا۔

”آج حنا آیا آئی تھیں۔“
 ”اچھا! چلی کیوں گئیں مجھ سے ملی بھی نہیں۔“ اس نے گلہ کیا۔

”جلدی بھی آیا کو، کسی کی عبادت کو جانا تھا تم ہی ہو آنا دہ بھی کہہ رہی تھیں بہت دن ہو گئے تمہیں دیکھے۔“
 شکیلہ بتا رہی تھیں۔ حنا کی محبت یاد کر کے وہ مسکرا دی۔

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

”کل چلیں گے امی، پھپھو کی طرف۔“ اس نے پلان بتایا۔ یونیورسٹی کی وجہ سے وہ بڑی ہو گئی تھی۔ کہیں آنے جانے کا ٹائم نہیں ملتا تھا۔

”یونیورسٹی نہیں جاؤ گی کل؟“ استفسار پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”موڈ نہیں ہے۔“ خود کو لا پرواہا ہر کر کے شکلیہ کو بہلایا اور بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ شکلیہ سلائی چھوڑ کر دروازہ کھولنے لگیں۔ شکلیہ کی تیز آوازیں اس تک آئیں تو دھڑکتے دل سے وہ بھی بھاگی بھاگی دروازے تک گئی۔

”خالہ! ریان۔“ دونوں کو دیکھ کر ایک چیخ ماری۔ ثانیہ اس کی اکلوتی خالہ تھیں۔ اسلام آباد میں ثانی اور نانو کے ساتھ رہتی تھیں۔ شادی کے دو سال بعد ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ ریان ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ شکلیہ محبت سے مل رہی تھیں۔ ریان شکلیہ سے چپکا ہوا تھا۔

”اندرو تو آئیں۔“ عروش کو ہی خیال آیا کہ وہ گیٹ پر ہی کھڑے ہیں۔
 ”بچوں آج چھٹی کرو، باقی پڑھائی کل ہوگی۔“ عروش نے بچوں سے کہا تو وہ خوشی کا اظہار کرتے چلے گئے۔ وہ گیٹ بند کر کے آئی تو ریان صحن اور پورے گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔
 ”کیا دیکھ رہے ہو چھوٹو؟“ اس نے محبت سے ریان کے بال بکھیر دیئے۔
 ”چھوٹو نہیں ہوں میں، اگلے ماہ پورے پندرہ سال کا ہو جاؤں گا۔“ اس نے پھولے ہوئے منہ سے کہا۔
 وہ اس عمر میں تھا جس میں چھوٹے کا لفظ برا لگتا ہے۔

”او..... واقعی آپ تو مجھ سے بھی بڑے ہو گئے ہو، دیکھو۔“ عروش نے کھڑے ہو کر اس کے ساتھ قد ناپا۔
 وہ اس سے بڑا تھا قد میں۔ وہ خوش ہو گیا۔
 ”پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“ عروش کچن میں آگئی تاکہ ان کے لیے شربت بنا سکے۔
 ”بہت اچھی، آپ دعا کیجیے گا کہ میں اچھے نمبرز سے اولیول پاس کر لوں۔“ وہ معصومیت سے بول رہا تھا۔
 عروش کو اس پر بہت پیار آیا۔

”کیوں نہیں جانو تم بہت اچھے نمبرز سے پاس ہو گے۔ میں بہت دعا کرتی ہوں اپنے سو میٹ ہارٹ کے لیے۔“ شربت کا گلاس اسے تھمایا اور ثانیہ کے لیے کمرے کی طرف گئی جہاں وہ شکلیہ سے باتیں کر رہی تھیں۔
 ”بہت شکریہ بیٹا۔“ ثانیہ نے اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔

”آپ نے اچانک آکر سر پرانز دیا خالہ، بہت یاد آ رہی تھی آپ کی اور اس موٹو کی۔“ عروش نے ثانیہ کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔

”صدف کی شادی اٹینڈ کرنے کا تو بہانہ ہے۔ اصل میں تو تم لوگوں سے ملے دن ہو گئے تھے اس لیے چلی آئی۔ ریان کی بھی چٹھیاں تھیں۔“ ثانیہ نے بھی لگاوٹ کا اظہار کیا۔

”یہ گھر بہت چھوٹا ہے۔ آپ لوگ ہمارے ساتھ چل کر رہیں نا۔“ ریان نے شکلیہ سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔
 ”جہاں آپ رہتے ہو وہ آپ کا گھر ہے اور یہ ہمارا گھر ہے۔ کوئی اپنا گھر کیسے چھوڑتا ہے بیٹا۔“ شکلیہ نے سمجھایا۔ عروش ان کے لیے اسٹیشنل ڈشز بنانے میں لگ گئی۔ حیات صاحب بھی ثانیہ اور ریان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ پر تکلف کھانا کھانے کے بعد سب کافی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شکلیہ ماں باپ کو یاد کرنے لگیں تو ثانیہ نے اپنے جیل نون سے ان کی بات کرنا دئی۔ وہ بات کر کے ملنے کے لیے بے گل ہو

گئیں۔ عروش خوش تھی۔ اتنے دنوں کی اعصاب شکن کے بعد یہ خوشی اسے بہت بڑی لگ رہی تھی۔

☆.....☆

وہ ناخوش تھی۔ شانزے نے سخت بے کلی کے عالم میں رات گزاری تھی۔ شہیر کی وارننگ کے بعد وہ سنجیدگی سے اس کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اگلے دن بھی وہ خود کو ٹٹولتی رہی۔ بار بار سیل فون ہاتھ میں لیتی اور اس کے نمبر پر لا کر چھوڑ دیتی۔

”نہیں وہ برامان جائے گا۔“ اگلے دو دن وہ اسی عمل کو دہراتی رہی۔ اسے کسی کل چین نہیں آرہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کوئی اہم چیز اس سے چھین گئی ہے۔ وہ اپنی میلنگو سے پریشان ہو گئی تھی۔

”کیا ہے کون سا وہ کسی ایس ایم ایس پر رسپانس دیتا تھا۔“ خود کو باور کراتے جانے کس جذبے کے تحت اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ پھر تو ایک سلسلہ چل نکلا۔ اپنی ناقدری پر وہ ضدی بچے کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رو رہی تھی جیسے اس کا من پسند کھلونا کھو گیا ہو۔ آنسو صاف کر کے اس نے سیل فون اٹھایا اور شہیر کا نمبر ڈائل کیا۔ کال ریسپونڈ نہیں ہوئی پھر تو اس پر ایک جنون طاری ہو گیا۔ وہ مسلسل کال کرنے لگی۔

شہیر واش روم سے آیا تو گیارہ کاڑو کچھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے نام چیک کیا۔

”شانزے۔“ نظریں اسکرین پر جمائے لب دانتوں تلے دبائے وہ حیران تھا۔ دو دن سے اس کا کوئی ایس ایم ایس نہیں آیا تھا۔ وہ پرسکون تھا کہ عقل آگئی لیکن اب..... اسی لمحے کال پھر آنے لگی۔ اس نے ریسپونڈ کی۔

”جی۔“

”مسٹر شہیر سفیان اگر کوئی کال کر رہا ہو تو کال ریسپونڈ کرتے ہیں، یوں منہ نہیں چھپاتے۔“ شانزے کا لہجہ بہت تیز تھا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں۔“

”لیکن مجھے آپ کا جواب سننا ہے، میں دو دن سے آپ کی بات مان کر آپ کو ڈسٹرب نہیں کر رہی ہوں لیکن آپ سے اتنا نہ ہوا کہ آپ پلٹ کر پوچھ لیں کہ شانزے زندہ ہو یا مر گئی؟ نہیں آپ کو تو اپنی اکڑی گردن پر گھمنڈ ہے نا..... آپ کو کیا فرق پڑا ہوگا۔ بے وقوف تو میں ہوں جو دو دن سے دنیا تیاگ بیٹھی ہوں۔ یوں جیسے مجھ سے میرا ناٹھ چھین گیا ہو۔ جب سے آپ ملے ہیں زندگی گزارنا مشکل ہو گئی ہے۔ کیوں آئے تھے آپ میری نظروں کے سامنے؟ اور آئے بھی تھے تو کیا ضروری تھا کہ میں آپ کی محبت میں گرفتار ہو جاتی؟ مسٹر شہیر سفیان مجھے جنون ہو گیا ہے آپ کا۔ اگر آپ مجھے نہ ملے تو جانے میں کیا کر گزاروں۔ مجھے شہیر سفیان چاہیے، ہر وقت ہر گھڑی، میں آپ کو سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ شانزے عالم جنون میں بولے جا رہی تھی۔

شہیر شا کڈ بیٹھا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا کچھ سننے کو ملے گا۔ شانزے بھی شاید سب کچھ کہہ چکی تھی۔ جنون کی داستان سنا کر اس نے فون بند کر دیا۔ شہیر یک تک فون کو دیکھے جا رہا تھا۔ یہ سر پھری لڑکی کیا کچھ کہہ گئی تھی۔ بلا کا پرسکون شہیر سفیان کے وجود کے اندر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ سخت مضطرب تھا۔

☆.....☆

وہ سخت مضطرب تھی۔ یونیورسٹی جانا، آدرش علی خان کی فضول گوئی کو برداشت کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ صبح صا رہ اسے پک کرنے آیا تو اس نے خالہ اور ریان کی آمد کا بتا کر چھٹی کر لی۔ گزشتہ واقعے کی وجہ سے اس کا موڈ بھی نہیں تھا اور ان کی آمد نے موقع بھی فراہم کیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رواڈ انجسٹ 53 دسمبر 2016ء

”میں بھی نہیں جا رہا۔ یونیورسٹی، خالہ سوری، ہیں یا جاگ رہی ہیں؟“ صارم سلام کرنے کے خیال سے پوچھنے لگا۔

”سوری ہیں۔“ ٹھیک ہے پھر میں شام کو ای کو ساتھ لے آؤں گا تب مل لوں گا۔“ وہ دروازے سے ہی پلٹ گیا۔

شام کو حنا صارم کے ساتھ آگئیں تو گھر میں رونق ہو گئی۔

”ادھر آ کے پاس بیٹھو، کتنے دنوں بعد دیکھ رہی ہوں صورت تمہاری۔“ اس پر جان دیتیں تھیں۔ اب بھی اسے ساتھ لگائے بیٹھی تھیں۔

”بڑی محبت جتا رہی ہو ہونے والی بہو سے۔“ ثانیہ نے چھیڑا۔

”محبت..... جگر کا ٹکڑا ہے یہ۔ میں اور حیات بہت چھوٹے تھے جب ماں کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ والد نے سوتیلی ماں کو ہم پر مسلط نہ کیا۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ میں وقت سے زیادہ سمجھ دار ہو گئی تھی۔ حیات میں میری جان انکی رہتی تھی۔ شادی کے بعد بھی میں حیات کے لیے فکر مند رہا کرتی تھی۔ پھر شکیلہ نے میرے بھائی کی زندگی میں رنگ بھرے۔ حیات کے ناتے اس سے جڑا ہر رشتہ مجھے بے حد عزیز ہے۔“ حنا نے اسے مزید قریب کیا۔ سب ہی ان کی محبت کے گواہ تھے۔ شکیلہ اور ان کی آج تک تلخ کلائی تک نہ ہوئی تھی۔

”کب اتار رہی ہو یہ چاند اپنے آئین میں؟“ ثانیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ صارم ریان کے ساتھ باتوں میں لگا ہوا تھا مگر اس کی توجہ ان کی گفتگو کی طرف تھی۔ اسی وقت عروش نے نظریں اٹھائی تھیں۔ صارم اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً نظریں پھر لیں۔ وہ مسکرا دیا۔

”انشاء اللہ بہت جلد، چند ماہ میں صارم کا ایم فل مکمل ہو جائے گا۔ خیر سے لیکچرار لگ جائے، سیٹ ہو جائے تو میں جلد ہی لے جاؤں گی اپنی بہو کو۔ اکیلے رہ کر بور ہو گئی ہوں۔“ حنا نے تفصیل سے کہا۔

حنا، ثانیہ، شکیلہ تینوں میں بہت اچھی دوستی تھی۔ ثانیہ اپنی چھوٹی منہ صدف کی شادی اٹینڈ کرنے آئی تھیں۔ گوکہ ان کی شادی صرف دو سال رہی تھی۔ ذیشان کی حادثاتی موت کے بعد سسرالی چاہتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ رہیں مگر بوڑھے ماں، باپ کا احساس کر کے ثانیہ نے معذرت کر لی۔ یوں بھی جس شخص کی نسبت سے وہ اس گھر میں رہن بن کر آئی تھیں جب وہ ہی نہ رہا تو وہ کس نسبت سے رہیں۔ والدین، شکیلہ سب نے چاہا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لیں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اتنے سالوں بعد بھی سسرالیوں سے رابطے میں تھیں۔ ملنا جلنا ہوتا رہتا تھا۔ ابھی بھی وہ بطور خاص منہ صدف کی شادی اٹینڈ کرنے آئی تھیں۔

ثانیہ ہر عمل یہ سوچ کر کرتی تھیں کہ سسرالیوں کو ذیشان کی کمی محسوس نہ ہو۔ ثانیہ کے اصرار پر عروش بھی بارہا اٹینڈ کرنے گئی تھی۔ ثانیہ کی ساس انہیں گلے لگائے ذیشان کو یاد کر کے رو رہی تھیں۔ وہ ثانیہ کی آمد پر بہت خوش تھیں۔ قریب اچھی رہی تھی۔ ثانیہ کے صبر اور شادی نہ کرنے پر سسرالی آج بھی انہیں ذیشان کی بیوہ ہونے کے ناتے عزت دے رہے تھے۔ دو سالہ رفاقت کے صدقے انہوں نے پوری جوانی کاٹ دی تھی۔ عروش بے خودی نہیں دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆

بے خودی کے عالم میں وہ سب کے شہیر کو کہہ چکی تھی۔ رات بھر اس نے فون کو تکتے گزار دی کہ شاید وہ کمال

دراوا جیسٹ 34 ستمبر 2016ء

کرے۔ اس کی محبت کو تسلیم کرے، بھٹلے برا بھلا کہنے کے لیے کال کرے مگر ایسا کچھ نہ ہوا، کئی دنوں کی بے آراہی نے اسے بخار میں مبتلا کر دیا۔
نوکروں کی دوڑیں لگ رہی تھیں مگر وہ نہ کچھ کھا رہی تھی نہ دوا لے رہی تھی۔ شائستہ بیگم نے نوروز اور آدرش تک اس کی حالت کی خبر پہنچا دی تھی۔

نوروز اس کے کمرے میں موجود تھے۔ اس وقت وہ جاہ و جلال اور کروڑوں روپے سے الگ باپ کے روپے میں تھے۔ انہوں نے بہت منایا مگر شانزے بھی انہی کا خون نہیں۔ اس نے انکار کر دیا۔
”جب تک میری خواہش پوری نہیں ہوگی میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔“ فیصلہ اٹل تھا۔
”اور کیا خواہش ہے میری گڑیا کی؟“ نوروز اس کا ہاتھ تھامے بیٹھے تھے۔ ذرا فاصلے پر آدرش بھی موجود تھا۔
”تم حکم تو کرو، سب تمہارے قدموں تلے لے آؤں گا۔“ آدرش نے جانتا چاہا۔ بلاشبہ وہ بہن کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔

”مجھے شہیر سفیان چاہیے۔“ اس نے جیسے بم پھوڑا تھا۔ شائستہ بیگم منہ پر ہاتھ رکھے حیرانی سے بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔
”شہیر سفیان..... وہ ایس پی.....؟“ آدرش کی تیز آواز گونجی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ نوروز اس کے چہرے پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔

”زندہ یا مردہ؟“ آدرش کے استفسار پر شانزے جھٹکے سے اٹھی۔
”نہیں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے اب کے میزائل دے مارا تھا۔ آدرش اور باقی سب کو سانپ سونگھ گیا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟ کیسے خواب دکھائے ہیں اس نے تمہیں۔ اسے تو میں زندہ گاڑ دوں گا۔“ آدرش غصے سے پاگل ہونے لگا۔

”خبردار! جو آپ نے اسے کچھ کہا۔ وہ تو مجھ سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا۔ ڈانٹ کر جان چھڑا لیتا ہے۔ مجھے اس سے شادی کرنی ہے اگر آپ نے اسے نقصان پہنچایا تو یاد رکھیے گا بھائی جس بہن سے آپ کو محبت ہے وہ بھی نہ رہے گی اور آپ جانتے ہیں میں جھوٹ نہیں بولتی۔ آپ کی طرح زبان کی پکی ہوں۔“
شانزے نے اچھی طرح اپنے عزائم بتا دیئے تھے۔

”ڈیڈ آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟“ آدرش نے نوروز کی خاموشی پر سوال کیا۔ شانزے نے جو کچھ کہا تھا اس کے بعد اس کا جی چاہا شہیر سفیان کے جسم میں پوری پستل خالی کر دے۔
”ہماری بیٹی کی پسند اتنی بری بھی نہیں مجھے بھی اچھا لگا تھا بندہ، سوچا جا سکتا ہے۔“ نوروز کے جواب پر آدرش جل بھن گیا۔

”ڈیڈ.....!“

”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ہوش میں رہ کر کہہ رہا ہوں۔ پر جوش جوان ہے اور ہمارا داماد بن گیا تو پولیس فورس ہمارے لیے مزید کارآمد ہو جائے گی۔ معمولی پوسٹ سے اسے کہاں پہنچانا ہے یہ ہمارا کام ہے تم چپ رہو ابھی تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔“ نوروز یقیناً اپنے عزائم کے لیے شہیر کو داماد بنا کر استہمال کر سکتے تھے۔ وہ بہت دور کی سوچ رہے تھے۔

”کھانا اور دوا نام پر کھاؤ، سمجھو تمہیں شہیر مل گیا۔“ شانزے کو گلے لگاتے وہ گویا تھے۔ شانزے خوش ہو گئی۔

☆.....☆

عروش خوش خوش ثانیہ کے ساتھ شاپنگ پر آگئی تھی۔ گزشتہ رات صدف کی ویسے کی تقریب انینڈ کر کے ثانیہ واپس جانے کے لیے تیار تھیں۔ ثانیہ والدین کے لیے شاپنگ کرنا چاہ رہی تھیں۔ شکلیہ بھی سب کے لیے تحائف بھیجنا چاہ رہی تھیں۔ سودوںوں مہنگے مال میں موجود تھیں۔ ثانیہ اپنے لیے کاسمیٹکس دیکھ رہی تھیں۔ عروش مردوں کے سیکشن میں ریان کے لیے کپڑے پسند کر رہی تھی تاکہ اسے گفٹ کر سکے۔

”ہیلو آنجل!“ اس کے کان کے قریب کوئی بولا تھا۔ وہ اچھل پڑی۔ آدرش علی خان اس کے بہت پاس کھڑا تھا۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ؟“ ناگواری کا اظہار کرتی وہ دور ہوئی۔ سیڑ میں ان کی طرف متوجہ تھے۔

”کہاں غائب ہو یونیورسٹی نہیں آرہیں؟“ وہ یوں لگاوٹ سے پوچھ رہا تھا جیسے ان کے درمیان بہت اچھے تعلقات ہوں۔

”راستہ ویں۔“ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر وہ یہاں سے ہٹنا چاہ رہی تھی۔ وہ راستہ رو کے سامنے کھڑا تھا۔

”ہم نے آپ کو دل وے دیا آپ راستہ مانگ رہی ہیں۔ میں ہٹنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا ہوں۔“ وہ اسے زچ کر رہا تھا۔ اس کی فضول گوئی پر اس کا خون کھول اٹھا۔

”میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا مجھے تنگ نہ کریں۔“ مارے غصے کے برا حال تھا۔ سب ان کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔

”تم پر آدرش علی خان کی نظر پڑ گئی ہے اور جس شے پر میری نظر پڑ جائے وہ میری ہو جاتی ہے۔“ آدرش نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ عروش نے جھٹکے سے کلائی چھڑائی۔

”یہ بے غیرت شخص مجھے تنگ کر رہا ہے۔ بجائے اسے برا بھلا کہنے کے آپ سب تماشا دیکھ رہے ہیں۔“ متوجہ ہونے والے لوگوں پر طائرانہ نگاہ ڈال کر چیخ کر بولی۔

”عرشی کیا ہوا؟“ ثانیہ بھی آگئیں۔

”کچھ نہیں پھپھو! کچھ لوگ ہر چیز کو اپنی باپ کی جاگیر سمجھنے لگتے ہیں۔ چیونٹی جتنی اوقات والے اپنی اصلیت بھول جاتے ہیں چلیں۔“ اس سے پہلے کہ ثانیہ آدرش کو دیکھتیں یا اس کے متعلق جانتیں ان کا ہاتھ پکڑ کر وہ بھیڑ کو چیر کر نکل گئی۔

”سر پلیز! آپ سب ہمارے کنزیومر ہیں۔ سب کی رسپکٹ ہم پر فرض ہے۔ آپ کیا کر رہے تھے؟“ مال کا انچارج بھی آچکا تھا۔ آدرش علی خان کا ہاتھ اٹھا تھا اور انچارج کی زبان چہرے کے ساتھ گھوم گئی تھی۔

”اپنی اوقات میں رہ کر بات کر، جاننا نہیں کہ میں کون ہوں؟“ آدرش کی پھنکار پر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اس کے رویوں روئیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ عروش نے ایک بار پھر اس کی انا کوٹھیں پہنچایا تھا۔ مال میں سرسراہٹ دوڑ گئی۔ آدرش علی خان مال سے نکل گیا اسلحہ بردار گارڈز اس کی گاڑی میں منتظر تھے۔

☆.....☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

رواڈ انجسٹ 56 دسمبر 2016ء

مما اس کی منتظر تھیں۔ انہیں شہیر کے ساتھ کہیں جانا تھا جس کی وجہ سے وہ جلد آف کر کے آیا تھا۔ وہ راستے میں ہی تھا جب اشتیاق کی کال موصول ہوئی کہ نوروز صاحب اس کے گھر آ رہے ہیں۔ وہ اس پیغام کا مقصد سوچ رہا تھا۔ ذہن میں شانزے کی کئی باتیں بھی چلنے لگی تھیں۔ وہ ماما کو ان کی آمد سے متعلق بتانا چاہتا تھا مگر اسے موقع ہی نہ ملا۔

گاڑیوں کے سائرن بجاتے شور نے جلد ہی اس کے دروازے پر دستک دی۔ نوروز علی خان پورے کروڑوں سے لاؤنج میں موجود تھے۔ ڈیڈ ابھی وہیں موجود تھے۔ شہیر کو دیکھ کر انہوں نے گرم جوشی سے گلے لگایا تھا۔ افراتفری محسوس کر کے ماما بھی چلی آئی تھیں۔ دو تین گارڈز فاصلے پر کھڑے تھے۔ ملازم فروٹس، مٹھائی، ڈرائی فروٹس کے ٹوکے اندر رکھ رہے تھے۔

”میں نوروز علی خان ہوں۔“ تعارف کرانے پر ڈیڈ اور ماما کو سمجھ آ گئی کہ شکل جانی پہچانی کیوں لگ رہی تھی۔ ٹی وی کے ٹاک شوز میں اکثر نظر آتے رہتے تھے۔ اب تو ان کا بیٹا بھی سیاست میں قدم رکھنے والا تھا۔ اک معروف سیاسی بندہ ان کے گھر آیا تھا۔ خدا خیر کرے کہ مصداق ماما شہیر کو فکر مندی سے دیکھ رہی تھیں کہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

”آپ لوگ اتنے حیران کیوں ہیں بیٹھیں نا۔“ نوروز انہیں بے تکلف کرنا چاہ رہے تھے۔ جیسے وہ مہمان نہیں میزبان ہوں۔

”ان کا تعارف؟“ نوروز شہیر کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
 ”یہ میرے ڈیڈ ہیں اور یہ ماما۔“ شہیر سنجیدگی سے ان کے انداز ملاحظہ کر رہا تھا۔
 ”شہیر اکلوتی اولاد ہے آپ کی؟“ سوال ڈیڈ سے تھا۔
 ”جی نہیں ایک بیٹی بھی ہے۔ اندر پڑھ رہی ہے۔“

”اچھی بات ہے۔ آپ لوگ میری آمد پر حیران ہیں اس لیے پہلے مدعا کی طرف آتا ہوں۔ ہماری بیٹی کو شہیر بہت پسند آیا ہے اور اس کی خواہش ہے ہم شہیر کو داماد کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔“ نوروز کے جملوں پر ماما اور ڈیڈ نے چونک کر شہیر کو دیکھا جو نوروز علی خان کو بغور دیکھ رہا تھا۔

”یہ کچھ چیزیں لے کر آیا تھا۔ ہمارے ہاں بیٹی کے سسرال خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ آپ لوگ بھی ہمارے گھر جلد آئیں۔ ہماری بیٹی سے مل لیں۔ پھر شادی کی تاریخ فکس کر لیں گے۔“ نوروز کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بیٹی کے لیے مافی لینے نکلے ہوں۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”مجھے ایک میسنگ میں پہنچنا تھا۔ چلا ہوں۔“ وہ جس طرح آئے تھے اسی طرح چلے گئے۔ ماما دل پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

”شہیر یہ کیا قصہ ہے؟ کیوں آیا تھا یہ شخص؟“
 ”بتایا تو انہوں نے اپنی بیٹی کو آپ کی بہو بنانے کی آرزو لے کر آئے تھے۔“ شہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”تم ملے ہو پہلے ان کی میملی سے؟“ ماما ایک سیاسی بندے کو شہیر کی طلب کرتے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔ اپنے تئیں وہ رشتہ طے کر چکے تھے۔ وہ رشتہ مانگنے نہیں انہیں اپنا فیصلہ سنانے آئے تھے۔ انداز تو ایسا ہی تھا۔

”جی ایک ماہ پہلے۔“ شہیر نے مختصر بتایا۔

”تم ان کی بیٹی میں انوالو ہو؟“ ڈیڈ کے سوال پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ان کی بیٹی انوالو ہے۔“

”پھر.....!“ ماما کو بے چینی لگی ہوئی تھی۔

”کیا ہو گیا ماما سیاسی بہو آنے کی خوشی نہیں ہو رہی آپ کو؟“ شبیر نے مذاق اڑایا۔ ماما رونے والی ہو گئیں۔

”ایسے لوگوں سے کون رشتہ جوڑتا ہے۔ کم از کم ہم تو نہیں جوڑ سکتے۔“

”کیوں نہیں جوڑ سکتے اور ہم کون سا ان کے در پہ بھکاری بن کے گئے تھے۔ وہ خود آئے۔“ شبیر کے سمجھانے پر ماما بے بسی سے اسے دیکھنے لگیں۔

”تم کیا چاہ رہے ہو؟“ ماما اس کی حتمی رائے جاننا چاہ رہی تھیں۔

”شازبے سے شادی۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا اور سیل فون اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف بڑگیا۔

☆.....☆

عروش نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ آدرش کی باتیں، نظریں، جسارت..... اس کا جی چاہ رہا تھا دھاڑیں مار مار کر روئے۔

”کون تھا وہ بندہ کیا ہوا تھا؟“ ثانیہ راستے بھر استفسار کر رہی تھیں۔

”آپ ٹینشن نہ لیں خالہ۔ تھا کوئی لوفر، فری ہو رہا تھا۔“ اس نے لا پروا نظر آنے کی کوشش کی۔ وہ اس کی مالی حیثیت اور رتبہ بتا کر انہیں خوفزدہ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ درحقیقت وہ اندر سے منتشر ہو رہی تھی۔ اسے ڈر لگنے لگا تھا آدرش علی خان سے۔

”شکل تو نہ دیکھ پائی لیکن حلیے سے تو اونچی آسائی لگ رہا تھا۔“ ثانیہ کی نظریں بہت تیز تھیں۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”گھر آ کر ثانیہ شاپنگ دکھانے لگیں۔ صارم عباس بھی آیا ہوا تھا۔ اس کا دھیان بار بار مال والے واقعے کی طرف جا رہا تھا۔

”بھئی مال میں عرشی نے ایک بندے کو ٹھیک ٹھاک باتیں سنائیں۔“ شاپنگ کا ذکر کرتے ثانیہ اس واقعے کو بھی زیر بحث لے آئیں تو وہ سر پیٹ کر رہ گئی۔ صارم اور شکلیہ کی نظریں اس پر تھیں۔

”کون تھا، بد تمیزی تو نہیں کی؟“ صارم غصے سے استفسار کر رہا تھا۔

”روٹین کی بات ہے، اس سوسائٹی کے مرد جب تک عورتوں پر کمینٹ نہ کریں ان کی انا کو سکون تھوڑا ملتا ہے۔“ لہجے پر قابو پا کر اس نے گول مول جواب دیا۔

”جو بھی تھا لیکن تمہیں اس کے منہ لگنے کی کیا ضرورت تھی۔ معاشرے میں ایسے لوگ بھرے پڑے ہیں۔ اب کیا تم ہر کسی کو درس دیتی رہو گی؟“ شکلیہ عروش کو سرزنش کرنے لگیں۔

”جی آئندہ دھیان رکھوں گی۔“ اس نے بحث کو طول نہ دینے کے خیال سے کہا اور چیزیں سمیٹ کر اٹھنے لگی۔ وہ چائے بنانے کے خیال سے کچن میں آگئی۔ جب صارم بھی اس کے پیچھے آیا۔

”عرش! کوئی بات ہے جو تم چھپا رہی ہو؟“ وہ اس کے چہرے سے پریشانی بھانپ گیا تھا۔ ”میں آپ سے بعد میں اس حوالے سے بات کروں گی۔ ابھی نہیں چلیجئے۔“ اس کے اعصاب کھل ہو رہے تھے۔ وہ یہ

باتیں صارم سے ڈسکس کرنا چاہ رہی تھی مگر شکیلہ اور حیات سن لیتے تو پریشان ہوتے۔
 ”او کے! صبح یونی چلنا ہے؟“ اس نے اصرار نہیں کیا۔ کل کے متعلق پوچھنے لگا۔
 ”کل تو خالہ جائیں گی، میں گھر پر ہی رہوں گی۔“

”بہت حرج ہو رہا ہوگا تمہارا۔“ صارم احساس دلایا تھا۔ احساس تو اسے بھی تھا۔ بہت شوق سے اس نے داخلہ لیا تھا مگر یونیورسٹی سے جو بلا اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔ اس نے اس کا سکون غارت کر دیا تھا۔ کیا قدرت نے اس کی پاک دامن کا یہ ہی انعام دیا تھا۔ ہر کچھ الٹ ہو رہا تھا۔

☆.....☆

ہر کچھ شانزے کی مرضی سے ہو گا۔ نوروز نے اسے یقین دلایا تھا۔ جس پر وہ کھانے پینے لگی تھی۔ نوروز علی خان نے شہیر سے کوئی بات کی تھی یا نہیں اس کا اسے کوئی علم نہ تھا۔ اس نے اشتیاق کو پیغام دیا تھا کہ وہ جیسے گھر آئیں شانزے ان سے ملنا چاہتی ہے۔ اشتیاق نے پیغام رسائی کی یقین دہانی کرائی تھی۔
 شانزے بے زاری ایل ای ڈی کار میوٹ پکڑے پھینک تبدیل کر رہی تھی۔ میل فون بجنے پر اس نے گردن موڑ کر اسکرین پر نظر ڈالی اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ شہیر کی کال تھی۔ اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے جھٹ کال ریسیو کی۔

”ہیلو! شہیر!“ خوشی کے ساتھ ساتھ اس کی آواز میں بے قراری تھی جو شہیر سے چھپی نہ رہ سکی۔

”رشتہ مبارک ہو۔“ شہیر کی مسکراتی آواز پر شانزے نے حیرانی سے فون کو دیکھا۔

”آج آئے تھے آپ کے ڈیڈ، آپ کا پیغام لے کر، زبان کی بڑی پکی ہیں آپ جو آنا فانا والد محترم کو بھیج بھی دیا۔“ شہیر کے انداز پر شانزے حیرت کے سمندر سے نکلی۔

”آپ راضی ہیں نا؟“ شانزے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”میں مفران نعمت نہیں کرتا۔ جب قسمت خود موقع دے رہی ہو تو کوئی بے وقوف ہی دامن جھٹکتا ہے۔“

شانزے کو حوصلہ ہوا۔

”شکر ہے، ورنہ میں ڈری ہوئی تھی کہ جانے آپ کیسا بی ہو کریں، کب بات کی آپ سے ڈیڈ نے؟“

”کچھ دیر پہلے واپس روانہ ہوئے ہیں۔ بہت چہیتی ہیں آپ اپنے ڈیڈ کی۔“

”بہت زیادہ اگر میں اپنے ڈیڈ اور بھائی کو چاند تارے بھی لانے کا کہوں تو وہ لے آئیں گے۔“ لہجے میں

باپ بھائی کی محبت کا غرور تھا۔

”آپ کے بھائی کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے، وہ مجھے پسند نہیں کرتے۔“ شہیر نے جیسے شکایت کی۔

”بھائی ہوتے ہی پوزیسیو ہیں۔ جب میں نے آپ کا نام لیا تو وہ آپ کو مارنے کی بات کر رہے تھے لیکن

جب میں نے انہیں کہا کہ اگر شہیر کو کچھ ہوا تو میں خودکشی کر لوں گی تب مانے۔“ اس نے سچائی سے کہا۔ شہیر کی

مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”دو مختصری ملاقات میں آپ کو مجھ سے اتنی شدید محبت کیسے ہو گی کہ آپ خودکشی تک پہنچ گئیں؟“ وہ جاننا

چاہتا تھا ایسی کیا بات تھی۔

”پہلی ملاقات کے بعد تو آپ مجھے زہر سے بھی برے لگے تھے۔ میں نے اپنی گاڑی کا حشر کر دیا

تھا۔ ڈیڈ ہوتے تو میں آپ کو بہت اچھا ستن کھاتی۔ میرا ارادہ بھی تھا میں اپنا کاغذ کم کرنے سی ویو گئی

تھی۔ جب آپ نے میری جان بچائی۔ اس ایک لمحے میں، میں نے سوچ لیا تھا باقی کی زندگی آپ کے ساتھ گزاروں گی۔“ وہ معصومیت اور سچائی سے اپنے محسوسات بیان کر رہی تھی۔ شہیرا اپنے لیے اس کا جنونی روپ دیکھ رہا تھا۔

”فائنلی آپ نے سوچا وقتی سبق سکھانے کا کیا فائدہ، بیوی بن کر زیادہ اچھا ٹارچر کر سکتی ہیں۔“ شہیر کی حس مزاح اتنی اچھی ہوگی اسے اندازہ نہ تھا۔ شانزے کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

”یہ ہی سمجھ لیں۔“

”شانزے! میں آپ کو ایک بات واضح کہنا چاہتا ہوں کہ بھلے آپ نے اپنے والد کو بھیجا ہو اور ہماری طرف سے ہاں بھی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیجیے گا کہ میں آپ کے والد یا بھائی سے خوفزدہ ہو کر شادی کر رہا ہوں۔ آپ کی پسندیدگی میں بھانپ چکا تھا۔ مجھے بھی آپ اچھی لگی تھیں۔ رہی محبت تو

محبت خود بتاتی ہے کہاں کس کا ٹھکانہ ہے
کسے آنکھوں میں دکھنا ہے کسے دل میں بسانا ہے
رہا کرنا ہے کس کو اور کسے زنجیر کرنا ہے
مٹانا ہے کسے دل سے کسے تحریر کرنا ہے
گھر و عداکب گرانا ہے، کہاں تعمیر کرنا ہے
اسے معلوم ہوتا ہے سفر دشوار کتنا ہے
کسی کی چشم حیراں میں چھپا اقرار کتنا ہے
شجر جو گرنے والا ہے سایہ دار کتنا ہے
محبت خود بتاتی ہے کسی کو پیار کرنا ہے

شہیر کی گھمبیر آواز میں شانزے کھو گئی تھی۔

”شہیر! میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس نے دلی خواہش بیان کی۔

”جب موڈ ہو گھر چلی آؤ، اسی بہانے ماما اور ڈیڈ سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور تم ہمارا گھر بھی دیکھ لو گی جو تمہارے والد کے گھر کی طرح لگژری تو نہیں لیکن بہت دلی لگے گا۔“ شہیر کے دھیمے لہجے پر اسے پیار آ گیا۔

”ضرور شہیر! آپ ساری زندگی مجھ سے اسی لہجے میں بات کیجیے گا۔ میرے لیے لگژری نہیں آپ کی اہمیت ہے۔ آپ مجھے کانٹوں پر بھی رکھیں گے تو خوشی خوشی رہ لوں گی۔ محبت کی ہے آپ سے، کوئی دل لگی نہیں۔ میں آپ کے رنگ میں رنگ جاؤں گی۔ آپ کی مہینے بھر کی تنخواہ میں بجٹ بنا کر گزارا کروں گی۔“ شہیر کا تہمتہ گونجا تھا۔

”بہت فلمی ہو۔“ ہنسی روک کر کہا۔ شانزے بھی مسکرائی۔

”آپ کو لگ رہا ہو گا لیکن میں زبان کی پکی ہوں۔“ وہ بضد تھی۔

”دلی کون سا دور ہے میڈم! یہ بھی دیکھ لیں گے۔“ شہیر نے چڑایا۔

شہیر کے مام ڈیڈ سے ملنا تھا۔ شانزے کو بہت اچھا دکھنا تھا اس سلسلے میں وہ شاپنگ پلان کرنے لگی۔

(باقی آئندہ ماہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

رواڈ انجسٹ 60 دسمبر 2016ء

مجرم اور عیار

بیٹھے تین سالہ نومی اور ڈیڑھ سالہ صومی کو کھلونوں سے کھیلتے دیکھ کر حیرانگی سے بولتی ان کے پاس آ بیٹھی۔

”ارے یہ اتنے پیارے پیارے بچے کس کے ہیں؟“ ایمن اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی تو بیڈ پر



پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

”ماما، ماما“۔ نومی اور صومی ماما ماما پکارتے اس سے لپٹ گئے۔

”ارے ارے میں آپ کی ماما نہیں ہوں، آپ کون ہیں اور یہاں کیسے آ گئے؟“ اس نے حیران ہو کر شپٹا کر دونوں بچوں کو تھام کر کہا۔

”یہ نومی اور صومی ہیں ہمارے بچے ہیں یہ اور یہاں میں انہیں لایا ہوں“۔ ارسلان ہاتھوں میں شاپنگ بیگ اٹھائے اندر داخل ہوئے اور مسکراتے ہوئے بولے۔

”ہمارے بچے، کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اس

نے بچوں کو فوراً خود سے الگ کر دیا اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”مطلب یہ ہے ایمن کے یہ دونوں بچے میری پہلی بیوی سے ہیں، یہ میرے بچے ہیں“۔ ارسلان نے بیگ بیڈ پر رکھ کر اطمینان سے بتایا۔

”کیا؟“ وہ چیخ اٹھی اس حیرت انگیز انکشاف پر۔

”ہاں ایمن! صومی کی پیدائش کے وقت میری بیوی تازہ کابی پی بہت ہائی ہو گیا تھا، بس اسی وجہ سے وہ دل کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔



اب تم ہی ہو۔“ ارسلان نری سے بولے۔
 ”ماما! بھوک لگی ہے۔“ نوی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر
 معصومیت سے کہا۔

”مجھے کھالو۔“ ایمن نے غصے سے کہا اور اپنا ہاتھ
 چھڑا لیا۔

”پاپا...“ نوی ارسلان کو دیکھ کر رو پڑا، اس نے
 بے قرار ہو کر اسے دیکھا مگر آگے نہیں بڑھی، بچے تو
 دونوں ہی اتنے پیارے تھے کہ ان پر بے اختیار پیار
 آنے لگے، مگر چونکہ یہ بچے اس کے شوہر کی پہلی بیوی
 کے تھے اور اس کو یہ حقیقت اب معلوم ہوئی تھی اس
 لئے اسے شدید دھچکا لگا تھا کہ اسے دھوکے میں رکھا
 گیا تھا۔

”ایمن! ایسے نہیں کرتے، بچے ہیں یہ۔“
 ارسلان نے نری سے اس کو اپنے بازو میں لے لیا۔
 ”لیکن آپ تو بچے نہیں ہیں، آپ نے مجھ سے
 یہ بات کیوں چھپائی، شادی کی رات ہی کیوں نہیں بتا
 دیا تھا۔“

”تم نئی نویلی لہن تھیں، میں تمہارے جذبات
 اور احساسات کا خیال کیے بغیر بچوں کو پہلی ہی رات
 تمہارے سامنے کیسے لے آتا؟“

”تو اب بھی سامنے لانے کی کیا ضرورت تھی؟“
 ”ضرورت تھی ایمن!“ وہ نری سے بولے۔

”بچے بہت چھوٹے ہیں اور میں انہیں زیادہ دن
 خو سے دور نہیں رکھ سکتا۔ میں نے تو انہیں تمہاری
 تصویر دکھا کر تمہیں ان کی پاما کی حیثیت سے متعارف
 کرایا تھا جیسی تو نوی نے تمہیں فوراً پہچان لیا، بہت
 ذہین ہیں میرے بچے۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اس قدر
 دھوکے باز ہیں۔“ وہ روہاسی ہو کر بولی۔

”ایمن! تم غلط سمجھ رہی ہو میں نے تمہیں کوئی
 دھوکا نہیں دیا۔“

”یہ دھوکا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟“ اس نے بچوں

میں نے بہت مشکلوں سے دونوں بچوں کو پالا ہے۔
 صوی کو تو صائمہ اپنا سنبھالتی رہی تھیں۔ میں اب
 بچوں کو مستقل تو ان کی نگرانی میں نہیں دے سکتا تھا
 ناں، ان کے اپنے بچے بھی ہیں، ان کی اپنی گھریلو
 ذمہ داریاں ہیں، اس لئے میں نے تم سے شادی کر
 لی ہے تاکہ میری اور میرے بچوں کی زندگی میں جو خلا
 پیدا ہو گیا ہے وہ پُر ہو سکے، جو کمی ہماری زندگیوں میں
 آگئی ہے وہ تمہاری محبت سے دور ہو سکے۔“ ارسلان
 نے صوی کو گود میں بٹھا کر دھیرے دھیرے اس پر
 مزید انکشافات کیے۔

ابھی ایک ہفتہ ہی تو ہوا تھا ارسلان سے اس کی
 شادی کو اور یہ تلخ حقیقت اس کے سامنے آگئی تھی۔
 اس کے سارے ارمان سارے جذبے یکدم راکھ ہو
 گئے تھے۔

”آپ مذاق کر رہے ہیں میرے ساتھ۔“ وہ
 بے جان آواز میں بولی۔

”نہیں ایمن! یہ سچ ہے اب یہ بچے میرے ہی
 نہیں تمہارے بھی ہیں۔“

”جی نہیں یہ بچے صرف آپ کے ہیں۔“ وہ غصے
 سے بولی۔

”ایمن...!“ وہ تاسف سے اسے دیکھنے لگے۔
 ”اتنا بڑا دھوکا اتنا سنگین فریب دیا آپ نے

مجھے، آپ پہلے سے شادی شدہ تھے دو بچوں کے
 باپ تھے اور آپ نے اتنی بڑی بات مجھ سے
 چھپائی۔“

”آئی ایم سوری ایمن!“ وہ نادم ہو کر بولے تو
 اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ہاں سوری میری ساری زندگی خراب کر کے
 کہہ رہے ہیں سوری۔“

”ایمن! تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو، اس بات
 سے تمہاری زندگی بھلا کیوں خراب ہونے لگی، تم بیوی
 ہو میری اور ظاہر ہے کہ اب میرے بچوں کی ماں بھی

ہوئے بولی۔

”میں کیا انکار کر دیتی ان کے فیصلے سے جو اتنی بڑی بات انہوں نے مجھ سے چھپالی اور آپ نے بھی اچھا نہیں کیا میرے ساتھ، اس رشتے کی بنیاد ہی آپ نے دھوکے اور جھوٹ پر رکھی ہے۔“

”ایمن، ایمن ایسا نہیں ہے مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے اور نہ ہی میں نے تمہیں کوئی دھوکا دیا ہے۔ میں نے تو تمہیں بہت مخلص اور محبت والی لڑکی سمجھ کر تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرے دل نے تمہاری آرزو کی تھی۔ بس ایک نظر ہی تو دیکھا تھا میں نے تمہیں اور تمہارا ہو گیا تھا۔ محبت میں جھوٹ اور دھوکا کہاں سے آ گیا۔ میری نیت نیک تھی، جذبہ صادق تھا جو تم میری شریک حیات بن گئیں۔ اب رہی بات بچوں کی تو یہ تم اپنے والدین سے پوچھو کہ انہوں نے تمہیں کیوں نہیں بتایا، میں عمر میں تم سے دس بارہ سال بڑا تھا، دو بچوں کا باپ تھا پھر انہوں نے میرا پر پوزل قبول کر لیا، آخر کوئی تو معقول وجہ ہوگی ناں اس کی۔“ وہ بہت نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”تو وہ وجہ مجھے نہیں بتا سکتے تھے وہ۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“
”آپ کچھ مت کہئے۔“ وہ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے انہیں چار پانچ سال کی بچی دکھائی دی۔ انہیں اس پر سب سے اختیار آنے لگا، وہ مسکرانے لگے۔

”دھوکے باز کہیں کے، کتنی معصوم صورت ہے آپ کی، شکل سے تو ایسے نہیں لگتے۔“ وہ ہلکی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی تو وہ بے اختیار تہمت لگا کر ہنس پڑے۔

”میں شکل سے ایسا اس لئے نہیں لگتا کیونکہ میں

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو بچے ہیں ہمارے پیارے بچے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

”مجھے ابھی اور اسی وقت اپنے گھر جانا ہے، اماں سے بات کروں گی۔“

”تمہارے اماں، اماں کو یہ بات پہلے سے معلوم تھی، انہوں نے ہی مجھے منع کیا تھا کہ میں تم سے شادی سے پہلے یہ بات نہ کروں۔ میں تو چاہتا تھا کہ تم سے مل کر تمہیں اپنے اور اپنے بچوں کے متعلق ساری بات بتا دوں، مگر تمہارے اماں ابانے منع کر دیا کہ ہم خود ہی سمجھا دیں گے ایمن کو۔“ انہوں نے سنجیدگی سے ایک نیا انگشاف کیا۔

”کیوں، کیوں کیا انہوں نے ایسا؟“ وہ شاک کی سی کیفیت میں بولی۔

”یہ تو وہی بہتر جانتے ہیں۔“ وہ سنجیدہ اور نرم لہجے میں بولے۔

”انہیں میرے متعلق سب کچھ معلوم تھا پھر بھی انہوں نے تمہاری شادی مجھ سے کر دی، آخر کوئی سبب تو ہو گا ناں اس کا، تم میں اور مجھ میں انہوں نے کوئی خوبی تو دیکھی ہوگی جو اس شادی پر اعتراض نہیں کیا۔ وہ تمہارے والدین ہیں تمہاری فطرت سے، عادت سے بخوبی واقف ہیں تمہارے مزاج کو سمجھتے ہیں، ان سب باتوں کو مد نظر رکھ کر ہی انہوں نے اتنا بڑا فیصلہ کیا ہو گا ناں۔“

”فیصلہ یاد دھوکا؟“ وہ اپنا اعتبار ٹوٹنے پر دکھی ہو کر رونے لگی۔

”ایمن! والدین کبھی اپنے بچوں کو دھوکا نہیں دیتے اور والدین سے زیادہ کون چاہے گا کہ ان کی اولاد سمجھی رہے مطمئن اور سرور زندگی بسر کرے۔“ وہ اسے پیار سے نرمی سے سمجھانے لگے۔ بچے حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”پھر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ روتے

شادی کو ایک ہفتہ ہی ہوا ہے، تمہارے منکے میں بھی مہمان موجود ہوں گے، تم مکلا وہ کرنے کے بعد بھی جاؤ گی اتنی جلدی تو وہ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ انہوں نے بچوں کو بٹھا کر اسے زری سے سمجھایا۔

”مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔“ اس نے تنک کر کہا۔

”بڑی بے پروا ہو۔“ انہوں نے ہنس کر اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”چھوڑیے میرا ہاتھ۔“ وہ زور سے ہو گئی۔

”تم ہاتھ کی بات کر رہی ہو ایمن ڈار لنگ! میں تو

تمہارا ساتھ بھی مرتے دم تک نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ

منصوبی سے اس کا ہاتھ تھامے محبت سے بولے۔

”اور اگر میں آپ سے پہلے مر گئی تو تب تو چھوڑنا

پڑے گا ناں آپ کو میرا ہاتھ۔“

”ہرگز نہیں، میں اپنی اور تمہاری قبر مشترکہ

بنوانے کی وصیت کر کے مروں گا۔“

”پلیز مجھ سے ایسی باتیں مت کریں۔“ اس نے

دل تھام کر سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”ڈر گئیں۔“ وہ اس کی کیفیت سے محظوظ ہو کر

ہنس پڑے۔

”انتہائی ڈھیٹ ہیں آپ۔“ وہ شپٹا کر بولی، وہ

ہنستے چلے گئے۔ اس نے دروازے کی جانب دیکھا اور

تیزی سے آگے بڑھی ہی تھی کہ نومی نے اس کے

دوپٹے کا کنارہ پکڑ لیا۔

”ماما پیاری ماما! کہاں جا رہی ہیں؟“ نومی نے

بہت معصومیت سے پوچھا تو اس کا ازلی نرم خود دل

بے قرار ہو کر چل گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ بیکار اس

کے دل سے اٹھی ہو، نومی اسے اپنی ہی اولاد محسوس

ہوا، اس کا دل تو جیسے باہر نکلنے کو مچلنے لگا، جس پر اس

نے ہاتھ رکھ کر قابو میں رکھنے کی کوشش کی اور مڑ کر

نومی کے معصوم چہرے کو دیکھا جو مسکراتے ہوئے اور

دل کا بھی ایسا نہیں ہوں۔ تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے

میری شکل جتنی معصوم ہے یقین کرو میرا دل بھی اتنا ہی

معصوم ہے، میں دھوکے باز نہیں ہوں، ارے میں تو

انتہائی بے ضرر اور محبت کرنے والا انسان ہوں۔

میری محبت کا اندازہ تو تمہیں اس ایک ہفتے میں ہو ہی

گیا ہوگا۔“ وہ مسکراتے شوخ لہجے میں بولے تو وہ حیا

سے سرخ پڑ گئی۔

واقعی اس ایک ہفتے میں محبت تو انہوں نے اسے

بہت دی تھی اتنی کہ وہ خود پر رشک کر رہی تھی، وہ بہت

نرم، میٹھے، مدہم اور محبت بھرے لہجے اور انداز کے

مالک تھے۔ اس نے دل میں ان کی محبت کا اعتراف

کیا مگر غصہ اپنی جگہ موجود تھا، ان کی صحیح باتیں بھی غلط

سمجھ رہی تھی کچھ سننے اور سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی

۔۔۔

”کیا خبر آپ کی یہ محبت بھی ایک دھوکا ہو فریب

ہو، اپنے بچوں کے لئے آپ کو مجھ سے محبت کا ڈرامہ

کرنا پڑا ہو؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”تم سے محبت کرنے کے لئے مجھے بچوں کا

سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ارسلان نے اس

دھان پان سی لڑکی کو محبت سے دیکھتے ہوئے شرارت

بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔“ وہ بھرائی

آواز میں بولی۔

”توبہ توبہ، میری یہ مجال۔“ انہوں نے ہنستے

ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”میں ابھی اپنے گھر جا رہی ہوں، مجھے نہیں رہنا

آپ کے ساتھ۔“

”رہنا تو تمہیں میرے ساتھ ہی ہے، اب یہ

تمہاری مرضی ہے کہ تم اچھی بچی بن کر رہنا پسند کرتی

ہو یا گندی بچی بن کر۔“ وہی بات گھر جانے کی تو

ضرور جاؤ، میں تمہیں میکے جانے سے کبھی نہیں

روکوں گا، ہاں مگر آج رات دو کیونکہ ابھی ہماری

کے لئے جا رہی ہو، دس از نائٹ فیئر مائی ڈیئر۔
انہوں نے بہت محبت بھرے لہجے میں کہا تو وہ بس
انہیں دیکھے چلی گئی۔ محبت ہی محبت تھی اس کی آنکھوں
میں ان کے لئے اور بس۔

”اب غصے میں بھی اس قدر پیار سے دیکھو گی
تو کس کم بخت کا دل چاہے گا کہ تمہیں میکے چھوڑ
آئے، اب اپنی نظروں کا انداز بدل لو ورنہ میں
گاڑی واپس موڑنے لگا ہوں۔“ وہ اس کی
نگاہوں کی تپش کو اپنے چہرے پر محسوس کرتے
ہوئے ونڈا سکرین پر نظریں جمائے غماظ انداز میں
ڈرائیونگ کرتے ہوئے بہت شوخ لہجے میں بولے
تو وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی، اپنی بے اختیاری اور
وازی پر اسے خوب غصہ آیا۔

”جی نہیں مجھے میکے جانا ہے ابھی۔“ اس نے
نظریں جھکا کر سپاٹ لہجے میں کہا۔
”تو پھر ایسے مت دیکھو، ایکسیڈنٹ کرایہٹوں کا
میں۔“

”بہت خراب ہیں آپ۔“ وہ بلس ہو کر بولی تو وہ
تہقہ لگا کر ہنس پڑے۔

”اچھا تمہیں غصہ کس بات پر ہے، میرے شادی
شدہ اور دو بچوں کے باپ ہونے پر یا یہ حقیقت تم سے
چھپائے جانے پر؟“ انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر
پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ اس نے تھک کر سیٹ کی پشت سے
سر نکا دیا۔

”اچھا چلو تمہارے ابا کا گھر آ گیا ہے۔“ انہوں
نے گاڑی اس کے گھر کے قریب روک کر زری سے
کہا۔

”اور یہ بھی بتاؤ کہ میں تمہیں کتنی دیر بعد لینے
آؤں؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ گاڑی سے اترنے لگی تو
انہوں نے اس کی کلائی تھام لی۔

بھی پیارا لگ رہا تھا، اس کا دل چاہا کہ بڑھ کر اسے
اپنی آغوش میں سمیٹ لے مگر ارسلان کے مسکراتے
چہرے کو دیکھ کر اسے غصہ آ گیا اور اس نے دوپٹہ
آہستہ سے اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا، اس کے دل
میں ایک عجیب سا احساس جاگ اٹھا۔ وہ بے چین سی
ہو کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی، ارسلان نے بمشکل
اپنی ہنسی ضبط کی۔

”اے میکے نہیں چلو گی۔“ ارسلان نے دلفریب
انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”چلوں گی اور ابھی چلوں گی۔“ وہ ایک دم غصے
میں آ کر بولی اور دروازے کی جانب بڑھ گئی، وہ
جانے کس سوچ میں گھر کر مسکرا دیئے۔

”رُکو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ وہ
بچوں کو آیا کے پاس چھوڑ کر اس کے پیچھے چلے
آئے۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ خاموشی سے
فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ
سنجھال کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ایمن کی آنکھیں
آنسو بہائے جا رہی تھیں۔ اسے اماں اور ابا سے
ایسی توقع نہیں تھی اسے اپنا اعتبار ٹوٹنے کا رنج تھا۔
اتنی بڑی بات انہوں نے اس سے کیوں چھپائی؟ وہ
سمجھنے سے قاصر تھی۔

”رم جھم رم جھم پڑے پھوار تیرا میرا نت کا
پیار۔“ ارسلان اس کے آنسو دیکھ کر گنگنایا تو اس نے
غصے سے انہیں گھورا۔

”یار رونا تو بند کرو، تمہارے اماں ابا سمجھیں گے
کہ میں تمہیں مار پیٹ کر لایا ہوں۔“ وہ ہنس کر شوخی
سے بولے۔

”آپ بات مت کریں مجھ سے۔“ اس نے
دوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں بھی میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو
تمہیں حقیقت بتائی ہے اور تم مجھ سے خفا ہو رہی ہو،
جنہوں نے تم سے حقیقت چھپائی ہے ان سے ملنے

”تو تمہیں پتا چل گئی یہ بات“۔ اماں اور ابانے نظریں چرا کر کہا۔
”جی ہاں مجھے ارسلان نے خود بتایا ہے آپ لوگوں نے مجھ سے کیوں چھپایا؟“

”ایمن بیٹا! ہمیں خدشہ تھا کہ تم ارسلان کے بچوں کی وجہ سے اس رشتے سے انکار کر دو گی اس لئے ہم نے کسی سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا، حالانکہ ارسلان میاں تو کہہ رہے تھے کہ ایمن کو ان کے بچوں کے متعلق بتا دیا جائے“۔ ابانے آہستہ سے کہا۔

”ابا! آپ اتنا ہی جانتے تھے مجھے“۔ وہ دکھی ہو کر بولی۔

”آپ مجھ سے بات تو کرتے میں کیا آپ کے فیصلے سے انکار کر دیتی، آپ نے میرا اعتبار توڑ دیا ہے، آپ کو مجھ پر اپنی بیٹی پر اعتبار نہیں تھا، اعتماد نہیں تھا مجھ پر“۔

”ایمن! بس کرو باپ سے اس طرح بات کرتے ہیں“۔ اماں نے اس کی بات کاٹ کر سخت لہجے میں کہا تو فوراً ابابول پڑے۔

”کہنے دوا سے، سچ ہی تو کہہ رہی ہے یہ، ہم نے اس سے ارسلان میاں کی پہلی شادی اور بچوں والی بات چھپا کر اس کے اعتماد کو ختم کر پھینچائی ہے“۔

”جانے دیں عاصم کے ابا! آپ نے تو اپنی اولاد کو سر چڑھا رکھا ہے، خاص کر ایمن کو تو آپ بالکل ہی سچی سچی سمجھ کر ٹریٹ کرتے ہیں، ارے ہم ماں باپ ہیں اس کے، اس کا برا تو نہیں سوچا ہو گا ناں ہم نے، آخر کیا کمی ہے ارسلان میاں میں، تعلیم یافتہ، سمجھے ہوئے مہذب، میزدار، وضع دار، شاندار اور کامیاب بزنس مین ہیں۔ بچے ہیں تو کیا ہوا کل کو ایمن کے اپنے بچے بھی تو ہوں گے اور اسے کون سا سارا وقت بچوں کو سنبھالتے رہنا ہے۔ ارسلان میاں نے بچوں کے لئے آیا رکھی ہوئی ہے، گھر میں

”تمہیں نہیں پتا تو مجھے بھی نہیں پتا، میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا، اپنی واپسی کا وقت مجھے بتا دو تاکہ میں تمہیں لینے آ جاؤں“۔
”میں خود آ جاؤں گی“۔ وہ نروس ہوتے ہوئے بولی۔

”یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کب آؤ گی؟“
”ارسلان...“ وہ تذبذب کے عالم میں انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”جی جان ارسلان!“ وہ بے حد محبت اور شرارت سے بولے تو اس کے چہرے پر حیا کے سارے رنگ بکھر گئے، زبان تالو سے لگ گئی، اس نے منت بھری نظروں سے انہیں دیکھا تو انہیں اس کی حالت پر پیار کے ساتھ ساتھ رحم بھی آ گیا۔

”او کے جاؤ مگر جلدی آنا، زیادہ انتظار مت کرانا“۔ انہوں نے اس کی کلائی چھوڑ کر محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خدا حافظ کہہ کر گاڑی سے اتر گئی۔

”ارسلان میاں نہیں آئے تمہارے ساتھ؟“
اماں ابانے اس سے ملتے ہی پوچھا۔

”جی آئے تھے مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں“۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور سنجیدہ لہجے میں بولی۔

”کیا بات ہے ایمن بیٹا! ارسلان سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟“ اماں نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

”جھگڑا تو اس سے کیا جاتا ہے جو جھگڑنا جانتا ہو، ارسلان کا تو مزاج ہی بہت دھیمّا اور نرم ہے“۔ اس نے دل سے ارسلان کی خوبی بیان کی۔

”اسی لئے تو ہم نے اس کا رشتہ قبول کر لیا تھا“۔
اماں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”مگر آپ نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ ارسلان پہلے سے شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ

ہیں؟“

بڑے ہیں وہ تم سے لیکن ان کا دوستانہ رویہ اس فرق کو کبھی محسوس نہیں ہونے دے گا۔ بیٹی! ارسلان میاں سے تمہاری شادی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تمہارے تانا اپنے بگڑے ہوئے بیٹے زبیر کے لئے تمہارا ہاتھ مانگنا چاہ رہے تھے اور میں تمہیں اس جہنم میں دھکیلنا نہیں چاہتا تھا، انکار کر کے بھائی جان سے ناراضی بھی مول نہیں لے سکتا تھا، اس لئے ان کے بات کرنے سے پہلے ہی ارسلان میاں کو ہاں کر دی تھی اور مجھے یقین تھا کہ تم ارسلان میاں کے بچوں کو اپنے بچے سمجھو گی اور انہیں ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دو گی۔ تمہاری ہر ایک سے محبت کرنے کی عادت نے ہی تو مجھے ارسلان میاں کا رشتہ منظور کرنے پر آمادہ کیا تھا، ان کے بچے بہت پیارے ہیں تم انہیں پیار دو گی، ماں کی ممتا کا احساس دو گی تو وہ بچے تمہارے ہی ہو جائیں گے۔ بچوں کو اپنا بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا، بچے تو صرف توجہ اور پیار سے ہی اپنے ہو جاتے ہیں، تم سمجھ رہی ہونا میری بات۔“ انا نہایت سنجیدگی مگر نرمی سے اسے سمجھا رہے تھے۔

”جی ابا! لیکن میں نے جو ارسلان کو دھوکے باز اور نجانے کیا کچھ کہہ دیا تھا غصے میں اس کا کیا ہو گا؟“ وہ روہانی ہو کر بولی۔

”او میرے خدا! ارے تم چپ نہیں رہ سکتی تھیں۔“ اماں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”کمال کرتی ہو بیگم! یہ اتنی بڑی بات پر چپ کیسے رہ سکتی تھی، اسے پہلے سے نہ بتا کر ہم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ خیر ایمن بیٹی! تم فکر نہ کرو میں ارسلان میاں سے خود بات کروں گا، وہ ناراض نہیں ہوں گے۔“ ابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا اور اس نے بھیکتی آنکھوں کو صاف کر لیا۔

☆.....☆.....☆

تین دن گزر گئے نہ تو وہ ارسلان کی طرف گئی اور

ملازمین کی کمی تھوڑی ہے، ذرا سی توجہ اور محبت یہ اگر ارسلان میاں کے بچوں کو بھی دے دے گی تو کون سی انہونی ہو جائے گی۔ ارے میں بھی تو طوبی کی ماں بن کر رہی ہوں آپ کے ساتھ، میں نے تو بھی آپ سے آپ کی مرحومہ بیوی کا تذکرہ نہیں کیا تھا، اس کی بچی کو اپنی بچی سمجھ کر سینے سے لگایا تھا اور آج ماشاء اللہ وہ اپنے گھر میں اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ خوشی خوشی زندگی گزار رہی ہے۔“ اماں نے ابا کی بات کے جواب میں تیزی سے کہا، وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں ابا نے ان سے دوسری شادی تھی، پہلی بیوی سے ان کی ایک ہی بیٹی تھی طوبی۔ پہلی بیوی گردن توڑ بخار کی لپیٹ میں آ کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھی اس کے بعد گھر والوں نے ابا کی شادی اماں سے کر دی، اماں نے انہیں گھر کا ہر سکھ دیا، چار بچے بھی اللہ نے انہیں عطا کیے۔ طوبی کے علاوہ عاصم، قاسم جو پڑھائی مکمل ہونے کے بعد جاب کر رہے تھے، ایمن اور من دونوں نے بی اے کا امتحان دیا تھا اور ایک ساتھ ہی شادی ہوئی تھی دونوں کی، طوبی کی شادی چار سال پہلے ہو گئی تھی اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔

”تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے بیگم! لیکن اب دور بدل گیا ہے اس کے تقاضے بھی بدل گئے ہیں، یہاں ایک نہیں دو بچے ہیں اور ایمن کو جب ارسلان میاں نے اپنے بچوں سے متعارف کرایا ہو گا تو اسے یقیناً دکھ ہوا ہو گا۔“ ابا نے مسکرا کر کہا۔

”خیر اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔“ اماں نے پالک کے پتے توڑتے ہوئے کہا۔

”ایمن! ہم نے ارسلان میاں کے متعلق جس سے بھی معلوم کیا اس نے ان کی تعریف ہی کی تھی۔ وہ بہت مخلص اور نرم مزاج رکھنے والے انسان ہیں، تم انشاء اللہ ان کے ساتھ بہت خوش رہو گی۔“ گیارہ

اپنے بچوں کے لئے مجھے منتخب کیا تھا۔ انہیں میری صلاحیتوں پر میرے خلوص اور محبتوں پر یقین تھا، جیسی تو انہوں نے مجھ سے شادی کی ہے۔ کیا میں ان کا انتخاب غلط ثابت کروں گی اپنے اس رویے سے؟ ان کا اعتبار اعتماد اور یقین توڑ دوں گی؟ مجھے دکھ پہنچا ہے کہ ابا اماں نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا تو ارسلان کو تو زیادہ دکھ پہنچے گا، کیونکہ انہوں نے اماں ابا سے کچھ نہیں چھپایا تھا، چھوٹی چھوٹی باتیں کتنی بڑی بڑی پریشانیوں اور شرمندگیوں کا باعث بن جاتی ہیں۔ ان معصوم اور پیارے بچوں کا کیا قصور ہے؟ کیا میں انہیں ماں کا پیار نہیں دے سکتی؟ دے سکتی ہوں اور ضرور دوں گی، کسی کا اعتبار، اعتماد اور یقین نہیں توڑوں گی، اماں ابا نے میرا بھلا ہی سوچا ہوگا ناں، ارسلان نے تو جہیز کے نام پر ایک چیز بھی نہیں لی، ان کی محبت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا۔“ ایمن نے دل میں کہا اور بے چین ہو کر لاؤنج میں چلی آئی۔ ٹیلی فون سیٹ کی جانب دیکھا ریسیور اٹھایا اور پھر رات کے ساڑھے بارہ بجاتی وال کلاک پر نگاہ پڑی تو ریسیور کریڈل پر واپس رکھ دیا۔ اسی وقت ٹیلی فون کی ٹھنٹی بج اٹھی، وہ ڈر کر اچھل پڑی۔

”ہیلو“۔ اس نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔
 ”السلام علیکم!“ دوسری جانب سے ارسلان کی نرم و شیریں آواز ابھری۔
 ”وعلیکم السلام! جی کون صاحب؟“ وہ ان کی آواز پہچان نہ سکی تھی۔
 ”ایمن ڈارلنگ! اپنے شوہر کی آواز بھی نہیں پہچانیں“۔ وہ مسکراتے لہجے میں بولے۔
 ”شوہر کا انداز پہچان لیا ہے یہ کیا کم ہے“۔ وہ خوشی سے ایک دم کھل اٹھی اور سنجیدگی سے بولی تو وہ ہنس کر بولے۔

نہ ہی وہ اسے لینے کے لئے آئے، یہاں تک کہ فون تک نہیں کیا۔ وہ بہت بے چین تھی۔ رات بھر نیند نہیں آتی تھی، دن بھر بے تابی سے بھی دروازے اور بھی ٹیلی فون کی طرف نگاہ اٹھ جاتی تھی۔ آج چوتھا دن تھا رات کو سونے کے لئے لیٹی تو نیند پھر اس سے روٹھ گئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ ارسلان اور نومی، صومی کی خوبصورت شکلیں اسے بے قرار کر رہی تھیں۔

”ماما، ماما بھوک لگی ہے“۔ نومی کی معصوم اور محبت بھری آواز اس کے کانوں میں گونجی تو وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔ نومی کا دودھیا رنگت جیسا حسین گول مٹول چہرہ اس کی آنکھوں میں آسایا۔ صومی اور نومی کی سیاہ چمکدار آنکھیں اسے اپنی طرف بہت محبت اور مان سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بچے تھے ہی اتنے پیارے کہ ایمن کو بے اختیار ان پر پیار آنے لگا تھا مگر اپنی جذباتی شدت پسند اور جلد بازی کی عادت کی وجہ سے ان سے دور بے چین و بے قرار بیٹھی تھی۔

”ایمن! آج سے یہ گھر اس کی ہر شے تمہاری ہے، میری جانب سے تمہیں کبھی کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوگی نہ دولت کی نہ محبت کی۔ اور مجھے تم سے صرف پر خلوص چاہت اور عمر بھر کا ساتھ چاہیے۔ امید ہے کہ تم مجھے زندگی کے کسی موڑ پر تنہا نہیں چھوڑو گی، ہر قدم پر میری ہمد بن کر میرے ساتھ ساتھ رہو گی“۔ ارسلان نے شاوی کی رات اس سے کتنے مان، خلوص اور پیار سے یہ جملے کہے تھے اور اس نے بھی اُن کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کی سماعتوں میں ارسلان کی شوخ و شریر سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ وہ ان کی خوشبو میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ پد لگا کر اڑ جائے اور ان کے پاس پہنچ جائے۔

”ارسلان نے مجھ پر اعتبار کیا تھا اپنے لئے

”تمہارا غصہ کم نہیں ہوا ابھی تک؟“
 ”آپ سے کس نے کہا کہ میں غصے میں ہوں۔“

”تمہارے سنجیدہ لہجے نے، ویسے ابا بتا رہے تھے کہ ایمن کا غصہ چند منٹ کا ہوتا ہے گھر پہنچتے پہنچتے ختم بھی ہو گیا تھا، کیا صحیح کہہ رہے تھے وہ؟“
 ”میرے ابا صحیح کہتے ہیں ہمیشہ۔“

”تو جناب! یہ سزا اس ناچیز کو کس لئے دی جا رہی ہے۔ کہیں تمہیں اس بات پر غصہ تو نہیں ہے کہ تمہارے اماں ابا نے تمہاری شادی کسی کنوارے کے بجائے دو بچوں کے والد سے کیوں کر دی ہے؟“ وہ دل کا خدشہ زبان پر لاتے ہوئے نرمی سے بولے۔

”جی نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”انہوں نے میرے لئے بہتر فیصلہ ہی کیا ہوگا اور آپ سے قدرت نے آپ کی بیوی واپس لے لی، اس میں آپ کا یا آپ کے بچوں کا تو کوئی قصور نہیں ہے اور کیا جن کی بیویاں مرجاتی ہیں وہ مرد دوسری شادی نہیں کرتے ہیں اور بچوں سے اگر ایک ماں کا سایہ چھن جائے تو بڑے دوسری ماں کا سایہ انہیں فراہم کرنے کی کوشش کیا ہی کرتے ہیں۔ کسی ایک فرد کے چلے جانے سے انسان ساری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا ناں۔ بچوں اور بڑوں کو سبھی کو ہمارے ساتھ اور محبت کی اپنائیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ نے اگر اس خیال سے دوسری شادی کر لی ہے تو کوئی جرم نہیں کیا، یہ آپ کا حق تھا اور قانون اور شرع بھی آپ کو اس کی اجازت دیتے ہیں پھر بھلا میں اس بات پر غصہ یا اعتراض کرنے والی کون ہوتی ہوں؟“

”تم میری بہت ہی پیاری اور سمجھدار بیوی ہوتی ہو۔“ وہ محبت سے خوشی سے لہریز لہجے میں بولے۔

”تمہارے خیالات جان کر مجھے اپنی پسند پر

اپنی محبت پر رشک آ رہا ہے، تم واقعی بہت مختلف مزاج رکھنے والی لڑکی ہو ایسے ہی تو نہیں ہماری نظر الفت نظر انتخاب آپ پر ٹھہری تھی، اب یہ بتاؤ گھر کب آ رہی ہو؟“

”جب میرا دل چاہے گا۔“ وہ خوشی سے شوخ ہو کر بولی۔

”اپنے دل سے کہو ایسے ظالمانہ اور انتظار سے بھرپور فیصلے نہ کرے۔ ایمان سے چار دن اور چار راتیں تمہارے بغیر گزارنا کسی عذاب سے کم نہیں رہا۔“

”آپ سوئے کیوں نہیں اب تک؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔

”تیری قربت میں جو گزری تھیں راتیں میری ان کی یادیں اوٹھکر مجھے سونے نہیں دیتیں“

انہوں نے بہت جذب سے یہ شعر پڑھا تو وہ شرما کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”یہ ہنسی کے جلتنگ یہ حیا کے سارے رنگ تمہیں بٹھا کے اپنے سنگ میں سننا اور دیکھنا چاہتا ہوں، اس لئے آ رہا ہوں تمہیں لینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“ وہ دیوانگی کی حد کو چھو رہے تھے، لہجے میں اس سے ملنے کی تڑپ چل رہی تھی، جذبات سے مغلوب آواز میں بولے تو حیا سے اس کا چہرہ اور بھی حسین ہو گیا۔

”نہیں ارسلان! ابھی نہیں پلیز گھر والے کیا سوچیں گے رات کا ایک بج رہا ہے۔“ اس نے گھبرا کر کہا تو وہ نرمی سے بولے۔

”مجھے رات کے ایک سے اور تمہارے گھر والوں سے نہیں تم سے مطلب ہے۔“

”ارسلان پلیز! میری بات مان لیں ناں۔“ اس نے پیار سے کہا۔

”اوکے مائی ڈیئر، گھر آؤ گی تو بدلہ لوں گا اس ستم ظریفی کا بے جرم سزا دے رہی ہو مجھے۔“

انہوں نے ہار مان کر کہا تو وہ خوشدلی سے شرارت سے ہنس دی۔

”بائی دی وے یہ آپ اس وقت تک کیوں جاگ رہی ہیں کہیں آپ بھی تو ہمارے سنگ گزرے رنجگوں کے حصار میں قید تو نہیں ہیں۔“ انہوں نے شوخ لہجے میں پوچھا تو وہ حیا سے مسکرانے لگی، بات تو ایسی ہی تھی اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا، جیسے وہ اسے دیکھ ہی تو رہے ہوں گے۔

”ایمن...“ وہ خاموشی سے تنگ آ کر بولے۔

”جی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”شکر ہے موجودہو میں سمجھا فون بند کر دیا ہے تو آپ شرما رہی ہیں، ہیں ناں؟“

”میں فون بند کر رہی ہوں۔“ اس نے حجاب آمیز لہجے میں کہا۔

”خبردار جو فون بند کیا، کم از کم رات تو کچھ چین سے گزرنے دو آفت لڑکی۔“ وہ تیزی سے بولے تو اس نے ہنس کر ریسپور کر یڈل پر رکھ دیا۔ انہوں نے ناراض نظروں سے ریسپور کو دیکھا اور کر یڈل پر پینچ دیا اور وہ ان سے بات کر کے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆
اگلے دن ٹمن اپنے میاں کے ساتھ آگئی تھی اس لئے وہ گھر نہ جا سکی۔ اگلی صبح وہ ناشتے سے فارغ ہو کر جانا چاہ رہی تھی کہ اماں نے ہی اسے ڈانٹ دیا۔

”ایمن! آخر تم چاہتی کیا ہو، یوں کب تک میکے بیٹھی رہو گی، آنے جانے والے سو طرح کے سوال پوچھتے ہیں کہ بیٹی ایک ہفتے سے گھر بیٹھی کیا کر رہی ہے، شادی کے ایک ہفتے بعد ہی لڑجھگڑ کر آگئی ہے کیا، ایمن! لڑکی شادی کے بعد میکے میں بیٹھی اچھی نہیں لگتی، اپنے شوہر کے گھر ہی جیتی ہے۔“

”اماں! لگتا ہے کہ آپ تو مجھے بوجھ ہی سمجھ رہی

تھیں، شادی کے بعد اس گھر پر اگر میرا حق ختم ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے نہیں آؤں گی آئندہ آپ کے گھر۔“ وہ ایک دم سے غصے میں آ کر بولی اور اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

”بیگم صاحبہ! کیوں آپ بچی کو تنگ کر رہی ہیں، دو چار دن رہنے دیں اسے یہاں، چلی جائے گی اپنے گھر، اس طرح مت ڈانٹیں سب سے چھوٹی بیٹی ہے وہ ہماری۔“ اماں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”مگر بہت جذباتی ہے دیکھا آپ نے ذرا سی بات پر اٹھ کر چلی گئی۔“ اماں نے کہا۔

”آپ بھی تو یہی چاہتی تھیں کہ وہ چلی جائے۔“ اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ اپنے کمرے میں گئی ہے اپنے گھر نہیں گئی۔“

”وہ اپنے گھر ہی گئی ہے ہماری بے خبر زوجہ محترمہ۔“ اماں نے ہنس کر کہا۔

تو وہ اس کے کمرے کی طرف گئیں، وہ واقعی پچھلے دروازے سے جا چکی تھی۔ اب انہیں اس کے ناراض ہو کر جانے پر دکھ ہونے لگا۔ آخر ماں جو تھیں۔

”چلو گھر جا کر منالوں کی، میاں کے گھر خیر سے پہنچ جائے۔“ انہوں نے دل میں کہا۔

☆.....☆.....☆
پانچ دن بعد اس نے ارسلان والا میں قدم رکھا تھا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اندر کا منظر اسے تاؤ دلانے کے لئے کافی تھا۔ ایک تو وہ پہلے ہی غصے میں بھری ہوئی آئی تھی، اوپر سے یہاں جو نمک جلالی ہو رہی تھی وہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ بچوں کی آیا ڈش پرائنڈین فلم دیکھ رہی تھی اور بچے رو رہے تھے۔ صوی منہ سے بار بار فیڈر نکال کر پھینک رہی تھی، نوی آیا کو روتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جو اس کے جھمکے کے سیب اور کیلے ہڑپ کر رہی تھی اور ساتھ

ساتھ فلم دیکھ رہی تھی۔

”ایمن۔۔۔“ ارسلان جو بچوں کے خیال سے آفس سے آئے تھے اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر زیر لب پکارا پھر کچھ سوچ کر ایک سائیڈ پر کھڑے ہو گئے۔

”یہ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے تم نے؟“ ایمن غصے سے بولتی اندر داخل ہوئی تو آیا کے ہاتھ سے سیب چھوٹ کر گر گیا اور وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

”سس سلام بیگم صاحبہ!“ اس نے بوکھلاتے ہوئے سلام جھاڑا۔

”وعلیکم السلام! سرین بی بی یہ سب کیا ہو رہا ہے، بچے رو رہے ہیں بھوک سے بلک رہے ہیں اور تم مزے سے کھانے پینے اور فلم دیکھنے میں مگن ہو۔“

”نن نہیں بیگم صاحبہ جی! میں تو بچوں کو کھلا رہی تھی۔“ آیائے ہکلا کر کہا۔

”کھلا رہی تھیں یا رُلا رہی تھیں۔“ ایمن غصے سے دھاڑی، وہ نادام ہو گئی۔

”ماما!“ نومی روتا ہوا اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

”نومی میرا بیٹا!“ ایمن نے تڑپ کر بے قرار ہو کر اسے اٹھایا اور اس کا گلہابی گال چوم لیا۔

”صوی آ جاؤ جانی ماما کے پاس۔“ اس نے صوی کو بھی اپنی گود میں اٹھایا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ دونوں کے آنسو صاف کیے، انہیں خوب پیار کیا اور دروازے کی اوٹ میں کھڑے ارسلان کی حیرت اور خوشی اپنے عروج پر تھی، انہیں ایمن پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

”ماما بھوک لگی ہے، آیا خود دودھ پی گئی ہمیں نہیں دیا۔“ نومی نے ہچکی لے کر بتایا۔

”کیوں آیا بی بی! تمہیں یہاں بچوں کی دیکھ بھال کے لئے رکھا گیا ہے یا ان کے منہ سے نوالہ چھیننے کے لئے۔“ ایمن نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”وہ جی جی!“

”کیا وہ جی وہ جی کی رٹ لگا رکھی ہے، یہ فیڈر دیکھ رہی ہو دودھ الگ اور پانی الگ ہے، خراب دودھ تم بچی کو زبردستی پلانے پر تلے ہوئی تھیں، یہ بھی شاید رات سے فیڈر میں بنا کر رکھا ہوگا، اب تک خراب ہو چکا ہے مگر تمہیں فلم دیکھنے سے فرصت ملے تو فیڈر کو دیکھو ناں، تمہیں تنخواہ کس بات کی ملتی ہے بچوں کو رُلانے اور بھوکا پیاسا رکھنے کی، شرم نہیں آتی تمہیں چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے حصے کا دودھ تک پی جاتی ہو اور یہ خراب دودھ یہ پی کر دکھاؤ ذرا۔“ ایمن نے فیڈر اٹھا کر آیا کی طرف پھینک دیا، اس نے شیشا کر فیڈر پکڑا اور نہ اس کے منہ پر لگ جاتا، ایمن کا غصہ انتہا پر تھا۔

”یہ تو جی ابھی خراب ہوا ہے۔“ وہ مسکین صورت بنا کر بولی۔

”تو تم کس مرض کی دوا ہو، بدل نہیں سکتی تھیں، خراب دودھ پینے سے کیسی کیسی بیماریاں لگ سکتی ہیں بچوں کو کچھ احساس ہے تمہیں، اپنے بچوں کو یہ دودھ پلاؤ تم، پیو یہ دودھ کھلو فیڈر پیو یہ دودھ اور پلاؤ اپنے بچوں کو۔“

”جی بیگم صاحبہ! معاف کر دیں جی۔“ آیائے پریشانی سے گھبراہٹ سے کہا۔

”تم سمجھ رہی ہوگی کہ یہاں کوئی تمہیں روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے تو تم اپنی مرضی سے جو چاہو گی کرو گی، بہت عیش کر لئے سرین بی بی! اب یہ نمک حرامی نہیں چلے گی یہاں، سمجھیں تم۔“ ایمن نے غصیلے اور سخت لہجے میں کہا، بچے اس سے لپٹے ہوئے تھے۔

”جی بیگم صاحبہ!“

”نیا فیڈر بنا کر لاؤ اور بند کرو یہ ٹی وی، اس قسم کی بیہودہ چیزیں دیکھنا ہوں تو اپنے گھر میں اپنے بچوں کو پاس بٹھا کر دیکھنا، اپنے ساتھ ساتھ ان کا اخلاق اور احساس بھی ختم کرنا، میں

کچھ نہیں کہوں گی مگر آئندہ میرے گھر میں میرے بچوں کے سامنے ایسی بے ہودہ فلمیں چلانے کی غلطی مت کرنا۔“

”فلمیں دیکھنے کے لئے ہی تو چلانے ہیں جی وہ لوگ اور یہ تو نومی صاحب نے ضد کر کے چلوائی تھی۔“

آیا نسرین نے ڈھٹائی سے کہا تو ایمن کو مزید غصہ آ گیا۔

”جھوٹ مت بولو نسرین۔“ وہ غصے سے چلائی۔

”نومی صاحب اتنے بڑے ہو گئے کہ تم سے ایسی فلمیں چلانے کی فرمائش کریں گے، شرم کرو معصوم

بچوں پر الزام لگا رہی ہو، یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارا اپنا

دل چاہ رہا تھا یہ بے ہودگی دیکھنے کو، تمہاری اپنی سمجھ

بوجھ ختم ہو گئی ہے ورنہ ڈش پر دیکھنے کے مناسب اور

شائستہ پروگرام بھی ہیں، اپنی یہ خواہش اور شوق اپنے

گھر کی حدود میں پورے کیا کرو، آئندہ اگر میں نے

تمہیں یہ اخلاق سوز پروگرام اس اہتمام سے دیکھتے

پایا تو اچھا نہیں ہوگا، اپنے بچوں کا بہت خیال ہے

تمہیں دوسروں کے بچوں کی صحت اور اخلاق بگاڑنے

کا ٹھیکہ لے رکھا ہے تم نے اور تم جیسوں نے، بچے

پیدا ہوئے اور بٹھا دیا ڈش کے سامنے یہ تربیت کی جا

رہی ہے نئی نسل کی، بند کرو یہ بکواس اور دفع ہو جاؤ

یہاں سے۔“

”بیگم صاحبہ! معاف کر دیں جی آئندہ ایسی غلطی

نہیں ہوگی۔“ نسرین نے کانپتی آواز میں کہا، اسے

اپنی ملازمت جاتی نظر آرہی تھی۔

”آئندہ میں تمہیں ایسی غلطی کرنے بھی نہیں

دوں گی، یہاں کام کرنا ہے تو ایمانداری سے نیک نیتی

سے کرو ورنہ اپنا راستہ ٹاپو، تمہارے لئے نوکریاں

بہت ہمارے لئے ملازم بہت، مگر نمک حرام ملازم کی

کوئی جگہ نہیں ہے اس گھر میں۔“

”جی بیگم صاحبہ!“ وہ شرمساری بچن کی طرف

بھاگ گئی۔

”ملازم ملنا اتنا آسان نہیں ہے ایمن بی بی جتنا

آسان تم سمجھ رہی ہو۔“ یہ ارسلان کی پھپھو تھیں جو

مہینہ بھر سے ان کے گھر ٹھہری ہوئی تھیں، نسرین کے

جاتے ہی اس کے سامنے طنزیہ انداز میں بولیں تو

ایمن نے کیلا چھیل کر صومی کو کھلاتے ہوئے اطمینان

سے جواب دیا۔

”اتنا مشکل بھی نہیں ہے اور میں خود اپنے بچوں

کے کام کر سکتی ہوں۔“

”تم تو ارسلان سے جھگڑ کر چلی گئی تھیں، اب

کیوں چلی آئیں اور آتے ہی ملازم پر رعب جھاڑنا

شروع کر دیا جیسے تم ہی تو مالکن ہو اس گھر کی۔“

”ہاں تو کیا نہیں ہوں میں مالکن اس گھر کی۔“

اس نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”ہونہہ... مالکن، ارے تم جیسی ہزار ملازما

خرید سکتا ہے ارسلان۔“ پھپھو نے طنز سے کہا۔

”مجھے اس گھر کی چاکری بھی قبول ہے کہ یہ

میرے شوہر کا گھر ہے۔“

ایمن کے اس جواب نے دروازے کے قریب

کھڑے ارسلان کی روح تک کو سرشار کر دیا۔

”بشیر، بشیر بچوں کے لئے دودھ اور فرنی لے کر

آؤ۔“ ایمن نے خانساں کو آواز دے کر کہا اور بچوں

کو پیار کرنے لگی، بشیر فوراً ہی دودھ کا کپ اور فرنی

لے آیا۔

”ماما! آیا مجھے کسٹرڈ نہیں کھلاتی خود کھا جاتی ہے

سارا۔“ نومی نے بتایا۔

”بہت بری ہے آیا، ابھی آپ یہ کھائیں شام کو

میں خود اپنے بیٹے کے لئے کسٹرڈ بناؤں گی، اس میں

کیک اور سٹیکلے کس کر کے اپنے بچوں کو کھلاؤں گی۔“

اس نے نومی کا ماتھا چوم کر پیار سے کہا تو وہ خوش ہو کر

بولا۔

”سچ ماما...“

”جی ماما کی جان!“ اس نے اس کے سر پر بوسہ

دیا، وہ خوشی خوشی فرانی کھانے لگا، صوی کو وہ اپنے ہاتھ سے کھلانے لگی۔

”نوی اور صوی تمہارے بچے کب سے ہو گئے؟“ پھپھو نے کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔

”تب سے جب سے ان کے پاپا نے مجھ سے شادی کی ہے۔“ اس کا اطمینان دیدنی تھا۔

”تم کیا سمجھ رہی ہو کہ بچوں سے محبت جتا کر تم ارسلان کے دل میں جگہ بنا لو گی، اگر ایسا ہے تو اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دو ارسلان تم سے محبت نہیں کر سکتا، اسے صرف اپنے بچوں کے لئے پڑھی لکھی آیا جائے تھی، جو کہ مل گئی ہے۔ ان بچوں کی وجہ سے ہی تم جھگڑ کر اپنے اماں باوا کے گھر چلی گئی تھیں ناں اب کیوں لوٹ آئیں؟ کہیں ارسلان کے ذریعے ہاتھ آئی دولت کے جانے کے ڈر سے تو نہیں لوٹ آئیں؟“

”صوی کو نیند آرہی ہے، سو جائیں۔“ اس نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ صوی کو اپنے ساتھ لپٹا کر تھکنے لگی۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ پھپھو نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”فضول باتوں کا جواب دینا مجھے پسند نہیں ہے دوسرا یہ کہ میں اپنے غصے سے اچھی طرح واقف ہوں، جانتی ہوں کہ میرا غصہ آپ کے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔ رہی بات جھگڑے کی تو ارسلان سے میرا کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ آپ بھی تو یہاں مہینے بھر سے بیٹھی ہیں آپ کے گھر والے بیزار تو نہیں ہو گئے آپ سے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”میرے منہ مت لگو لڑکی! جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اس گھر میں آئے اور لگی ہو حق جتانے۔ ارے دیکھوں گی میں کہ کیسے بستی ہو تم اس گھر میں، بڑی آئیں بچوں کی ماں بن کر، میں سب سمجھتی ہوں یہ سارا چکر تم ارسلان کی دولت

بھتیانے کے لئے چلا رہی ہو، نجانے کہاں مل گئی تھیں اسے۔“ پھپھو کا زہریلا لہجہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا، وہ بچوں کو لے کر بیڈروم میں چلی گئی۔

ارسلان کو پھپھو کے رویے پر شدید صدمہ پہنچا انہوں نے اُن کی بیٹی سے شادی سے انکار کر دیا تھا، پھپھو اسی کا بدلہ لے رہی تھیں ان سے۔ انہیں ایمن کا یہ روپ یہ انداز بہت اچھا لگا تھا۔ آیا کی لا پرواہی اور بے حسی پر غصہ بھی آیا مگر ایمن نے جس انداز میں آیا کو لتاڑا تھا ان کا غصہ دور ہو گیا تھا۔ انہیں بہت خوش محسوس ہو رہی تھی کہ انہیں اچھی بیوی اور ان کے بچوں کو سمجھدار اور محبت کرنے والی ماں مل گئی ہے۔ وہ ایمن کے شکر گزار تھے، ایمن کو انہوں نے بک فیئر میں اپنا کی نند کے ساتھ دیکھا تھا۔ اپنا کی نند ایمن کی میسٹ فرینڈ تھی، اسی کے ذریعے انہوں نے ایمن کا ایڈریس معلوم کیا تھا اور اپنا کو پر پوزل دے کر بھیجا تھا۔

ٹیلی فون کی تھنٹی بج رہی تھی، پھپھو اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں، ارسلان خود ہی اندر چلے آئے اور فون ریسیو کیا۔ دوسری جانب ایمن کی اماں بول رہی تھیں۔

”السلام علیکم اماں! کیسی ہیں آپ؟ جی ارے نہیں اماں ایمن خیریت سے یہاں پہنچ گئی ہے اور بچوں کو سلا رہی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ جی، میں سمجھتا ہوں اس کا غصہ پل بھر کا ہوتا ہے۔ جی اماں! نہیں اماں! میں کیوں ناراض ہوؤں گا اس سے بلکہ میں تو اس کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے گھر کو صحیح معنوں میں گھر بنانے کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ جی میں لاؤں گا اسے بچوں کے ساتھ۔ ارے نہیں میری بات وہ مان لے گی وہ ناراض ہونے والی تو نہیں ہے ناں، او کے اللہ حافظ۔“ ارسلان نے فون بند کر دیا اور

بیڈروم کے بند دروازے کی جانب دیکھ کر مسکرا دیے۔

”ارسلان بیٹا تم کب آئے؟“ پھپھو سبب کھاتی ہوئی کمرے سے نکلیں تو انہیں دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹھک گئیں مگر فوراً ہی سنبھل کر پوچھا۔

”ابھی آیا ہوں۔“ وہ ٹائی کی ٹاٹ کھولتے ہوئے بولے۔

”وہ بھی آگئی ہے۔“ پھپھو کا اشارہ ایمن کی طرف تھا، وہ سمجھ کر بھی انجان بن گئے۔

”وہی ایمن بی بی! تمہاری دولت کا چکر ہے سب نوئی اور صوبی سے ایسے پیار جتا رہی تھی جیسے وہ اسی کے بچے ہوں۔ ارسلان بیٹا! ایسی لڑکیوں کا کچھ بھروسہ نہیں ہوتا انہیں صرف دولت سے غرض ہوتی ہے۔ اب دیکھو ناں تمہارے بچوں کے ہونے کا انکشاف ہوتے ہی کیسے لڑ جھگڑ کر میکے جا بیٹھی تھی۔ اب خود ہی بے شرمیوں کی طرح چلی آئی۔ اماں اپنا نے کہا ہوگا کہ اس طرح تو ارسلان سے شادی کرنے کا مقصد پورا نہیں ہوگا تمہیں مٹھی میں کرنے کے لئے تمہارے بچوں پر متاں بچھا کر رہی تھی۔ تم ہرگز ہرگز ایمن کا اعتبار مت کرنا اور پیار کے قابل تو وہ ہے ہی نہیں۔ بچوں کو بھی اس سے دور رکھنا، بچے تو پیار کو ترسے ہوئے ہیں ذرا سا پیار ملنے پر اس کی طرف ہو جائیں گے اور وہ اول درجے کی چال باز ہے محبت کا فریب دے کر تمہارا سب کچھ ہتھیا لے گی۔“

”میرا سب کچھ تو وہ پہلے ہی ہتھیا چکی ہے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولے۔

”آئے ہائے کیا کچھ ہتھیا لیا تم فوراً بہانے سے واپس اپنے نام کرا لو۔“ پھپھو نے حیران ہو کر نہ سمجھتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”آپ بے فکر رہیں پھپھو! میں کوئی بچہ نہیں

ہوں کہ اس چھوٹی سی بچی کی باتوں میں آ جاؤں گا، میں سمجھتا ہوں اس کے مزاج کو۔“ ارسلان نے سنجیدہ لہجے میں کہا، اچانک ہی ان کی نگاہ پردے پر پڑی نیچے سے انہیں ایمن کے پاؤں دکھائی دیئے تھے، وہ فوراً ہی واپس پلٹ گئی۔ انہیں بے حد دکھ ہوا کہ پھپھو نے اس کے خلاف جو باتیں کہیں وہ اس نے سن لی ہیں۔

”اچھا میں چلتی ہوں تمہاری بیوی کو میرا یہاں رہنا کھٹک رہا ہے اور بیٹا! اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے، وہ تو آتے ہی جھاڑ کی طرح نسرین کے سر ہو گئی اور پھر مجھے اس گھر سے نکل جانے کا آرڈر کر دیا۔ میں نہیں جاہتی کہ میری وجہ سے تمہارے لئے کوئی پریشانی کھڑی ہو جائے، بس تم اس سے ہوشیار رہنا یہ کم عمر لڑکیاں اداؤں سے دل جیتنے کی کرتی ہیں۔“ پھپھو نے چادر اوڑھ کر تیزی سے کہا تو وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولے۔

”پھپھو! میں کون سا بوڑھا ہو گیا ہوں، اکتیس برس کا ہوں اور ایمن میری بیوی ہے اس کا حق ہے مجھ پر اس گھر پر، اور میں اس کے ساتھ ہی گھر آیا تھا آپ نے اس سے جو کچھ کہنا میں نے بہت صبر اور تحمل سے سنا ہے، پلیرز آئندہ مجھے میری بیوی سے بدگمان کرنے کی کوشش مت کیجئے گا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ ان کے تو پسینے چھوٹ گئے ان کی بات سن کر۔

”صحیح کہہ رہا ہوں آپ غلط کہہ رہی تھیں میں امن پسند اور صلح جو قسم کا بندہ ہوں، ایسی سازشوں سے مرعوب ہونے والا نہیں ہوں۔ بہتر ہوگا کہ آپ میرے ضبط اور ظرف کو نہ آزمائیں، میں رشتوں کا احترام برقرار رکھنا چاہتا ہوں اور آپ سے بھی یہی توقع رکھتا ہوں، آپ بڑی ہیں اس لئے آپ کو زیادہ بڑے پن کا مظاہرہ کرنا چاہئے نہ کہ... میرا خیال ہے کہ آپ میری بات کا مطلب سمجھ گئی

ہیں۔“ ارسلان نے نرم لہجے میں کہا تو وہ بغلیں جھانکنے لگیں اور چند لمحوں بعد جانے کے لئے کھڑی ہو گئیں۔

”اچھا اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ ارسلان نے سنجیدگی سے جواب دیا، وہ ان سے نظریں ملانے کی پوزیشن میں نہیں تھیں فوراً باہر نکل گئیں۔

”پھپھو! آپ ایک فتنہ پرداز خاتون ہیں میرے گھر میں بھی بدگمانی کی چنگاریاں پھینک کر جا رہی تھیں مگر ضد شکر ہے کہ یہاں سوکھی گھاس نہیں ہے محبت اور اعتبار کی شبنم میں بھیکے گلاب جذبے ہیں، جن کی مہک ہمیشہ پھیلتی رہے گی۔“ ارسلان نے دل میں کہا اور گھر اسانس لے کر بیڈروم میں چلے آئے۔

دونوں بچے بیڈ پر محو خواب تھے اور ایمن درہچے کا پردہ ہٹائے درہچے کے پٹ سے سر نکالے باہر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ ارسلان نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور بچوں کو پیار کر کے ٹائی اتار کر بیڈ پر رکھ دی۔ ایمن آہٹ محسوس ہونے پر بھی پشت موڑے کھڑی رہی وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب چلے آئے اور مسکراتے لہجے میں بولے۔

”ایمن ڈیر! آنے سے پہلے فون ہی کر دیا ہوتا میں خود تمہارے استقبال کے لئے پھولوں کے ہاتھ لئے گیٹ پر موجود رہتا، یوں اچانک چلی آئیں۔“

”میں اچانک ہی تو چلی آئی تھی آپ کی زندگی میں۔“ اس نے اسی پوزیشن میں رہتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں اور اچانک رونما ہونے والی تبدیلی بھی کبھی کبھی کتنی خوشگوار ہوتی ہے، ہے ناں۔“

”ارے اتنی بے یقینی کیوں بھی؟ اور جواب

نے یہ رخ زیا کیوں چھپا رکھا ہے ہم سے پانچ دن کم نہیں ہیں کیا نظروں سے اوجھل رہنے کو، ہوں، ادھر دیکھو، ارے...“ ارسلان نے محبت سے نرمی سے کہا اور آگے بڑھ کر اسے شانوں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب کیا تو اس کے آنسوؤں سے بھیکے چہرے کو دیکھ کر بے قرار ہو گئے۔

”ایمن... یہ آنسو۔“ انہوں نے اس کے آنسو انگلیوں پر پنے۔

”یہ آنسو تو نہیں ہیں۔“ اس نے جلدی سے بچوں کی طرح رخسار صاف کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں یہ تو امرت دھارے ہیں؟“ وہ بہت بے چین ہو کر قدرے خشکی سے بولے۔

”یہ لے لیجئے۔“ ایمن نے ہاتھ میں پکڑی فائل انہیں دیتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا، یہ تو وہی فائل ہے جس میں اس بنگلے کے کاغذات موجود ہیں جو میں نے تمہیں رونمائی میں گفٹ کئے تھے، مجھے کیوں دے رہی ہو؟“

”مجھے نہیں چاہئے یہ بنگلہ۔“

”کیوں پسند نہیں آیا؟“

”ایسی بات نہیں ہے، تحفہ ناپسند تو نہیں کیا جاتا۔“ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”مگر تحفہ واپس بھی تو نہیں کیا جاتا۔“ انہوں نے فائل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”مگر میں اس تحفے کے لائق نہیں ہوں۔“

”کس نے کہا تم سے، ہاں؟“ انہوں نے اسے شانوں سے تھام کر پوچھا۔

”مجھے پتا ہے۔“

”کسی بات کا صحیح پتا بھی ہے تمہیں۔“ انہوں نے اس کے صبح چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور تم آہاں کو خدا حافظ کہہ بغیر یہاں چلی

آئیں، وہ پریشان ہو رہی تھیں۔
 ”کیوں میں میکے سے میاں کے گھر آئی ہوں اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے اور پلینز آپ مجھ سے ابھی بات مت کریں کیونکہ مجھے شدید غصہ آرہا ہے، غصے میں کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکل گئی تو آپ ہی کہیں گے کہ کیسی بدتمیز اور سرپھری لڑکی سے شادی کر لی ہے۔“
 ”یہ تو میں اب بھی کہتا ہوں۔“ وہ شرارت سے بولے۔

”کیا؟“ وہ چیخ اٹھی۔
 ”میں بدتمیز ہوں۔“
 ”میں نے کب کہا تم خود ہی اپنی خوبیاں گنوار ہی ہو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔
 ”آپ اتنی جلدی گھر کیسے آگئے؟“ اس نے رخ پھیر کر اپنے آنسو چھپاتے ہوئے پوچھا۔
 ”بچوں کے خیال سے اور تمہیں گھر لانے کے خیال سے۔“

”مجھے گھر لانے کا خیال اب آیا ہے آپ کو جب میں خود ہی گھر آگئی ہوں۔“ وہ خفگی سے بولے۔
 ”تم نے خود گھر آ کر میرا دل جیت لیا ہے، مجھے بہت خوشی ہے ایمن! کہ میرا انتخاب بہت بہترین ہی نہیں دلنشین بھی ہے، اور تم جب گھر آئی تھیں میں بھی اسی وقت آ گیا تھا، تمہارا بچوں کے ساتھ حسن سلوک اور آیا کے ساتھ درشت رویہ دیکھ کر یقین کرو میں تو خوشی سے پاگل ہونے والا تھا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بتا رہے تھے۔

”تو ہو گئے ہوتے پاگل۔“ اس نے خفگی سے کہا تو وہ تہمت لگا کر ہنس پڑے۔
 ”اوہ آپ تو واقعی ہو گئے۔“ اس نے کمال معصومیت سے ایمین دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ایمن! یونانی گرل، کم میئر۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب کیا۔

”تم لاکھ نہ نہ کرو مگر میرا یہ سب کچھ تمہارا بھی ہے، سمجھیں۔“
 ”نہیں مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہئے۔“
 ”کچھ بھی نہیں۔“ انہوں نے حیرانگی سے اس کے چہرے کو دیکھا، وہ سمجھ تو رہے تھے کہ پھپھو کی باتوں نے اسے ہرٹ کیا ہے مگر وہ اپنی محبت کا یقین اسے دینا چاہتے تھے۔
 ”صرف آپ کا اعتبار چاہئے۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

ہوتا ہے۔

”کون سی محبت کے لئے؟“ وہ شرارت سے

بولی۔

”بتاؤں کون سی محبت کے لئے؟“ وہ پیار سے

اس دیکھتے ہوئے شرارت سے بولے۔

”نہیں مجھے پتا ہے سب معلوم ہے مجھے۔“ وہ ان

کی پیش قدمی سے زور ہو کر اکتے ہوئے بولی تو

انہوں نے فوراً اپنی گرفت مضبوط کر کے اسے بیٹھنے پر

مجبور کر دیا۔

”نہیں تمہیں کچھ نہیں پتا، کچھ معلوم نہیں ہے

تمہیں تمہاری معلومات انتہائی ناقص ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے اُن کے چہرے کو

دیکھا اور فوراً نظریں جھکا لیں وہ دیکھ ہی اتنی شریر

نظروں سے رہے تھے کہ اس کا دل اٹھل پھل ہونے

لگا۔

”مطلب ہی تو سمجھنا چاہ رہا ہوں تمہیں تاکہ

تمہیں آئندہ کوئی شک نہ رہے کہ تم میرے پیار اور

اعتبار کے قابل نہیں ہو۔“

”میں سمجھ گئی ہوں۔“ اس نے پھر بھاگنے کی

کوشش کی مگر راہ محبت میں فرار ممکن نہیں ہوتا، سو وہ بھی

ان کی محبت کے حصار میں پھنس کر رہ گئی۔

”اب بھاگ کر کہاں جاؤ گی چاروں جانب

میری محبت کا میرے پیار اور اعتبار کا حصار بچھا

ہے، جال بچھا ہے، اب سمجھی یقین نہیں کرو گی۔“

ارسلان نے محبت اور شرارت سے اس کے گرد گھیر

انگ کرتے ہوئے کہا تو اس نے شرما کر ان کے

سینے میں منہ چھپا لیا، اس کے یقین اور اعتبار کے

اس خوبصورت اعتراف پر خوشدلی سے قہقہہ لگا کر

ہنس پڑے۔ ان کی روح تو سرشار و شاداں تھی ہی

ایمن بھی ان کے پیار اور اعتبار کے حصار میں کھو کر

سرشار ہو گئی تھی۔

”صرف اعتبار اور پیار، وہ نہیں چاہئے کیا؟“

انہوں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر پوچھا۔

”میں تو شاید آپ کے اعتبار اور پیار دونوں کے

قابل نہیں ہوں۔“ اسے پھپھو کی بات اندر ہی اندر

کاٹ رہی تھی، وہ تاسف سے سر ہلا کر بولے۔

”کس نے کہا یہ تم سے؟“

”بس مجھے معلوم ہے۔“

”اپنی معلومات درست کر لو لڑکی!“ انہوں نے

پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی تو اس نے حیران ہو

کر ان کے مسکراتے چہرے کو دیکھا تو انہوں نے

اسے صوفے پر بٹھا کر نرمی سے کہا۔

”ایمن! مجھے معلوم ہے کہ تمہیں پھپھو کی باتوں

نے بہت ہرٹ کیا ہے، میں نے ان کی بیٹی سے

شادی نہیں کی ناں اس لئے وہ اس قسم کی باتیں کر

رہی تھیں، تم دل پر نہ لو۔ میں نے انہیں سمجھا دیا ہے

آئندہ وہ کچھ کہنے سے پہلے سوچیں گی ضرور اور رہی

بات اعتبار اور پیار کی تو اس کی حقارت تو تم اسی لمحے

نکھر گئیں جس لمحے تم نے میری آنکھوں کے ذریعے

سے دل پر قبضہ جمایا تھا، مجھے تم پر مکمل بھروسہ اور

اعتبار ہے۔“

”اور وہ آپ کی پھپھو؟“

”ارے ان سے ہمیں کیا لینا دینا۔“ انہوں نے

اس کے گرد اپنے بازو حائل کرتے ہوئے کہا۔

”ایمن! ایک بات اپنے ذہن میں نقش کر لو کہ

میرا اعتبار تم ہو، اعتبار کے بغیر یہ رشتہ پاسیدار نہیں ہو

سکتا، ہمیں ایک دوسرے پر اعتبار کرنا ہے کوئی کیا کہتا

ہے اس سے ہمیں بدگمان ہونے یا ایک دوسرے سے

ناراض ہونے کی حقاقت نہیں کرنی، اگر کوئی بات

ہمارے لئے پریشانی کا باعث بن بھی جائے تو ہمیں

ایک دوسرے سے بات کر کے کلیئر کرنی ہے، دل میں

شک کا جج نہیں ہونا، تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا اور مجھے

تم پر اور میری جان! محبت کے لئے اعتبار پہلی شرط

بلکھرنے سے پہلے

وہ اس کی وارنگی سے گھبرا کر بولی۔ ”وقت دیکھو
رات کے دو بج رہے ہیں۔ صبح کیسے اٹھو گے آفس،

”جان پلیز! فون نہ بند کرنا تمہیں تمہاری خوب
صورتی کی قسم۔“



ڈسٹنس پر تھا سو پیدل ہی جاتی تھی اور لڑکیاں بھی ساتھ ہوتی تھیں۔ وہ اپنی کسی کزن کو ڈراپ کرنے آیا کرتا تھا۔ وہیں سے اس کے پیچھے بڑ گیا۔ پہلے چھ ماہ تو وہ مسلسل نظر انداز کرتی رہی مگر وہ بھی ایک ڈھیٹ تھا، کسی نہ کسی طرح اپنی مسلسل کوشش سے کامیاب ہو گیا۔ وہ اکثر سوچتی۔ ”وہ تو اتنا ڈینگ ہے میں عام سی لڑکی مگر پتا نہیں مجھ سے محبت کے دعوے کیسے کرنے لگا ہے مگر اگر کو چھوڑ، وہ اتنا امیر ہو کر بھی تجھ جیسی عام گھر کی لڑکی پر مر مٹا ہے تو اس کی قدر کر، ویسے بھی آج کل اچھے رشتے ملتے کہاں ہیں تیری

باس اور جاب..... سوچ لو میں تو صبح کالج سے چھٹی کر لوں گی مگر تم تو روز روز آفس آف نہیں کر سکتے ناں۔“

”شفق پلیز یار! نو لیکچر، باہر دیکھو دسمبر کی بھیگی رات اپنے عروج پر ہے تمہیں رو مینس کی بجائے لیکچر سو جھ رہے ہیں۔“ اب کے عاشق بھی چڑ کر بولا تو شفق فوراً دھیمی پڑ گئی وہ اس کی ناراضی سے ایسے ہی ڈر جاتی تھی۔

گزشتہ چھ ماہ سے ان کا ٹیلی فونک رابطہ تھا۔ وہ تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ کالج بھی گھر سے واکنگ



یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

قسمت ساتھ دے رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔“
اس قسم کی مسلسل گفتگو اس کی فرینڈز اس کے گوش گزار کرتی رہتی تھیں۔ چنانچہ اس نے بھی خود کو خوش قسمت تصور کر کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اب تو اکثر لیٹ ٹائٹ بات چلتی تھی اور چیٹنگ تو ہر وقت کا مشغلہ تھا۔ جب سے دمبر اشارت ہوا تھا عاشق نے بھی اپنا رنگ ڈھنگ بدل لیا تھا۔ وہ بولڈ تو پہلے بھی تھا مگر آج کل اس کی بے باکیاں عروج پر تھیں اور ملاقات کا اصرار تو اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ اس کا فون سننے سے گھبرانے لگی مگر اس سے بات کیے بغیر اسے چین بھی نہ آتا تھا۔ لت ہی ایسی لگ گئی تھی سو وہ اس مسئلے کا کوئی سنجیدہ حل سوچنا چاہ رہی تھی۔

☆.....☆

”کوئی چارہ کوئی اسم محبت تو دے جاؤ
دوسو سہ ہے کہ دمبر جان لے لے گا“
عاشق ابھی تک ملنے کی ضد پر اٹکا تھا۔ اس نے سوچا۔ ”میں ایک بار اس سے مل ہی لوں تو بہتر ہے۔ سارے حالات بتا کر بول دوں گی پر پوزل بھیجے۔“ اس سے ملنے کا سوچ کر اس کے دل میں کھد بدج گئی۔
”پتا نہیں اس کا رد عمل کیسا ہو گا وہ تو خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ میں اور اس کے سامنے.....! ہائے اللہ وہ تو باتیں اتنی بولڈ کرتا ہے پاس ہوئی تو پتا نہیں کیا کہے گا۔“ وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی۔
”اگر کسی جاننے والے نے دیکھ لیا تو کیا ہو گا۔ ابوکی بنی بٹائی عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔“
ابو اس پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اس کی اماں بھی سیدھی سادھی تھیں اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی تو اس آزادی کا نا جائز فائدہ اٹھانا اسے گراں گزر رہا تھا مگر عاشق سے ملاقات بھی اسے ضروری کام لگ رہا تھا۔ بس یہ پہلی اور آخری بار ہو گا۔ اس نے فیصلہ کیا اور عاشق کو متیج کر دیا۔
وہ حسب توقع پھل گیا۔ ایسے آٹا یہ کلر پہننا وہ لپ

گزر جاتا ہے سارا سال یوں تو
نہیں کتنا مگر تنہا دمبر
بھلا بارش سے کیا سیراب ہو گا
تمہارے وصل کا پیاسا دمبر
صبح سے اسے وہ اسی قسم کی شاعری دالتا ہے
کے چار ہاتھ۔ وہ پڑھ پڑھ کر مسکراتی رہی اور خود پر فخر کرتی رہی۔

”مجھ میں ہے کیا؟ وہ اتنا کیوں مجھے چاہتا ہے۔“
آئینہ بھی کچھ بتا کر نہ دے رہا تھا۔ سارا دن دمبر کن من کن من برستار ہا۔ وہ محبت کی سرخوشی میں مورنی بنی پھرتی رہی۔ چاہے جانے کا احساس اس قدر جان لیوا ہوتا ہے وہ اب چھٹی جا رہی تھی۔ وہ سیل ہاتھ میں لیے ٹی وی دیکھتی چلغوزے کھا رہی تھی۔ جب اماں چائے کے کیوں کے ساتھ اس کے پاس آئیں۔

”شفیق! یہ تصویر دیکھ، بتا تو تجھے لڑکا کیسا لگا۔“ اس نے ایک نظر ڈال کر واپس اماں کی ہتھیلی پر رکھ دی۔
”اچھا ہے۔“ وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

وہ تین بہن بھائی تھے۔ بڑے بھیا جاب کے لیے اسلام آباد رہتے تھے۔ مقدم یونیورسٹی میں تھا۔ ابو اپنا

ہے۔ وہ دو تین سیلفیاں بنائے گا پھر اسے وائس اپ کر کے بول دے گا۔ ففٹی تھاؤزنڈ دے دو ورنہ سوشل میڈیا زندہ باو۔ اس الو کی پٹھی کو دینا پڑے گا کیسے بھی ورنہ سوشل میڈیا اسے کہانی گھر گھر کی بنا دے گا۔“ مقدم اب چائے کے سب لیے رہا تھا۔ شفق اسے پٹھی پٹھی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی حواس یکجا کر کے بولی۔

”نومی تم اس لڑکی کو انفارم کر دو پلیز کسی کی زندگی کا سوال ہے۔“

”اس کو کس نے ٹائم پاس بننے کا بولا ہے، بھگتے دو۔“ وہ اس کے بال کھینچ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔



شفق کو یہ صبح ہمیشہ کی نسبت زیادہ روشن اور پاکیزہ لگی۔ نماز پڑھ کر تلاوت کی۔ رب سے معافی مانگی اور اب لان میں چلی آئی۔ بھی امی نے اسے سیل تھما دیا۔

”کب سے بچ رہا ہے اسے تو سن لو۔“ اس نے دیکھا عاشر کا نمبر تھا۔ نیم اس لیے نہ آ رہا تھا کہ رات کو وہ ڈیلیٹ کر کے اور اہم فیصلہ کر کے سوئی تھی۔

”عورت کی عزت تو پھول جیسی ہوتی ہے ایک بار پھول بکھر جائے تو پتی پتی جوڑنا کہاں ممکن رہتا ہے۔“

مقدم کو گھر میں گھستے دیکھ کر اس نے سیل اس کے ہاتھ میں رکھ دیا یہ رانگ نمبر کب سے تنگ کر رہا ہے۔ اس لیے یہ سیل بھی تم رکھ لو خود ہی نمٹ لینا۔“ وہ جاگنگ سے لوٹا تھا۔ اسے سر سے پیر تک دیکھ کر رہ گیا۔

”اگر وہ مخلص ہوگا تو رشتہ آجائے گا گھر میں۔“ ورنہ آج کے بعد سیل تو اس نے یوز نہیں کرنا تھا وہ مطمئن سی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اسٹک لگانا، ایسا کرنا ویسا کرنا، اس نے فرمائشی پروگرام بند کر کے وقت اور جگہ طے کی اور مطمئن ہو کر باہر لان میں نکل آئی۔ سرد ہوا گلے لگی تو اس نے شمال کو مزید کس کر لپیٹ لیا۔ وہ ٹہل ٹہل کر مقدم کا ویٹ کرنے لگی۔ وہ آج پھر لیٹ تھا اگر ابا کو پتا چل جاتا تو اس کی درگت لازمی بن جاتی۔ سو وہ بھائی کو بچانے کا سوچ کر خود گیٹ کے آس پاس لان میں چہلکتی رہی۔ دل ویسے بھی اس کے فیصلے پر خاص خوش نہ تھا۔ دیباغ تو مسلسل انکاری تھا۔ ضمیر بھی ابا کے اعتماد کے قتل پر راضی نہ ہو رہا تھا۔ وہ ہاں کر کے بھی پریشان تھی نہ کر کے بھی اس نے پریشان رہنا تھا۔ اسی شش و پنج میں مقدم آ گیا۔

”شرم نہیں آتی اتالیٹ.....؟“ وہ غرائی۔

”یار فرینڈ نے کے ایف سی میں پارٹی دی تو وہیں لیٹ ہوا۔“

”اس نے پارٹی کس خوشی میں دی ٹاپ کر لیا ہے کیا؟“

”ہا ہا ہا..... ٹاپ؟“ مقدم بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔

”یار وہ چھ ماہ سے بچی کے پیچھے پڑا تھا۔ وہ تھی کہ ہاتھ آ کر نہ دے رہی تھی۔ تھوڑے دن پہلے سیٹ ہوئی تھی اور صبح وہ اس کو لے کر ڈیٹ پر جا رہا ہے۔ اس خوشی میں ٹریٹ بھی۔“ وہ بہن، بھائی اب کچن میں کھڑے چائے بنا رہے تھے۔

”بڑی گل اے سیٹنگ ہونے پر۔ کے ایف سی میں ٹریٹ شادی ہونے پر تو پتا نہیں سیرینا بھی لے کر جائے گا تم لوگوں کو۔“

وہ اب کپ میں چائے نکال رہی تھی۔ اس کی بات سن کر پانی پیتے مقدم کو اچھو لگ گیا۔

”شادی اور وہ بھی اس لڑکی سے..... پاگل ہو گئی ہو کیا، وہ تو جسٹ ٹائم پاس ہے اور ڈیٹ چھ ماہ کے دوران ہونے والا خرچہ وصول کرنے کے لیے مار رہا

شکر الہی

اب سورج نکلنے لگا ہے۔ روز ہی نکل آتا ہے۔ ہاں صبح ہی صبح اچھی خاصی روشنی ہوتی ہے۔ ساری رات ویسے بھی عجیب حالت میں گزرتی ہے۔ رضائی اوڑھو تو جی رلتا ہے۔ سانس بند ہوتی ہے۔ لحاف تو تو بدن اکڑ جاتا ہے۔ ہائے ہم کریں کیا، اوپر سے چھڑ ساری رات بھیں بھیں..... ویسے یہ بہار کس زاویے سے ہے؟ نا کچھ کھانے کو نہ پینے کو۔ عجیب پھیکے مالے ہیں۔ عجیب دغریب سے پیلے پڑ چکے مٹر۔ عجیب بد ذائقہ گو بھی۔ کیا کھائیں۔ والیں کب تک؟ پھول بوٹوں پر شگوفے پھوٹ رہے ہیں تو بھیا ہم کیا کریں؟ ہم پر تو عجیب سو گوار بیت چھائی ہے۔ مردی سی ہر طرف خاموشی پیلی سی دھوپ، نیلا آسمان، وحشت زدہ سامو سم بہار ہونہ۔

اب ذرا موسم بدلا ہے مگر ہائے ہائے یہ مٹی بھری آندھیاں گرد و غبار کے مرغولے، مٹی مٹی آخ آخ رات کو سونا و بھر اور دن کو جاگنا۔ ایسی ڈراؤنی آندھیاں لال آسمان، جھکڑ، مرغولے، ایسے ایسے کہ جیسے کوئی سب نہیں نہیں کر دینے پر تلا ہوا ہے۔ مٹی مٹی اور قطرہ بارش کا نہیں آف.....

اور کھانے کو بھی بس مٹی ذرا جو ذائقہ بدلانا چاہو تو پھیکے خر بوزے پھیکے خوبانیاں اور کڑوے آڑو۔ کھٹے آلو بخارے اور بس سورج۔

”ارے بھائی! تجھے کا ہے کی گری جڑھ گئی؟ جاڑھ ہے۔ کے دو جاہ چھپا رہا تو کیا ہمارا قصور۔ کیوں

جو گزرا ہے وہ صرف ایک سال نہیں تھا۔ جنال تھا۔ وہاں تھا۔ جنہوں نے کاٹا ہے۔ ان سے پوچھو کہ یہ سال تھا کیا؟ عذاب در عذاب، بلا میں ہی بلا میں، مصائب اور مصائب، ارے کس کس شے کا گلہ کریں؟

آغاز سے شروع کر لیتے ہیں۔

آف تو بہ! ایسا کڑا کے دار جاڑا، ٹھنڈی ٹھنڈی ٹھنڈی ٹھنڈی کہ رگوں میں بہتا لہو بھی جم جائے۔ برقی ہوائیں، دھند ہی دھند اور کیا بتاؤں کیسی دھند، باریک پس ہوئی برف ہو جیسے آف نہ دن کا پتا نہ رات کا، ایک سا دھند لا اندھیرا چوبیس گھنٹے، وقت ہمہ وقت رات کا جیسے نا سورج کی روشنی نا چاند تاروں کی۔ جوڑ دیے جوڑ جوڑ اس منحوس جاڑے نے۔ سارا دن ساری رات پڑے رہو لحافوں میں۔ مفلوج زندگی نہ کچھ کر سکیں نہ کچھ ہو، بس پوتی نیستی کے مارے سے پڑے رہو۔ آف پودے جل گئے۔ جانور حالوں بے حال، ہفتوں پرندے دکھائی نہیں دیتے۔ قدرت کو بھی کیا سوچھی ایسی ٹھنڈ میں ٹھنڈے مالے، دو پھانسیں جو غلطی سے ٹھک لو تو چھینکیں شروع، کھار کھار کھاسی، شوں شوں بہتی ناک، آف ہم تو گری میں ہی بھلے۔

ہمیں پتا ہے کیسے نکالے دو مہینے ایسی کپکپاتی سردی میں۔ حال سے بد حال، حال سے بے حال، یک گئے مٹر کھا کھا کر، دو دن آلو مٹر اور چار دن مٹر آلو۔ شکر ہے یہ جاڑا دفعان ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔



پتھارتا جا رہا ہے اور اچھلتا جا رہا ہے۔ گرم سے گرم سے گرم..... بل جائیں گے بھائی ہم۔ تیرے جیسے چاند تارے تھوڑی ناں ہیں ہم۔“

پر ناں جی، جتنے مرضی ہاتھ پاؤں جوڑ لو۔ منتیں فریادیں کر لو۔ جو مرضی کر لو کو سنے دے لو۔ بد دعائیں پر یہ نہیں رکنے والا۔ ہر صبح موجود..... مار دوں گا کانفرہ مارے گا اور جب تک مر نہ جائیں گے سر پر موجود رہے گا۔ اف بھیاں سنگ گئیں ہوں جیسے۔ چولہے میں رہنے لگے ہیں ہم جیسے دن گرم، راتیں گرم، جس، سائیں بند..... اف.....!

ایسے میں چنگھاڑتی کول، کالی صورت، منہ میں آواز، سن لیا..... آگ گیا بور، پتا چل گیا کہ آگئی گرمیاں، پر آم پٹنے تک کیا کھائیں تو کھا گئی ہمارا دماغ ہم کیا کھائیں۔

کدو، ٹینڈے، بینکین، توری، مرچیں، کریلے، الا بلا۔ ایک سے ذائقے کی۔ ایک سی شکل و صورت کی درجنوں سبزیاں۔ کیا کھائیں؟ سورج تو ہی رحم کر لے۔

کیا کہا یک گئے آم، ہاں ہاں کھا لیے..... کھا لیے..... کھا لیے..... اب بس یہی کھاتے رہیں۔ گرمی میں گرما گرم آم، گرم پانی، گرم آم، گرم آندھیاں، گرم بارشیں بلکہ تیزابی بارشیں، جس، پھھر، ڈیجی..... کس کس سے بچیں۔

کالے بادل تو اب روز آ جاتے ہیں، بارش بس بارش، پانی ہی پانی، جل تھل، کیچڑ، مینڈک، سانپ، اے ہائے بہہ گیا سب۔ سیلاب آگئے حال بے حال بد حال بس کر جاؤ بادلو۔ جاؤ افریقہ بہاؤ ٹمبکٹو۔ ہم پر رحم کرو۔ سورج تو بس کر جا۔ کوئی برسان حال نہیں۔ باہر بارش پہ بارش اندر دم گھوٹ، جس، کہاں رہیں؟ کہاں مریں؟ بس آم رہ گئے ہیں آم..... اوں ہوں سیون اپ ملے آم۔

اب ذرا موسم بدلا تو بارشوں سے جان چھٹی پر

سورج کو کون سمجھائے۔ جا چلا جا۔ تیرا دل نہیں بھرا ابھی۔ جل جل خاک ہو گئے اب تو ہم۔ سیاہ ہو گئی صورتیں اور راکھ ہو گئے کھجے۔ جا میرا بھائی! نہیں جائے گا؟ سردیاں، کہاں ہیں کب آئیں گی؟

خیر غرور بھی ٹوٹ گیا خدا خدا کر کے۔ سورج میاں گئے تو نہیں پر چلے گئے۔ نکال لیے لحاف۔ پہن لیے سویٹر، ٹھیک ہے پر کھائیں کیا؟ نہ آم نہ مالٹے، کڑوے کیلے گریپ فروٹ، پچی میاں، سوکھی سڑی کیا کھائیں۔

آسمان نیلا نیلا، سِلے پتے یہاں وہاں عجیب وحشت سی۔ ٹھنڈی ہوا، چھینکیں، بخار، کھانسی۔

سورج کہاں گیا؟ دھوپ کہاں گئی؟ ہائے جڑ گئے اتنی ٹھنڈ دسمبر میں، دھند..... یہ دھند ہے ناں؟ ڈالہ باری، اولے، بارش برقیلا پانی، کھائیں کیا؟

پھر سے مٹر..... مٹر..... کیسے جھیلیں ایسا موسم؟ آغاز سے اختتام تک ایک سا۔

☆.....☆

جو گزرا ہے وہ صرف ایک سال نہیں تھا۔ انعام تھا، اکرام تھا، نعمتوں کا قیام تھا۔ جنہوں نے گزارا ہے ان سے پوچھو یہ سال تھا کیا۔ عطا در عطا، نعمت پر نعمت، راحت در راحت، ارے کس کس شے کا شکر کریں؟ چلو آغاز سے شروع کر لیتے ہیں۔

سردیاں ایک لفظ لیکن تصور، خوشگوار، بھاپ اڑاتے وجود۔ نرم گرم بستر، گرم رضائیاں اور ٹھنڈ بھی۔ سردی سی اندر تک اترتی جس سے نہجنے کے لیے گرم گرم چائے۔ ساتھ مونگ پھلی۔ میوے، کشمش، کھوپرا، پستہ..... آہا ٹھنڈی ٹھار ٹھنڈ اور ٹھنڈی ٹھار آئس کریم۔ ایسا لطف اور کہاں۔ پھر جو نرم گرم سی دھوپ نکلے تو نمک لگا لگا کر ٹھنڈے کھٹے مالٹے۔ چھیلے جاؤ، کھاتے جاؤ۔ کاتے جاؤ، چوستے جاؤ اور بارش..... سرما کی بارش۔ سہانا منظر،

اس فٹیل کے لیے سونا جو ہر مزدور کی ضرورت ہے۔

پھر سورج کی تپش میں قدرے اضافہ۔ گندم بھی تو پکنی ہے آخر۔ نیلا آسمان دور تک۔ پہلی سی دھوپ، بہاروں سنگ جھومتی بہار۔ گلابی شگوفوں سے لدے خوابانی آڑو کے پیڑ، ٹخنوں سے قدرے اوپر لمبی لمبی گندم کے پودوں کے لہلہاتے کھیت۔ گلابی، میرون، سیاہ توت سجے اونچے اونچے درخت۔ لدی ہوئی بیریاں، ان گنت پھول، سرخ کلیوں سے ڈھکے اتار اور کوئل کی کوک، لو آگئی بہار۔ ہاں آگئی۔ خاموش دن۔ ہاں یاست بھرے دن بھی پر یاسیت مٹانے کو فطرت ہے ناں۔ فطرت کے رنگا رنگ مناظر ہیں ناں۔ ہر صبح گول زرد طلوع ہوتا سورج، چوں چوں کرتے پرندے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ پھر جو تپش اور بڑھی تو معلوم ہوا گندم تیار ہے۔ آموں کے ورختوں پر لگا بؤر بھی مٹی کیریوں میں بدل چکا ہے۔ ہرے ہرے پتوں اور بیلوں میں ڈھکے تربوز جو بن پر ہیں۔ کھٹے کھٹے آلو بخارے بھی اور فضا میں ہر سو اڑتی مائی بڑھیلی۔ بہار تو اب آئی ہے جیسے، سچی ابیاں نمک مرچ لگا کر کھائی ہیں کبھی؟ اگر کھالیں تو پھر کچھ اور نہیں مانگو گے کبھی۔ کٹائی ہو رہی ہے، سونے کی بالیاں، گندم کے ڈھیر اور آندھیوں کا موسم، جب جس بڑھ جائے تو آندھی، موسم خوشگوار مٹی مٹی ہر طرف۔ بشر تو مٹی ہے ناں۔ اور وہ بارش، گرما کی پہلی بارش، کھانسی نزلے سے آرام دیتی، سکون دیتی۔ گری..... ہلکی گری، شدید گری۔ ہر قسم کی گری۔ میں نے سوچا کئی بار کیوں آتی ہے گرمیاں۔ جواب سادہ اور آسان ہے۔ تاکہ سائے کی قدر ہو سکے۔ نہاؤ..... پیو، جیو۔

آم..... بہت سے آم پہلے پہلے ریشہ دار، قسیدے تو کئی لکھے جا چکے۔ آم کاٹ لو، جوس لو، نیچو

لو، پی لو، سٹک لو، جو مرغی کرو آپ کے ہی ہیں۔ گرمیاں خوشی خوشی گزارنے کا کیا حیلہ کر دیا فطرت نے۔ گرمی بڑھتی جاتی ہے، آم بھی بڑھتے جاتے ہیں۔

ترکاری کی بات رہ گئی۔ سردی کے مٹاؤ مٹر، مٹاؤ لے چاول۔ رائیتے کے ساتھ پھر گو بھی، شلجم، گاجر مولی، پراٹھے مولی کے، مکھن کے ساتھ اور ساگ، ہاں..... کب آئیں گی سردیاں۔ موسم بدلے تو کچنار، پھر بدلے تو کدو، قیمہ کر لے۔ جھنڈی، فبائی علی ربکما تکذبان۔ تو بات بھی گرمی کی۔ بارشوں والی گرمی کی، ساون، چیم چیم..... پکڑے گلے آم کھاؤ پھر سے نہاؤ، پھر سے کھاؤ، جھومتی برسات جھومتی، ہم بارش کی کم ہوئی۔ ہری ہری بیلین انگوروں سے ڈھک گئیں۔ گنا جو بن پر اور مکی بھنے بھنے وقت کا اچھا مصرف ہا ہا ہا۔

اب بس موسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ پہلے پتے خزاں، ایک سبق یہاں بھی مانسی کے پہلے پتے خود سے جدا کرو گے تو مستقبل میں نئے شگوفے ملیں گے۔ سمجھ گئے ناں۔

ٹھنڈا موسم، مسمی، گریپ فروٹ، ہرے ہرے مالے جواب پہلے ہونے لگے ہیں اور بج بھی ہو ہی جائیں گے۔ سردی، دھند، بارش۔ پھر سے وہی چکر۔

کیسے شکر ادا ہو اس موسم کا۔ آغاز سے اختتام تک عطا ہی عطا۔

”شکر الحمد للہ۔“ تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ گزرے سال کی نعمتوں کا شکر ادا کیسے ہو۔ ہم اور کریں بھی کیا۔ ہمیں یہی سکھایا گیا ہے اور اسی ننھے لفظ کو بڑی بڑی قوی ہیکل عبادتوں سے بڑا کہا گیا ہے تو 365 دنوں کے لیے 365 دنوں کی ہر نعمت کے لیے شکر الحمد للہ۔“

☆.....

WWW.PAKSOCIETY.COM

روزانہ اجلاس 87 دسمبر 2016ء

پتھر و گلاب سبر کے

”برف کے شہر میں لے کر جا رہی ہوں تمہیں۔
کچھ سویٹر اور گرم شائیں خریدی تھیں تمہارے لیے۔“
سواپنی پیکنگ میں انہیں بھی ساتھ رکھ لیتا۔“ عقیفہ
نے زئیرا کی طرف شاہرزادہ کر اس کو تلقین کی اور





اے لندن کے لیے منع نہیں کیا تھا۔ بلکہ ”بیسٹ آف لک“ کہا تھا۔ انہوں نے مری ہی میں قیام کیا ہوا تھا کہ دسمبر کی رات انہیں مری میں رک کر بھلی لگتی تھی۔ تنوں ناک، گوری رنگت، لمبا، چوڑا، بلیک آئیز و جیہنہ پر سنائی۔

”واؤ کتنا ڈشنگ ہے تمہارا ہونے والا سنگیتر۔“
سمن ہمایوں پر داری جا رہی تھی۔ سبرینہ تقاخر سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرا تو دل چاہتا ہے یہ تمہارے بجائے میرا ہو جائے۔“

”چٹاخ.....“ سمن کے فدا کن انداز سے بولنے پر سبرینہ نے اس کو پھٹ مارا تھا۔

”بے وقوف، جب بھی بولتی ہے الٹا بولتی ہے۔ اگر ایسا سوچ بھی رہی ہے تو یاد رکھ۔ سبرینہ کی چاہت کوئی اس سے چھین نہیں سکتا۔ میں نے ہمیشہ جو بھی چاہا ہے وہ مجھے ملا ہے۔ چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی مجھے پسند آتی میں نے وہ حاصل کر لی ہے۔“ سبرینہ غصے سے پھنکاری۔

”آئی ایم سوری۔“ دل میں برا بھلا کہتی سمن نے سبرینہ سے معافی مانگی تھی۔

”اٹس اوکے! لیکن خود سے اندازہ لگا لو۔ تمہیں میں نے اپنا دوست بنایا حالانکہ تم میری صرف کزن تھیں۔ مگر میرے ساتھ تمہیں میں نے اسی لیے رکھا ہے کیونکہ تم میری پسند ہو۔“ سبرینہ نے سمن کا موڈ بحال کیا تھا۔ ہمایوں ان کے قریب آچکا تھا۔

”ہائے گرلز! کیسی ہو۔ بانی داوے سمن! یہ تمہارے گال پر لال رنگ کا نشان کیسا؟“ وہ پوچھنے لگا تو سمن شپٹا کر سبرینہ کو دیکھنے لگی۔ سبرینہ کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ کیا ہمایوں! آتے ہی ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ تم میری طرف دیکھو

کمرے سے چلی گئیں اور زینیرا اپنی مختلف ایئر رنگز، ٹاپس، بندے پیک کر رہی تھی۔ ماں کے کہنے پر شاہر زکھول کر سویٹرز اور شال دیکھنے لگی تھی۔

فون کی بپ پر اس نے موبائل آن کیا تھا۔ دوسری طرف اس کی کزن جیا تھی۔ ”زینیرا! میں نے بہت سی شاپنگ کی ہے گرم پہناؤں کی آئی ایم ایکسائیٹڈ۔ دسمبر کے یہ دن ہم مری میں پتا میں گئے۔ وہ جھک رہی تھی۔ زینیرا اس کی دیوانگی پر قہقہہ لگانے لگی تھی۔

”ارے ابھی سے پاگل ہوئے جا رہی ہو تم۔ جب مری پہنچیں گے۔ تب کیا کرو گی۔“ زینیرا نے اسے کہا۔

”یہ تو تب ہی دیکھنا۔ ویسے میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ ہم چار بجے تک جا میں گے۔ عقیفہ خالہ کو بتا دینا اوکے بائے۔“ زینیرا نے موبائل کو منہ چڑایا اور اپنا خوب صورت سا اسکرٹ اور شرٹ پہن کر ہم رنگ چوڑیاں اور ایئر رنگ پہن کر تیار ہو گئی۔ بالوں کو ہمیشہ کی طرح کھلا چھوڑ دیا تھا۔ آنٹی لپ اسٹک لگا کر اس نے کاجل لگایا تھا گھنیری پلکوں والی کالی آنکھیں خوشی سے جگمگا رہی تھیں۔

☆.....☆

وہ ڈیپارچر سے نکلتا ہوا آ رہا تھا۔ لندن سے اسلام آباد تک کا سفر طے کیا تھا۔ اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ وہ یوں اپنی ماں کے کہنے پر پاکستان آئے گا۔ اس نے اپنی ماں سے دو ٹوک لہجے میں کہہ دیا تھا کہ وہ پاکستان نہیں آئے گا۔ وہیں اپنی زندگی بتائے گا۔ کبھی کبھی ان سے ملنے کو دل چاہا تو اسکا پ پر بات کر لے گا۔ مگر ایک دو سال اپنا بزنس اسٹیلش کرنے کے بعد اس کا دل ماں سے ملنے کو مچلنے لگا تھا۔ اسکا پ پر بات کرنے پر بھی اس کا دل ان کے پیار بھرے مس کو ترس رہا تھا سو وہ آگیا تھا۔ فائقہ جانتی تھیں بیٹے کی فطرت کو اس لیے مسکرا کر

انجوائے کرتے ہوئے زنیرا کو کہا۔

”ہاں واقعی ٹرین کے سفر میں مزہ آتا ہے۔“
زنیرا نے اس کی تائید کی رات ہوئی تو سردی کچھ
بڑھ گئی تھی۔

”ارے بیٹا کھڑکیاں بند کر دو۔ بہت ٹھنڈی
ہوائیں آرہی ہیں اب سبھی نظر اڑے کر لیتا۔ سو جاؤ۔“
عفیفہ نے دونوں کو رضائی دیتے ہوئے تاکید کی اور
بیچ پر لیٹ گئی۔ ان دونوں نے کھسر پھسر کر ناشروع
کردی تھی۔ یہ لڑکیاں حسب عادت باتوں میں
مصروف رہیں مگر جلد ہی سردی میں نیند کی دیوی
مہربان ہو گئی اور وہ دونوں خواب خرگوش کے مزے
لینے لگیں۔ پنڈی پہنچے تو گرم گرم سویٹر پہنے یہ لوگ
ٹرین سے اترے تھے۔ اور باہر کی طرف رخ کیا۔
نازمین اپنی بیٹی شرمین کے ساتھ کھڑی ان کو دیکھ کر
ہاتھ ہلانے لگیں تو وہ ان کی طرف چلی آئیں۔

”کتنے دنوں بعد ملی ہو تم لوگ۔“ نازمین بہت
کھلے دل سے خوش ہو کر ان سے ملی تھیں عفیفہ اور زنیرا
کو گلے لگاتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے
تھے۔ وہ بھی ہی ان کی جان سے پیاری کزن کبھی
بہن کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ نازمین اپنے ماں
باپ کی اکلوتی اولاد جو تھی۔

”تم دونوں کو یہاں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی
ہے۔ ہم تینوں مل کر خوب مستی کریں گے۔ میں تم
دونوں کو مری بھی گھماؤں گی۔“ شرمین زنیرا اور جیا
سے گلے لگ کر کہنے لگی تھی۔ یہ لوگ کار میں بیٹھ کر
اسلام آباد سے ہوتے ہوئے مری پہنچے تھے۔
نازمین ان کو اپنے گھر لے آئیں تھیں اور ان کا
سامان انہوں نے اپنے ملازم سے ان کے کمروں
میں رکھوا دیا تھا گرم گرم کافی ان لوگوں کی خدمت
میں حاضر ہو چکی تھی۔ وہ لوگ اس وقت ڈائننگ
ٹیمبل پر ہی بیٹھے تھے۔ بند شیشے کے دروازے اور
کھڑکیوں سے باہر کا برف سے اٹا شہر نظر آرہا تھا۔

گے میرے لباس کی تعریف کرو گے۔“

”دیکھو میں نے تمہارا سن پسند کر پہنا ہے۔“
وہ وائٹ کلر کی پینٹ شرٹ پہنے میک اپ کرتے
ہوئے اپنی طرف متوجہ کر گئی تھی۔ ”اس نے اس کے
انداز پر اپنی مسکراہٹ دہائی۔ وہ اس کی خوش فہمی غلط
نہی نہ بن جائے۔ اس لیے اس سے زیادہ فری
ہونے سے گریز کرتا تھا۔

”ویسے سن! پنک کلر کے اس ڈریس میں کافی
خوب صورت لگ رہی ہو۔“ ہمایوں نے سن کو پیار
سے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا تو سہرینہ جل
بھن ہی تو گئی۔ وہ اس کے خفت زدہ چہرے کو دیکھنے
لگا۔ تو اگلے ہی لمحے وہ مسکرانے لگی تھی۔ مبادا ہمایوں
ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ایک بار اسے پانا جو تھا۔ اس
نے مکاری سے سوچا تھا۔

☆.....☆

کمرے سے باہر غیر معمولی شور سن کر زنیرا
کمرے سے باہر نکل آئی تھی اور جیا اور خالد امبرین
کو دیکھ کر خوشگوار ماحول میں شامل ہونے کے لیے
اس طرف چلی آئی۔

”بیٹا! اپنا بیک بھی لے آئیں اب بس چلنے کی
کر دو۔“ امبرین نے اس سے ملتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں بیٹا جاؤ جلدی اپنے بیگز لے آؤ۔“
عفیفہ نے اسے کہا جب کہ جیا اس کے ساتھ ساتھ
جانے لگی تو امبرین نے اس کو ٹوکا تھا۔

”تم کہاں چلیں؟ جہاں تم دونوں مل جاتی ہو۔
بیٹھ کر پیسے بانٹنے لگتی ہو۔ ہمیں در نہیں کرنی ہے۔“
زنیرا فوراً بیگز اٹھا لائی تھی عفیفہ بھی کچن سے کچھ ٹفن
اور باسکٹ اٹھا لائی تھی۔ ساتھ میں منرل واٹر اور
سافٹ ڈرنک کی بوتلیں بھی رکھ دی تھیں۔ یوں یہ
قافلہ کراچی سے پنڈی کی ٹرین میں روانہ ہوا تھا۔

”کتنے خوب صورت سبزہ زار کھیت کھلیاں کے
نظارے دیکھنے کو ملے ہیں۔“ کھاتے پیتے جیانے

”کتنا خوب صورت اور دلفریب منظر ہے واؤ.....“ زبیر اور جیا ایک ساتھ بولیں۔
 ”میں تو روز ہی یہ منظر دیکھتی ہوں مجھے تو عادت ہے مگر میں تم دونوں کو کل ہی باہر گھمانے لے جاؤں گی۔“ شرمین نے اتر کر بولا پھر آخری الفاظ میں دوستانہ رویہ اختیار کیا۔

”او کے تم صرف ان دونوں کو گھاؤ گی اپنی خالہ وغیرہ کو نہیں گھاؤ گی اتنی دور سے آئیں ہیں کے شرمین ہمیں مری کی سیر کرائے گی۔“ نازمین نے بیٹی کے سر پر چبت لگاتے ہوئے کہا۔
 ”آف کورس می! آپ بھی ناں الفاظ پکڑتی ہیں۔“ شرمین جھل سی ہو کر بولی تو سب ہنس دیے۔

☆.....☆

ہمایوں نے اسلام آباد کے دلفریب منظر پر نظر ڈالی ہوا کے سرد چھوڑے اس کے چہرے پر پڑے تو سبرینہ نے اس کے سائیڈ کا دروازے کا شیشہ اوپر چڑھا دیا۔
 ”تھینک یو!“ ہمایوں نے اسے کہا تو وہ مسکرا دی۔

”تم تھینک یو کیوں کہتے ہو۔ میں تمہیں سرد تھپڑوں اور گرم دھوپ سے زندگی بھر بچاؤں گی۔“ وہ اس کی معنی خیز باتوں کو خاطر میں نہ لایا۔

”اچھا ماما کا بنگلہ تو پیچھے ہی رہ گیا ہے کہاں جا رہی ہو؟“ اس نے اسلام آباد سے گزرے مری کی طرف بڑھتی کار کا رخ دیکھا تو اس کو سبرینہ کی ڈہنی کیفیت پر رشک ہوا۔

”اوہ ڈونٹ دری ہنی اینڈ آئی ایم سوری میں بتانا بھول گئی۔ فائنٹہ آئی مری میں آپ کے اور ان کے مشترکہ بنگلے میں قیام پذیر ہیں۔“ انہیں چند دن وہاں گزارنے تھے ہمیشہ کی طرح۔“ وہ بنگلے کی طرف کا راستہ اختیار کر چکی تھی۔

”اوہ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ مری میں رہیں۔“

گی۔ انہوں نے فون پر بتایا تو تھا۔“ ہمایوں اس سفر سے عاجز آ گیا تھا۔ جلدی سے وقت کے کٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے دل میں دعا کی تھی کے فوراً ”ہمایوں پبلس“ آ گیا تھا وہ فوراً گاڑی سے اتر اور لمحہ نہ لگایا۔ گیٹ عبور کر کے بنگلے میں داخل ہوا تھا۔
 ”ہمایوں مائی ڈیر!“ فائنٹہ نے سرعت سے آگے بڑھ کر ہمایوں کو گلے لگایا تھا۔

”ماما میں تو ترس گیا تھا آپ کے پیار کے لیے مگر یہاں آ کر وہی اذلی ٹھن محسوس ہو رہی ہے۔ بس آپ کی موجودگی سے دل میں طمانیت کا احساس جاگا ہے۔“ وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوا تھا۔

”ارے آتے ہی بوریت کا احساس ہونے لگا ہے میں نے اسی لیے سبرینہ کو تمہیں لینے کے لیے بھیجا تھا۔ ملے تم اس سے؟“ فائنٹہ نے پاس ہی کھڑی سبرینہ اور منمن کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”اوہ ماما میں ان سے پہلے مل چکا ہوں۔ جب یہاں سے گیا تھا تو ایک پارٹی میں یہاں سے جانے سے پہلے ملاقات ہو گئی تھی اور یہ کچھ زیادہ ہی فرینڈلی ہو گئیں تھیں مجھ سے۔“ وہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے بولا تھا۔ سبرینہ کو اس کی ناگواریت پری طرح ٹھٹھکی تھی۔ مگر چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا آنکھوں سے سب عیاں تھا۔

”دیکھو سبرینہ! ابرامان گئی ہے۔“ فائنٹہ نے اس کی آنکھیں پڑھتے ہوئے کہا۔ ”اوہ ماما! اب یہ مت کہیے گا کے میں سوری بولوں۔“

”کوئی بات نہیں آنٹی! یہ تھک گئے ہوں گے اسی لیے جو منہ میں آ رہا ہے کہہ رہے ہیں ہم کل آجائیں گے بہتر ہوگا۔ یہ آرام کر لیں۔“ سبرینہ نے فائنٹہ سے اجازت لی اور منمن کے ساتھ واپسی کی راہ لی۔

”ایسا کیوں کیا بیٹا؟ سبرینہ کیا سوچتی ہوگی۔“

فائنٹہ نے منمن کو دیکھا تو اس کی

”آپ کو اس کی سوچ کی کب سے پرواہ ہونے لگی۔“ وہ جھنجھلا گیا تھا۔

”جب سے اس کے پاپا نے تمہارے پاپا کے ساتھ بزنس ڈیلنگ کی ہے خیر چھوڑو وقت آنے پر تمہیں سب کچھ پتہ چل جائے گا۔ منہ ہاتھ دھو اور فریش ہو جاؤ۔“ کمرے میں تمہارے لئے اور سرپرائز بھی پہنچ جائیں گے۔ یقیناً تم بہت خوش ہو گے۔“ وہ متحیر رہ گیا۔

”الجبھومت جاؤ اپنے کمرے میں۔“ انہوں نے اس کو اس کے کمرے میں بھیج دیا۔ اپنے کمرے میں جا کر سکون بھرا احساس ہوا تھا اسے۔ ہر چیز ویسے ہی نفاس سے رکھی ہوئی تھی جیسے اسے پسند تھی۔ وہ مطلوبہ کپڑے الماری سے نکال کر ہاتھ روم میں کھس گیا۔ شاور لینے کے بعد باہر آیا ٹاول سے سر کے بال خشک کرنے کے بعد ڈرائنگ ٹیبل پر رکھا برش اٹھا کر بال سنوارنے لگا۔ اور پھر اس کی سوچ ابھری تھی۔

”آخر کمرے میں ایسا کیا سرپرائز ہے میرے لیے یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ بڑبڑایا بھی کمرے میں دو نفوس داخل ہوئے۔ سعد اور ابرار اس کے سامنے ایک دم آئے تھے۔

”ہائے برو۔ ہم ہیں تمہارے لیے سرپرائز۔“ وہ دونوں ایک ساتھ بولے اور ہمایوں سے بغلگیر ہوئے۔

”واٹ اے پلینز سرپرائز۔ تم دونوں تو کینیڈا میں تھے ناں؟ یہاں کب اور کیسے آئے؟“ ہمایوں نے ایک ساتھ اتنے سارے سوال کر ڈالے۔

”فائنہ آئی نے ہی ایک ہفتے پہلے بلایا تھا۔ ویسے بھی وقتاً فوقتاً ہم یہاں آتے جاتے رہے ہیں تم تو کٹھنور بن گئے تھے۔ ایسے گئے تھے لگتا تھا واپس ہی نہیں آؤ گے۔“ سعد نے سگریٹ کا کش لگاتے

ہوئے کہا۔

”یہ سگریٹ کب سے پینا شروع کر دی؟“ ہمایوں دونوں کو دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ بچپن سے ایک ساتھ گزرا ہر دن ان کزنز کی یاد دل میں لیے کند ذہن میں گھومتا تھا۔ جہاں یہ تینوں ملتے کچھ نہ کچھ مستی پارٹی ضرور ہوتی تھی۔ ہمایوں کی بوریت دور ہو گئی تھی۔ ایک دوسرے کو کشن پھینکتے اور شور و غل کر کے انہیں وقت کا احساس نہ ہوا۔ فائنہ ہی اس کے کمرے میں غیر معمولی شور مچا کر آئی تھیں۔

”لو آتے ہی شروع ہو گئے۔ اور یہ کمرے کی کیا حالت بنا ڈالی ہے؟“ فائنہ نے کھڑا کھڑا کمرے کو دیکھ کر کہا۔

”اوہ مائی ڈیئر ماما! یو آر گریٹ مجھے آپ کا سرپرائز پسند آیا ہے۔“ ہمایوں نے فائنہ کو گود میں اٹھا لیا تھا۔

☆.....☆

”ہمایوں مائی ہنی! چلو میں تمہیں لینے آئی ہوں میرے فرینڈ کی پارٹی ہے۔“ وہ سمن کے ساتھ اٹھلائی، اتراقی بلیک ٹائیٹ اور ستارہ لگی شرٹ میں لمبوس کھلے بالوں میں بلاشیہ حسن کا شاہکار معلوم ہوتی اس کی طرف چلی آئی تھی۔ سعد اور ابرار نے ہنکارا بھرا تھا جو ہمایوں کو اپنے ساتھ لینے کے لیے اس کے تیار ہونے کا انتظار کر رہے تھے وہ اسے باہر کہیں لے کر جانے کا ارادہ رکھتے تھے اور اب کباب میں ہڈی بن کر یہ چڑیل آگئی تھی۔ دیکھو ابرار اور سعد بھی مجھے اپنے ساتھ لینے آئے ہیں۔“ ہمایوں نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے میں پارٹی میں جانا کینسل کرتی ہوں۔ تم لوگ جہاں جا رہے ہو وہاں میں بھی چلتی ہوں۔“ سبرینہ نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو ہمایوں ایک دم گڑبڑا گیا اور فوراً سنبھلا تھا۔

”ارے یہ دونوں لینے آئے ہیں مگر میں نہیں جا رہا میں تھوڑا آرام چاہتا ہوں۔ تھوڑی تنہائی چاہتا ہوں۔“ ہمایوں نے فوراً بات بدلائی۔

”او کے ہنی! پھر کل شام کو کہیں چلیں گے تیار رہنا میں بالکل نہیں سنوں گی تمہیں کل میرے ساتھ آنا ہی ہوگا۔“ سبرینہ نے اسے تنبیہ کرتے انداز میں کہا۔

”او کے او کے جیسا تم کہو۔“ سبرینہ اور سمن کے جانے کے بعد اس نے شکر ادا کیا اور پھر مینوں بن ٹھن کے تک سب سے تیار باہر نکل پڑے۔

☆.....☆

کالی گھنیری زلفوں کو جھٹکتی ہوئی وہ لڑکی کسی بات پر اپنے ساتھ کھڑی لڑکیوں کو کچھ کہہ کر مسکرا رہی تھی۔ اب وہ ایک جیولری شاپ پر کھڑی تھی وہ اسی طرف نکل آیا تھا اور سعد اور امیر ابھی اس کے ساتھ ہو لیے تھے۔

”یہ دیکھو جیا! شرمین یہ بندھے کتنے حسین ہیں۔“ زبیرا نے ایک خوب صورت سیٹ دکھایا جس میں سلور گینگے جڑے ہوئے تھے۔

”ارے بھائی! یہ پیک کر دیجیے۔“ ہمایوں نے اس خوب صورت کالی آنکھوں والی حسین لڑکی کو دیکھتے ہوئے دکاندار سے کہا۔

”دیکھیں بھائی صاحب! یہ پہلے ہم نے پسند کیے تھے۔“ زبیرا نے دکاندار کو کہا اور ہمایوں اس کو پسندیدگی سے دیکھ رہا تھا دکاندار نے وہ پیکٹ ہمایوں کی طرف بڑھا دیا تھا ہمایوں نے والٹ سے ایک بڑا نوٹ اس دکاندار کی طرف بڑھا دیا۔ زبیرا کو یہ لڑکا کچھ عجیب لگا تھا۔

”شاید امیری اس کے اندر تقاضا پیدا کر گئی

ہے۔“ اس نے سوچا پھر ہنر جھک کر وہ مینوں ایک جگہ گرم شالز کے اسٹال پر چلی گئیں۔

”ابے یار! لگتا ہے تجھے یہ لڑکی پسند آگئی ہے۔“ سعد نے اس کی دلچسپ نگاہوں کے زیر اثر اس لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔“ ہمایوں ان کو لے کر انہی کی طرف چلا آ رہا تھا۔

”دیکھو زبیرا! وہ لڑکا پھر سے آ رہا ہے یہیں۔“ شرمین نے ان کو بتایا۔

”ارے کتنا ہینڈسم ہے۔“ جیا نے جذباتی انداز میں کہا۔

”مجھے یہ کوئی بگڑا ہوا رئیس زادہ معلوم ہوتا ہے۔“ زبیرا نے کہا اور شالز پسند کرنے لگی۔

”ارے اس کے ساتھ تو دوڑ کے اور بھی ہیں کتنی ڈشنگ پر سنیلٹی ہے ان کی پڑھے لکھے بردبار۔“ ایک بار اور جیا نے کہا تو زبیرا نے سر پر ہاتھ مارا۔

”اب تمہیں یہ لوہر بردبار نظر آ رہے ہیں۔“ زبیرا کو بھی یہ لڑکے مہذب لگ رہے تھے ہمایوں کی نظر میں اپنے لیے اسے نظر آ رہی تھی مگر وہ مشرقی لڑکی تھی اس لیے اسے نظر لوہر کہہ کر چھٹکارا حاصل کرنا چاہا کے ذہن و دل میں عجیب سی کشش میں مبتلا ہو گئی تھی وہ وہ اسے اپنا آئیڈیل لگ رہا تھا۔

”ایکسکوز می انکل! یہ شال پیک کر دیجیے۔“ زبیرا کے سامنے وہ اچانک آیا تھا اور وہ اس کو دیکھتی رہ گئی تھی اپنی پسند کی شال اس کے ہاتھ میں رہ گئی تھی۔ جسے ہمایوں دکاندار سے اشارے سے خرید چکا تھا۔ وہ چونک کر اپنے خیالوں سے باہر آئی تھی۔

”ایکسکوز می! آپ کے پاس بہت پیسے ہیں تو خریدیے شوق سے خریدیے لیکن آپ وہی چیز کیوں خرید رہے ہیں جسے میں پسند کر رہی ہوں؟“ زبیرا اس سے لڑنا چاہ رہی تھی اسے غصہ جو آ گیا تھا۔

ہمایوں کی اس بے مکی حرکت پر۔

”ناراض کیوں ہوتی ہیں یہ چیزیں آپ ہی کے لیے ہی تو خریدی ہیں۔“ ہمایوں نے دونوں پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ آپ ہیں کون؟ میں اجنبیوں سے کوئی چیز لینا پسند نہیں کرتی۔ اور مجھے ایسی ویسی لڑکی مت سمجھنا۔“ وہ پھری تھی۔

”ایسی ویسی لڑکی نہیں سمجھ رہا جیسی آپ کی پسند میری پسند بن گئی ہے۔ جیسے آپ مجھے پسند آگئی ہیں۔“ ہمایوں کے انکشاف پر وہ اس کو تعجب سے دیکھنے لگی تھی۔

”شٹ اپ! اور ہٹو میرے راستے سے۔“ وہ اب آگے بڑھ گئی تھی۔ شرین اور جیا پیچھے رہ گئیں تھیں جو ہمایوں اور اس کے دوستوں پر اپنی پسندیدگی انہیں دلچسپی سے دیکھنے پر ظاہر کر چکی تھیں۔ زنیرا نے ان دونوں کو آواز دی تو شرین وہاں سے سرعت سے نکلتی چلی گئی۔ جیا جب کہ جانے کے لیے مڑی تھی مگر پلٹ کر ہمایوں کے اشارے سے اس کے پاس چلی آئی تھی۔

”واؤ! آپ تو بہت خوب صورت ہیں۔“ ہمایوں اور سعد نے اس کی تعریف کی۔

”تھینک یو۔“ جیا ترالی تھی۔

”بائی داوے وہ بلیواسکرٹ والی تک چڑھی کون تھی؟“

”وہ میری کزن زنیرا۔“ جیا نے بتایا۔

”اچھا زنیرا! ایڈیو؟“

”آئی ایم جیا۔“

”واؤ واٹ اے ٹائٹل نیم جیا یہ پیکٹس زنیرا کو دے دینا۔“ جیا نے وہ پیکٹس رکھ لیے۔ اور واپس جانے لگی۔

”او کے جیا ایک منٹ وہ زنیرا کا نمبر؟“ جیا ہونقوں کی طرح ہمایوں کو دیکھنے لگی۔

”جی نمبر کیوں بتاؤں۔“ جیا نے اس سے

پوچھا۔

”وہ میں پوچھوں گا کہ.....؟ آئی مین میں اسے پیکٹس قبول کرنے کے لیے تھینکس کہوں گا۔“

”او کے!“ جیا نے اسے اس کا سیل نمبر بتایا اور

وہاں سے چلی گئی۔ زنیرا اور شرین گاڑی میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہیں وہ بازار میں گھمانے کی غرض سے لائی تھی۔ اب گھر جانے کا ارادہ تھا۔ جیا گاڑی میں ایک دم آکر بیٹھ گئی تھی۔ شرین نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

”یہ تمہارے ہاتھوں میں کیا ہے؟ اور ایسے ہنس کیوں رہی ہو؟“ زنیرا نے پیچھے بیٹھی جیا کی طرف بغور دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”اور ہاں..... یہ تمہارے پیکٹس۔“ جیا نے اس کی طرف وہ پیکٹس بڑھا دیے۔

”واٹ..... یہ تو وہی پیکٹ ہیں جو اس لوہے نے خریدے تھے۔ تمہارے پاس کیسے آئے؟“ زنیرا نے اس سے پوچھا۔

”زنیرا! وہ کوئی لوہہ نہیں ہے اچھا خاصا ڈیسیٹ لڑکا ہے۔“ جیا بولی تو وہ تب گئی۔

”ہاں زنیرا! مجھے وہ بھلا مانس انسان بلکہ ڈشنگ لڑکا لگا۔“ شرین بھی ہنس رہی تھی اس لڑکے کے قصیدے سن سن کر وہ گھر پہنچی تھی کافی متاثر ہوئی تھیں جیا اور شرین۔ متاثر تو وہ بھی ہوئی تھی۔ مگر ایک مشرتی لڑکی کی یہ حرکات نہیں ہوتیں کہ وہ کسی اجنبی سے اس طرح بے تکلف ہو جائے اسے اپنی ماں کی فکر تھی۔ ان کی تربیت کی فکر تھی۔ اس لیے گاڑی سے اتر کر جیا کی طرف اس نے وہ پیکٹس اچھالے تھے۔

”کیا حرکت ہے زنیرا؟“ عقیفہ جو گاڑی کی آواز پر باہر آئیں تھیں جیا کے ساتھ بدتمیزی کرتے دیکھ کر وہ غصہ ہوئی تھیں۔

”سوری ماما وہ میں.....“ زنیرا سے کوئی بات

بن نہیں پارہی تھی۔ ”جی آپ کو یقیناً میری یاد ستارہی ہوگی۔“

مردانہ آواز پر وہ کچھ غصے میں آئی تھی۔
”کون صاحب بول رہے ہیں۔“ وہ کچھ سختی سے بولی۔

”ارے میں وہی جو آج بازار میں ملا تھا۔“
پیکٹس قبول کرنے کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ ”ہمایوں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تو وہ متحیر رہ گئی۔

”آپ کے گھر ایک دن آپ کو لینے آتا ہے۔ تو فون نمبر کا پتہ لگانے میں کوئی دقت کیسے ہوگی۔“
ہمایوں نے اپنے دل کی بات واضح کر دی تھی وہ تب ہی تو گئی تھی۔

”اتنی خوش فہمی ہے آپ کو آئندہ مجھے فون کرنے کی جرات نہ کیجیے گا سمجھے۔“ وہ نخوت سے موبائل آف کر گئی تھی۔ موبائل کی طرف دیکھ کر ہمایوں کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔“
”کبھی تو تم میرے دل کی بات سمجھوگی۔“ وہ پر یقین انداز میں زئیرا کے خیالوں میں گم اس سے کہہ رہا تھا۔

☆.....☆

اگلی شام میں سردی کی لہر کچھ زیادہ ہی عروج پر تھی۔ موسم بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ ایسے میں کھڑکی کے پٹ کھول کر باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔

”اب اس سے کب ملاقات ہوگی، کہاں ہوگی بس موبائل نمبر ہی ہے۔ لیکن وہ تو فون آفسر رکھ رہی ہے۔ ڈیم اٹ!“ اس نے سوچتے ہوئے دیوار پر ہاتھ مارا تھا۔ عقب سے کوئی اس کے پاس اچانک چلا آیا تھا۔

”ادھائے چنی! چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج تم کو میں یہاں کے مشہور ریسٹورینٹ لے کر جاؤں گی وہاں بہت مزے کے تکے اور بجلی ملتی ہے اس سرد موسم

”کیا..... وہ میں، تم تو شاپنگ کرنے گئیں تھیں۔“ عقیفہ نے کہا تو جیانے ہمت کی تھی۔ ہاں آئی! وہ یہ خریدے ہیں۔“ جیانے بتایا۔

”یہ کیسے پیکٹس ہیں؟“ عقیفہ نے پوچھا۔
”وہ اس میں ایک جیولری کا سیٹ ہے۔ اور ایک گرم شال کا پیکٹ ہے مگر اب زئیرا لینے سے انکار کر رہی ہے۔“ جیانے بولا۔

”اس میں انکار کرنے والی کون سی بات ہے۔“
عقیفہ نے پیکٹ کھول کر دیکھے اور زئیرا سے پوچھا جو سر جھکائے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

”وہ بس اب میرا دل نہیں چاہ رہا۔ بہت سی شاز ہیں اور جیولری میرے پاس ہیں۔“ زئیرا نے بات بنائی چاہی۔

”تو کیا ہوا بیٹا! میں نے تم سے ہمیشہ کہا ہے اپنا دل کبھی مت مارو جو پسند آئے وہ لے لیا کرو۔ ورنہ کوئی دوسرا چھین لے گا۔“ عقیفہ کی بات پر وہ سوچنے لگی تھی۔ جیا چٹکی بجا کر اسے خیالوں سے واپس لے آئی۔ عقیفہ نے ان تینوں کو گھر کے اندر چلنے کو کہا تھا۔

☆.....☆

سرد ہوائیں جو چل رہی تھیں کچھ سردی سی لگ رہی تھی۔ وہ تینوں اپنے کمروں میں آ گئیں تھیں۔

رہ رہ کر وہ پیکٹ کو دیکھ رہی تھی جو بیڈ کے ایک طرف پڑے ہوئے تھے۔ وہ اسے یاد آ رہا تھا نہ جانے کیا بات تھی اس اجنبی میں کچھ اپنا سالگا تھا اور پیکٹس میں موجود چیزیں اسی کی پسند کی تھیں جو اس شخص نے اسے خرید کر دی تھیں۔ اس کی یہ حرکت اسے کچھ اچھی نہ لگی تھی۔ اس نے پیکٹ کو تکیے کے نیچے رکھ دیا کہ یہ آنکھوں سے اوجھل ہوں تو وہ لڑکا اس کے خیالوں میں اس بہانے نہ آئے۔ مگر اس کی یہ کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ فون رات کے اس پہر بج رہا تھا۔ اس نے بنا دیکھے کان پر فون لگا لیا تھا۔

گئی تھی اور اپنے بائیں اپنے کالج لائف کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

☆.....☆

”آج کتنا اچھا میلہ لگا ہے۔“ زیر اور جیا کے ساتھ ہی پڑھتی تھیں اس لیے اس سے کہا تھا جو کالج میں اس کی دوست بھی تھی اور دوست اس کے ہوتے بھی کیسے سبرینہ نے جو دولت کا ایسا جال بنا تھا کہ اس کا کوئی بھی دوست نہ رہا تھا۔

ایک بار سبرینہ نے اسے اپنا دوست بنایا تھا۔ مگر وہ اس پر اپنا ہر حکم بجالانے کو کہتی تھی۔

”کلاس بنک کرو۔ میرے اسائنمنٹ مکمل کرو۔“ اس سے ایسی حرکات برداشت نہ ہوتیں تھیں۔ سو دوستی تو ٹوٹنی ہی تھی۔

”چند دن کی دوستی کو تم نے دشمنی میں بدل ڈالا ہے۔ زیر! تم جانتی نہیں یہ دشمنی تمہیں بہت بھاری پڑنے والی ہے۔“ سبرینہ نے کہا۔ زیر اس کو نظر انداز کر کے ایک طرف ہو گئی تھی اور اب میلے میں ایک طرح جنگ ہی ہو گئی تھی۔ ہر طرف مختلف اشیاء کے اسٹالز ہی اسٹالز تھے۔ جیا نے اس کو چمکتی آنکھوں کے ساتھ بتایا جو کافی خوش نظر آ رہی تھی ان رنگینوں کو دیکھ کر۔

”چلو مہندی لگواتے ہیں۔“ زیر نے مہندی کے اسٹال پر رک کر کہا تھا۔

”زیر! تمہارے ہاتھ تو بہت خوب صورت ہیں مہندی لگاؤ گی تو اور بھی خوب صورت لگیں گے۔“ جیا نے اس کی تائید کی۔ اور مہندی لگانے والی لڑکی نے اچانک مہندی لگانے سے انکار کر دیا۔ انکار کی وجہ دو گنے پیسے دینے والی سبرینہ تھی۔ وہ خفت سے اس اسٹال کو چھوڑ کر اگلے اسٹال کی طرف بڑھ گئی۔ یہ اسٹال جیولری کا تھا جہاں مختلف ڈیزائنز کی جیولری تھی۔ ایک سیٹ زیر نے پسند کیا تھا اس کے لڑکی کو پیسے بھی دیے تھے اور چیک کر دانے

میں ایسے کھانے کھا کر بہت مزہ آتا ہے۔“ وہ کچھ زیادہ ہی خود پر خوش گمان تھی۔

کیا سوچ کر یہ لڑکی میرے پاس اس طرح آجاتی ہے۔“ وہ اس کے الفاظ و گفتار پر سوچے گیا۔ کیا سوچا ہنی! تم یہیں ہو؟“ سبرینہ نے اس کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ تو وہ ایک دم سیدھا ہوا تھا۔ وہ میں سوچ رہا تھا من نہیں آئی تمہارے ساتھ۔“ ہمایوں اس پر سے نظریں ہٹا کر وارڈ روب سے کپڑے چوائس کرنے لگا۔

”ارے وہ کچھ سردی میں طبیعت بگاڑ بیٹھی ہے۔ آئی مین ٹو سے فلو ہو گیا ہے اسے۔“ اس نے اس کی تصویر کو ڈریننگ سے اٹھایا اور بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ اوہ بیچاری۔“ وہ بولا۔ کچھ دیر میں ہمایوں تک سب سے تیار ہوا تھا اور وہ اس پر نظریں نکاتی اسی کو دیکھے جارہی تھی۔ ”اب ایسے دیکھ دیکھ کر نظر لگاؤ گی یا چلو گی بھی؟“ وہ اس کے ساتھ جانے کے لیے نہ جانے کیوں راضی ہوا تھا وہ سمجھ نہ پایا تھا۔ خیر سے اس کی دوست ہونے کی دعویٰ کر رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ مقامی ریسٹورینٹ میں موجود تھا۔ ایک طرف کی ٹیبل جو پہلے ہی سے اس کے نام بک تھی وہاں آکر وہ سبرینہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”اوہ ہنی! کہاں دیکھ رہے ہو؟“ ہمایوں سبرینہ کے بیک سائیڈ پر دیکھ کر چونکا تھا۔ سبرینہ نے ایک تک دیکھتے ہمایوں کی نظروں کی تعاقب پر دیکھا تو وہاں زیر تو اٹھ کر کہیں گئی تھی سو وہاں کچھ لوگوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ”ہنی! میں تمہارے لیے کیا آرڈر کروں۔“ وہ ویٹر کے دیے گئے میہو کارڈ پڑھتی اس سے پوچھ رہی تھی۔

”اوہ ہنی! دیکھو ہنی۔ یہ لڑکی جو مسلسل کسی کو ہنی کہے جا رہی ہے اس لڑکی کی آواز جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔“ زیر نے لڑکی کی طرف دیکھا تو ہمایوں کو کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھا دیکھا کہ وہ درنگ رہ

کے لیے جیولری کو اس کے حوالے کیے تھا مگر اسی اثناء میں سبرینہ کے ایک اشارے پر اس لڑکی نے زئیرا کے پیسے واپس کر دیے اور دو گنی رقم لے کر وہ سبرینہ کو دے دیا۔

”یونیس می سبرینہ۔“ زئیرا اب اس کے آمنے سامنے ہو کر بولی۔

”لیس آئی ڈو۔“ سبرینہ نے کہا۔

”تمہاری یہ دولت تمہارے کسی دن کام نہیں آئے گی تم میری چھوٹی چھوٹی چاہت سے بہت کھیل چکی ہو۔ لیکن جب تمہاری چاہت کی باری آئے گی تو دولت تمہاری تمہارے لیے وبال جان بن جائے گی۔ کوئی کام نہ آئے گی۔ تمہاری چند دن کی دوستی میرے لیے یہیں تک وبال جان بھی مگر ایک دن میرا بھی آئے گا۔“ شرمین نے زئیرا کے سامنے ہاتھ ہلایا تو وہ خیالی دنیا سے واپس آئی تھی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

”یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیسے؟“ شرمین سمجھ نہ پائی تھی۔

”کنٹرول یور سیلف زئیرا! سبرینہ کو اس ڈشنگ لڑکے کے ساتھ دیکھ کر تمہارے دل میں کیا بیت رہی ہے۔ آئی نو۔ لیکن لوگوں کے سامنے اپنا موڈ ٹھیک رکھو۔“ جیانے اس کے سرگوشی کی۔

”جانتی ہوں اور میں ٹھیک ہوں۔ وہ آنکھوں میں شاید دھواں اور مصالحہ اڑ کر آ گیا ہے شاید۔“ زئیرا نے کہا تو جیا اس کو واش روم لے گئی جہاں ہمایوں بہانے سے اس کی طرف آیا تھا۔ سبرینہ ٹیبل پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”ہائے زئیرا!“ ابھی زئیرا نے پانی سے منہ دھویا تھا اور آئینے میں دیکھا تو ہمایوں کا عکس وہاں ابھرا ہوا تھا۔ وہ پیچھے مڑی تھی۔

”یو فلرٹ جب تم ایک لڑکی کے ساتھ آئے ہو، تو مجھ میں کیوں انٹرسٹ لے رہے ہوں۔ مجھے تم

جیسے لوگوں کا ٹائیم پاس بننے کا شوق نہیں ہے۔“ وہ بھڑک ہی تو اٹھی تھی۔

”اوہ تم جیلنس فیل کر رہی ہو۔“ ہمایوں اسے کن آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

”مسٹر.....!“ اس سے آگے وہ کچھ بولنے والی تھی مگر ہمایوں نے ہی اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

”ہمایوں.....“ اس نے اپنا نام بتایا تھا۔

”تو مسٹر ہمایوں مجھے اجنبیوں کے ساتھ کسی لڑکی کو دیکھ کر جیلنس فیل نہیں ہوتی۔“ اس بار وہ قہقہہ لگا رہا تھا۔ ”جیسا تم سمجھ رہی ہو ویسا بالکل بھی نہیں ہے۔ وہ میری جسٹ فرینڈ ہے۔“ ہمایوں نے کہا۔

”کیا مطلب جسٹ فرینڈ؟“ زئیرا ابھی تھی۔

”یہ کہ جو جگہ میری زندگی میں تمہارے لیے میں سوچتا ہوں وہ سبرینہ کے لیے بالکل بھی نہیں سوچ سکتا۔“

اب وہ قدرے نارمل ہوئی تھی اور پھر وہ جانے لگی تو اس کا ہاتھ ہمایوں کی گرفت میں آ گیا تھا۔

”چھوڑو ہمایوں! پوہرٹ می۔“ اسے برا لگا تھا ہمایوں کا اس طرح اس کا ہاتھ پکڑنا۔

”سوری۔“ ہمایوں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

”سنو..... میں.....“ ہمایوں نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ وہاں سے جیا کو لے کر چلی گئی۔

”یہ یہاں مری میں کیا کر رہی ہے؟“ سبرینہ ریسٹورنٹ کا گیٹ عبور کر کے باہر جانے والی زئیرا کو دیکھ کر چونکی اور خود سے کہا۔

”زئیرا.....“ پیچھے سے ہمایوں کو اس کا نام لیتے سنا جو دونوں ہاتھ سر پر پیچھے کی سائیڈ پر رکھے ہوئے تھا۔

”ہمایوں کیسے جانتا ہے زئیرا کو مجھے جلد ہی کچھ کرنا پڑے گا کہیں ہمایوں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔“

”مما! یہ سب کیا ہے؟ کیا گھر میں کوئی پارٹی ہے؟“ ہمایوں نے پوچھا۔

”ہاں پارٹی ہے مگر تمہارے لیے سر پرانز پارٹی ہے جس کے بارے میں جان کر تمہیں یقیناً خوشی ہو گی۔“ فائقہ نے کہا تو وہ کچھ الجھ ہی تو گیا۔

”مما! جب سے میں یہاں آیا ہوں آپ مجھے کوئی نہ کوئی سر پرانز دے رہی ہیں۔ اب مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوگا۔“ وہ کچھ انہیں خفا سا لگا تھا۔

”خفا کیوں ہوتے ہو۔ وہ اپنے پیچھے دیکھو تمہارا سر پرانز۔“ ہمایوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سبرینہ آتشی اور گولڈن کام کا نقش ہم رنگ جوڑا اپنے کسی دلہن کی طرح بھی سمن کے ساتھ چلی آرہی تھی۔

اس وقت وہ ایک الگ لڑکی لگ رہی تھی جس کے چہرے پر کئی جھٹکے کرتے رنگ نظر آرہے تھے۔ وہ اس کو دیکھ کر چونکا تھا وہ سوالیہ نظروں سے فائقہ کو دیکھ رہا تھا۔

”بیٹا! اب میں تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ تمہاری آج منگنی ہے سبرینہ کے ساتھ۔“ گویا فائقہ نے اس کے سامنے بم پھوڑا تھا۔

”یہ کیا بیٹا تمہارے چہرے پر خوشی کے رنگوں کے بجائے یہ ابجھن کیسی کیا تم خوش نہیں ہو اس فیصلے سے؟“ فائقہ ہمایوں کے چہرے کا ایک رنگ جاتا ایک رنگ آتا دیکھ کر کہنے لگیں۔

”مما مجھے یہ منگنی نہیں کرنی۔“ ہمایوں اپنے کمرے میں آیا تھا تو فائقہ بھی اس کے پیچھے آگئی تھیں۔ اس نے منگنی نہ کرنے سے انکار کیا تھا۔

”لیکن تم انکار کیوں کر رہے ہو جانتے ہو سبرینہ کے پاپا مسٹر عمیر عرفان کامیاب بزنس ٹائیکون ہیں اور تمہارے پاپا کے ساتھ انہوں نے کروڑوں کی ڈیل کی ہے تمہارے انکار سے ہمیں کروڑوں کا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔“ فائقہ کی بات

صبح ہی سے وہ اکیلا باہر مری کی وادیوں میں گھوم رہا تھا۔ گھر سے نکلتے وقت فائقہ نے اسے شام سے پہلے گھر آنے کو کہا تھا۔ انہیں اس سے ضروری کام تھا۔ کیا ضروری کام تھا اس بات پر ہمایوں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی بس ضروری کام تھا اس کی ماں کو۔ تو وہ جلدی گھر آنے کا کہہ گیا تھا۔ ہلکی ہلکی برف نیچے گر رہی تھی۔ وہ اس موسم سے لطف اندز ہو رہا تھا۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا مگر خیالوں میں زنجیر کا چہرہ آجاتا تو اس حسین موسم میں اس کے ساتھ کی شدت سے طلب اٹھی تھی۔

جب اس کا خیال ہی اس موسم کو حسین تر کر گیا ہے تو اس کا ساتھ تو ہر موسم کو کتنا حسین کر دے گا۔ اس کے دل کا موسم جو اس کے حسین خیال سے خوشنا ہوا تھا۔

جب زندگی کی حقیقت میں وہ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے گی تو زندگی کی ٹھن راہیں دشوار محسوس نہیں ہوں گی۔ وہ اسی کے خیالوں میں گرم موسم کی دلفریبیوں سے محظوظ ہوتا رہا اسے وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ اچانک گھڑی پر نظر پڑی تھی اور بھوک بھی بہت لگ رہی تھی۔ اس وقت ماں کے ہاتھ کا بنا کھانا کھانے کا دل کیا تھا۔ وہ سیدھا ساڑھے پانچ بجاتی گھڑی کو ایک بار پھر دیکھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ گھر کو دیکھا تو چکا چونڈ گھر لاسٹوں سے سجا ہوا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ چند مہمان کی صورت شناسا لوگ اس کو مبارک باد دے رہے تھے وہ متحیر و متحسب سا فائقہ کو تلاش کرنے ادھر سے ادھر گھر میں دیکھ رہا تھا کہ آخر گھر میں ایسا کیا ہو رہا ہے اور لوگ اسے مبارک باد کیوں دے رہے ہیں۔ وہ سوچ ہی رہا تھا تو پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ فائقہ بلیک ساڑھی پہنی ہوئی نفاست سے تیار کھڑی اسے

تھے۔ مسز وقار بڑی خوش اسلوبی سے ان سے ملی تھیں اور مہمانوں سے ملاوٹے وہ عقیقہ اور زئیرا کی طرف آئی تھیں۔ برہینہ دو رکھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔
 ”عقیقہ تم یہاں کیسے، کتنے سالوں بعد ملی ہو۔“
 فائقہ نے اپنی بچپن کی سہیلی کو دیکھ کر انہیں پہچان کر فرط محبت سے کہا۔

”فائقہ! مجھے لگا تھا تم اتنے دولت مند آدمی کے ساتھ شادی کر کے مجھے بھول چکی ہوں گی۔“ ہمایوں ان کے اس رشتے سے بہت خوش ہوا تھا۔
 ”مما! زئیرا انہی کی بیٹی ہے۔“ ہمایوں نے فائقہ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ کتنی میٹھی لگی تھی انہیں یہ سرگوشی۔

”عقیقہ میں تمہاری بیٹی زئیرا کا رشتہ اپنے بیٹے ہمایوں کے لیے مانگتی ہوں، پلیز انکار مت کرنا۔“
 عقیقہ کو سامنے کھڑا وجیہہ سالز کا ہمایوں زئیرا کے لیے بہت بھایا تھا۔ زئیرا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔
 دسمبر کے یہ چند دن اس کے لیے کتنے باعث مسرت ثابت ہوئے تھے۔ برہینہ یہ سب دیکھ کر جل بھن گئی تھی۔

”تمہاری چند دن کی دوستی میرے لیے یہیں تک وبال جان تھی مگر ایک دن میرا بھی آئے گا۔“ زئیرا کے کہے گئے الفاظ اس کے خیالوں میں گونجنے لگے۔
 وہ یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی کہ یہاں مری میں بتائے چند دن دسمبر کے اس کے لیے وبال جان جو بن گئے تھے۔ زئیرا ہمایوں کا ساتھ پا کر بہت خوش تھی۔ یاہر برف کے گالے گر رہے تھے۔
 بہت ٹھنڈ بڑھ گئی تھی اور وہ دسمبر کے ان یادگار لمحوں کو سیلفی میں متد کر گئے تھے اور زئیرا کی مسکراتی سیلفی ہمایوں کے موبائل میں قید ہو گئی تھی۔ دسمبر کے یہ چند دن اس کو بہت خوشی دیں گے اسے آج پتا چلا تھا۔ یہ سوچ کر وہ برفباری کو مسکرا کر دیکھنے لگا تھا۔

☆.....☆

پر ہمایوں انہیں تعجب سے دیکھنے لگا تھا کہ فائقہ کی نگاہیں خود بخود شرمندگی سے نیچے جھک گئی تھیں۔
 ”مما! میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں مجھے لگتا ہے آپ کو میری خوشی کر دڑوں روپوں سے زیادہ عزیز نہیں۔“ ہمایوں نے کہا تو وہ تڑپ اٹھی تھیں اور باہر چلی گئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے سب مہمانوں سے معذرت کر لی تھی جب کہ برہینہ سے انہوں نے کہا تھا کہ وہ ان کی پسند ضرور ہے مگر ہمایوں کی خوشی سے زیادہ انہیں کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔
 فائقہ کی بات پر برہینہ نے انہیں اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کا کہا تھا اور وہاں مزید نہیں رکی تھی واپس چلی گئی تھی۔

☆.....☆

”بیٹا! وہ لڑکی کدھر رہتی ہے اس کا گھر کہاں ہے کچھ تو بتاؤ مجھے۔“ فائقہ اس سے ناشتہ کی ٹیبل پر بیٹھی پوچھ رہی تھیں۔

”مما! زئیرا کی کزن جیا سے پتا چلا ہے۔ وہ آج شام مسز وقار زئیرا کی ممائی دوست کے گھر پارٹی میں آئیں گی۔ وہیں جانے کا ارادہ ہے میرا آپ کو ساتھ لے کر۔“ ہمایوں نے بتایا۔

”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے اتفاق سے مسز وقار نے مجھے بھی اپنی پارٹی میں بلایا تھا۔ تمہیں اور برہینہ کو بھی انہوں نے دعوت نامہ دینے کو کہا تھا۔
 برہینہ کو تو پتا ہے وہ وہاں جائیں گی مجھے تو ڈر ہے تمہیں زئیرا کے ساتھ دیکھ کر وہ اپنے آپ سے باہر نہ ہو جائے۔“ فائقہ کو تشویش لاحق ہوئی تھی۔

”آپ مت گھبرائیں ممائی! میں بہت خوش ہوں پاپا بھی آپ کی طرح میرے ساتھ ہیں آج وہ برہینہ کے پاپا سے برہینہ سے شادی کی بات سے انکار کر دیں گے۔“ ہمایوں بولا تھا۔

☆.....☆

ہمایوں اور فائقہ مسز وقار کی پارٹی میں پہنچے

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ بجٹ 100 دسمبر 2016ء

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



دشمن کے گھر روہ کیا

تھا اور آنے والے کو یوں ٹاٹلی باندھ کر دیکھنے پر مجبور کرنا کہ جیسے آٹھواں عجب ہو۔

آوارہ شام فرحت عباس شاہ کا شام کے بعد کی کھلی تفسیر تھی۔ گلابی اور ڈھنی اور بھے ہوئی تھی۔

”عروش!“ اس نے چمن کے سینے پر قدم دھرے تھے۔ میں نے رخ موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ سر کے بال چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ تازہ شیو کی نیلا ہٹ بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔

وہ میرے پاس ہی چمن پر بیٹھا اور پاؤں کے گرد بازو حائل کیے ارد گرد نہیں، قطبین سے منٹھے کے پتے اڑ کر اس کے قدموں میں بکھر گئے تھے۔

”عروش کیا حال ہے، کیسی ہو؟“ اس نے مجھ سے ایسے دھیمے لہجے میں کہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا پاگل دل دھڑکا تھا۔

”ہمیں کیا ہونا ہے جو ہونا تھا وہ تو تم نے کر ہی دیا ہے مسٹر!“ اس کے ماتھے پر شام ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔

”ہم نے؟“ حیرت و استعجاب کا کورس ہوا تھا۔

”ہم نے کب آپ کی ذات پر کچھ کیا ہے؟“

”بہت ظالم سماج ہے آج کل تو ظلم کرتے ہیں اور مظلوم بن جاتے ہیں۔“ میں نے پائپ پاؤں پر پھینکی تھی اس کی آنکھیں جھلما رہی تھیں۔

”چہ خوب! آپ پر ہم نے ظلم کیا ہے؟“ وہ یوں پوچھ رہا تھا کہ جیسے اسے پتا نہیں تھا مگر یہ سچ تھا کہ اسے

”نہیں یار محبت نے کب، کیسے اور کیوں؟ میرے احساسات کے در پیچ کے اندر جھانکا تھا۔ مجھے شاید سچ طرح یاد نہیں ہاں اسے کالے شلوار قمیص میں دیکھا تھا یا پھر عید کے روز مگر مجھے اس سے محبت تھی۔

کاش کہ جیسے دور کہیں سنان جزیرے میں نو آموز بچے کو مضبوط اماں مل جائے۔ بالکل اسی طرح مجھے بھی چاہیے کہ یہ آسپ مجھ سے نہ ڈرائے۔

مقدس رتوں میں شب کے دم توڑتے پہروں میں اور خاموش ٹھہری ٹیالی دو پہر میں بھی جب میں آزاد ہوتی تھی۔ سوچوں کے وسیع بیاباں میں بہکنے کے لیے۔

میں ابھی سوچوں میں غلطان چمن کو۔ اب کر رہی تھی۔ پائپ ہاتھوں میں تھا بے یوں کھڑا تھا جیسے مشرق کی ہواؤں کا درشن بس چند گھنٹوں میں کیا ہوا اور ان لمحوں میں مقید حقیقتوں کا ادراک ہوا ہو۔ گہرے گہاؤں نے جیسے آسمان کو جا ہی لیا ہو لیکن نہیں یہ سر شام کی بھٹکتی روح کی مانند ایک یاد بھی جس نے مجھے جھجھوڑ دیا تھا۔

میری ڈائری میں وہ گلاب کب کا سوکھ چکا تھا۔ رات کو خوب جم کے بارش ہوئی تھی یوں جیسے برسوں بعد بارش کو حریت ملی ہو۔ سارے گلاب سرحد چمن پر کھل چکے تھے۔ سارے ہزے یوں رکھتے تھے کہ جیسے کسی نے کیونس پر رنگ بکھیر دیے ہوں۔

گلاب کے پھول یوں بہت چھوٹے سے تھے مگر ان کے درمیان ایک بہت بڑا گلاب سر اٹھائے کھڑا

www.paksociety.com

Downloaded From
Paksociety.com

پتا نہیں تھا یا وہ انجان بن رہا تھا۔ بخدا ہی جانے۔
 ”سوچوں پر قابض ہو جانے کے بعد پوچھتے ہو۔
 سانسوں کو تنگی میں قید کرنے کے بعد پوچھتے ہو۔ پیار
 تو ازل سے امر ہے کیا ہونے والا ہے۔ کیا ہوا؟ ہمیں
 پتا نہیں مگر تم نے جو دل پر سلطنت قائم کی ہے۔ اس
 سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ظلم کا لفظ تو بہت چھوٹا پڑ
 جایا کرتا ہے۔“ وہ ہنسا تھا۔ شاید میری باتوں پر یا پھر
 میرے پاگل پن پر۔ وہ دھیرے سے اٹھا اور چلتا ہوا
 گلاب توڑ لایا۔ میرے ریشمی بال میرے رخسار پر
 پھینٹنے لگے تھے۔

وہ میرے پاس آیا اور میرے بالوں کو میٹھا، گلاب
 میرے بالوں میں سجا دیا تھا۔
 ”یہ چاہتیں، یہ قربتیں، یہ دوریاں سب تمہاری
 دین ہے۔ عروش! نہ تم فرحت کو اپنے ساتھ لاتی اور نہ
 ہی میں اس سے یوں پیار کرنے لگتا۔“
 اس کی سانس میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔
 ہوا میں رکی تھیں بنفشے کے پتے اڑ گئے اور بکھرتے
 چلے گئے۔

محبوب کے دہن سے یہ سننا کہ ”مجھے وہ پسند
 ہے۔“ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ کاتب تقدیر اتنا ظالم
 ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ظلم..... ظلم، لکھتے لکھتے خود بھی اس
 قدر ظالم بن جاتا ہے اور ظلم کی سیاہی سے تقدیر کے
 اوراق سیاہ کر جاتا ہے۔

میرا محبوب مجھ سے یہ کہہ کر یہ جاوہ جا ہوا تھا۔ میں
 ہونق بنی بس حق دق سامنے گلاب کی پتیوں کو دیکھ رہی
 تھی۔ فرحت میرے درے میں ہی پڑھتی تھی۔ میں
 چونکہ حفظ کرتی تھی اور وہ تفسیر کرتی تھی۔ ایک دن
 اتفاق سے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ عروش مجھے چند
 کتابیں چاہئیں۔ میں نے ہامی بھر لی تھی اور اسے
 ساتھ لے کر گھر آئی مگر مجھے کیا پتا تھا کہ آج عدن وقار
 آیا ہوگا۔ میں شاید یہ غلطی کبھی نہ کرتی۔ اس نے
 دوپٹے کا کونہ پکڑ کر میرے کانٹا بجا لیا اور اس کے

پاس سے گزرتے ہوئے ہلکے سے آداب کہا تھا۔ اچھا
 یاد آیا تو عدن اس لیے مسکرایا تھا اور اب مجھ سے یہ کہہ
 کر گیا ہے کہ ”یہ تمہاری دین ہے نہ تم فرحت کو ساتھ
 لاتی اور.....“

”خدا تمہیں محبت نہ ہونے دے اگر ہو بھی جائے
 تو یک طرفہ نہ ہو اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو۔“
 ”انہی راستوں نے جن پر بھی تم تھے ساتھ میرے
 مجھے روک روک پوچھا تیرا ہمسفر کہاں ہے“
 ☆.....☆

ہواؤں میں جس کا ظہور آتے ہی فگار من کر لایا۔
 منمنایا، تڑپا تھا۔ شام کا وقت ظہور پذیر ہوا، رات کسی
 باپردہ عورت کی طرح محفل جان بن گئی۔

عدن وقار میرے رشتے داروں میں ہی آتا ہے،
 ان کے والد صاحب میرے والد کے چچا زاد تھے اور
 اس کی ماں میری چچی کی بہن تھی۔ وہ زیادہ ہماری
 حویلی نہ آتا کیونکہ وہ زیادہ اکڑو، کسی حد تک متکبر تھا،
 وہ اپنی شادی شدہ بہنوں کے ہاں بھی بہت کم کم جایا
 کرتا تھا۔

آج چنڈال میں سدا کا اکڑو، اجنبی کشوریوں ہنس
 رہا تھا کہ بس دل بیٹھا سو بیٹھا۔
 آنکھوں میں آنسوؤں کی محفل خن ٹھک کے جمی اور
 ایک آنسو عین میری ہتھیلی کے وسط پر آگرا اور پھسلتا چلا
 گیا۔ ہم انسان بھی کبھی بھی ان یادوں سے اتنے بے بس
 ہو جاتے ہیں کہ شاید بنی اسرائیل بھی فرعون سے اتنے
 تنگ نہ ہوں۔ مجھے یاد آیا۔ وہ جاہن کے سائے تلے۔
 ”تم نے کہا اس سے؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔
 میں نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

”دراصل عدن! وہ کچھ احترام زبردستی رہی ہے۔ تم
 کچھ وقت انتظار کر لو۔“ میں نے وضاحت دی اور
 میری وضاحت اپنی ”اوقات“ تلے دب گئی۔ وہ شاید
 مضطرب ہوا تھا۔ ”لیکن عروش۔“

”اس میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ شاید یہ ایک طرفہ

محبت ہو (جیسے کہ میری تھی) اور ایک طرفہ محبتیں اتنی طاقتور نہیں ہوتیں۔ لفظوں میں وہ حدت نہیں ہوتی جو مقابل کا دل پگھلا سکے۔“

ٹھک سے میری سرمہ آگئیں آنکھوں میں ایک آنسو چمک اٹھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ چند ثانیے چاند بنا مسکراتا رہا۔

”لگتا ہے تمہیں تجربہ بہت ہے۔“ اس نے جامن کے پیڑ کے تنے پر دایاں ہاتھ نکایا اور بایاں ہاتھ کمر پر رکھ کر شرمیلیں مسکرائیں اچھا لگتا رہا۔

”تجربہ بھی اور مشاہدہ بھی۔“ میں نے رونے والے جذبے پر مسکراہٹ غالب کرواتے کہا تھا۔ ایک لخت وہ سیدھا ہوا۔ اس کی سانسیں ہموار نہیں تھیں۔ آنکھوں میں تحیر اُٹھ آئی۔

”تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے؟“ وہ دم سادھے استفسار کر رہا تھا۔ دل فگار پر نمک چھڑکی، کیسے ظالم ہوتے ہیں یہ محبوب بھی، بہر و پیا۔

”ہاں۔“ میں نے رخ موڑا۔ کہیں وہ میری لبالب بھری آنکھیں نہ دیکھ لے۔ وہ میرے روپرو آنکھڑا ہوا۔

”کس سے؟“

”اس سے جو مجھے اس قابل نہیں سمجھتا۔“ میری بونگی وضاحت خاصی مشکل میں ڈال گئی تھی مجھے۔ ابا بلیں یوں ہمہ تن گوش ہو گئیں کہ محبت کی کھائیں آج دہرانے والی تھیں۔ وقت ٹھہر گیا۔

”کیوں؟“

”وہ اس کیوں پرکان نہیں دھرتا۔“

وہ ہنسا، اس کی ہنسی میں عربی سازوں کی دھن تھی۔ وقت دھول اڑاتا چلا جاتا ہے۔ میری زندگی میں جب پہلی بار ستارے ٹوٹے تھے اور میرے من میں سمٹ کر چھا گئے اور پھر یوں برے ٹوٹ کر کہ دل کو ہولہان کر گئے۔

☆.....☆

پنڈال کی ہنسی رونق، جلت رنگ اور نو خیزیاں عروج پر تھیں، خیالوں کی دنیا میں کسی سرمست گھوڑے پر محو سفر ہم تھے اور پھر ام کلثوم نے اس گھوڑے کا لگام یوں کھینچا کہ گھوڑا زور سے ہنہنایا کر لایا۔

”آپ یہاں اتنی خاموش کیوں بیٹھی ہیں۔ وہاں پنڈال میں عدن آپ کی راہ تک رہا ہے۔ ویسے بھی شادی پیار کا گھر ہے اور آپ یوں اکیلی، تنہا اور خاموش بیٹھی ہیں۔ یوں تو اچھا نہیں لگتا۔“ جاپانی ریل گاڑی کی طرح چلتی زبان کو یکدم بریک لگا تھا۔ میں اپنا کچے سیب کے رنگ کا فراک کا کونا پکڑتی، مستانی چال چلتی وہاں سے اٹھ گئی۔

ام کلثوم نے اپنا پراندہ لہرا کر پیچھے کو ڈالا۔ ہونہہ پاگل بس یہی رہ گئی تھی شیر بانو اور میر بننے کے لیے۔“

عدن ہمیشہ سے میرا احترام کیا کرتا تھا۔ میں ان دونوں کی قاصد تھی۔ وہ فرحت جو بہت احتراز برت رہی تھی۔ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ سچ ہے کہ محبت کا آسیب بھی کسی کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ اس نے مجھوں کو تہی دست نہ چھوڑا تھا۔ تو ہم کیا ہیں؟

شام کے بعد آسمان پر اکا دکا تارے جھللا رہے تھے۔ چاند معتبر ہر آنگن میں اپنی چاندنی گرا رہا تھا۔ پھر دفعتاً دودھیا سحاب کے ٹکڑوں نے معتبر چاند کو اپنے اوٹ میں چھپا لیا تھا۔ وہ میرا ہراز تھا اور یوں سراہ بزم میں چھوڑ کر داغ بے وفا لی دے گیا۔

”چاند! میرے ہراز ہو کر بھی اسے نہ بتا سکا کہ عروش تنویر تمہیں دل سے چاہتی ہے۔ اس ایک بات پر میں کتنا روئی تھی۔ تمہارے دامن پر محبت کے کتنے داغ ہیں، بس ایک داغ میرے لیے بھی لگا دو اس کے دل پر۔ محض ایک بار بس ایک بار۔“

چاند نہ نکلا، سحاب چھائے رہے، آنگن میں اب ہلکی ہلکی سی بوند باندی شروع ہوئی، جیسے چاند سے چاندنی روٹھ گئی اور بارش کی بوندیں چند لمحے مستعار لے کر بادشاہت قائم کرنے لگیں۔ آہ! یادوں کی

بارات میں ایک یاد نے کھلکھلا کر ہر گوشہ کی تھی۔
”اس نے نیلا کاٹن جھاڑا۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے ہماری محبت کو پروان چڑھایا۔ دل کے رستے دشوار بہت تھے مگر ان راستوں پر کسی کی ہمسفری سہل کر دیتی ہے۔ محبت تو اتنی سہل نہیں مگر ناممکن بھی نہیں ہے۔ تمہارا ساتھ اس دشوار راستوں پر میرے لیے ایک گھنا سا یہ بن گیا تھا۔ تمہارا شکریہ۔“ میں نے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔ بے ترتیب ہوتی سانسوں کو ہموار کیا۔

”محبت کے ہم بھی قائل ہیں عدن! اور ان راستوں پر جو بہت سوں کے روح اور جگر چھلنی کر چکا ہے۔ کسی دو دلوں کا ملن کروانا۔ دنیا کی آنکھوں کے سامنے معتبر کیے دیتا ہے۔“

”عروش! بہت شکریہ۔“ یہ کہہ کر وہ جانے لگا تھا۔ معارف کا مڑا مسکرایا۔

چند منٹ بعد وہ آیا اور مجھے ایک گفٹ پکڑا کر یہ جا وہ جا ہوا تھا۔ اس میں شہرہ آفاق ناول۔ ”خدا اور محبت تھا۔“ میں نے رخسار پر بہتے آنسو چن لیے۔

☆.....☆

عدن وقار اور فرحت کی ملاقاتیں کروائیں۔ کئی بار اپنی حویلی میں بلوا کر اپنے کمرے میں بٹھایا۔ یہ راستے ہموار کیے۔ پھر عدن نے ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ تم میری محبت کی امین ہو۔ رات گئے میں اس جملے کو یاد کرتے روتی رہی۔ سبز گول درتچے کے پار چاند کو دیکھتی رہی۔

وہ جب روٹھتی، عدن منہ لٹکائے میرے پاس چلا آتا۔ میں سیدھا فرحت کے پاس جانی، اسے منانی، اسے سمجھاتی مگر وہ خاموش نظروں سے مجھے دیکھتی۔ میں الجھ جانی وہ یوں دیکھتی کہ جیسے میں کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں نے تو پہلی عروش تنویر کو بھی چھپا لیا تھا۔

گلابی آنچل، گلابی شام میں ادا اس لگ رہا تھا۔

فرحیت مجھ سے کہہ رہی تھی اور میں سن ہی اسے سن رہی تھی۔ ساعتیں، ساعتوں کے پردے چاک کرنے لگی تھیں۔

”عروش! میں سمجھتی تھی کہ محبت ہر کسی کو مل جاتی ہے جیسے کہ مجھے مل رہی ہے اور اس خیال کو ہنس کر رد کیے دیتی کہ آیا محبت بھی کسی کی نہیں ہو سکتی۔ ہونہ۔“ وہ درتچے کے پار نظر کے دسترس میں آنے والے ستاروں کو دیکھ رہی تھی جو کہ محبت کے ٹوٹے ہوئے ستارے تھے۔

”ایک پل، ایک لمحہ محبوب کو کسی دوسرے کے ساتھ دیکھ کر دل پر کیا بیٹتی ہے؟ اپنی محبت مسخ کر کے محبوب کے ہاں کو معتبر رکھنا کیسے ہواؤں کو رکھنے پر مجبور کرتی ہے؟“ عروش کیسے؟ کیسے ہوتا ہے؟

وہ میرے مقابل کھڑی تھی۔ انگارے جیسے سیناں، تپش یوں پھوٹی تھی کہ ہر ذی روح کو بہسم کر دیں۔ میں نے تھوک ٹٹلا۔ مسکرائی۔

”اتنی مشکل باتیں فرحت! مجھے مشکل میں ڈال رہی ہیں۔“ وہ لب بھیجنے آگئے ہوئی۔

”ادا کاری مت کرو عروش۔“

”میں ادا کارہ نہیں ہوں فرحت! میں بس خاموش تماشا بن کر محبت کا کھیل دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”ادا کارہ نہیں مگر بن رہی ہو۔ مسکراہٹ مصنوعی ہے تمہاری، تمہارا تنفس پھول رہا ہے۔ دل کی دھڑکن بے ترتیب ہے، غزال آنکھوں میں سہم ہے۔ عروش مت بھولو۔“

”مجھے نہیں پتا۔ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔“ میں صاف بکھر گئی۔ گلابی شام کا آنچل دھیرے دھیرے سرکنے لگا تھا۔ ٹپ..... ٹپ..... ٹپ شربتی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

”فرحت! تم رو رہی ہو؟“ میں نے مضبوطی سے اس کا کندھا تھاما۔

”ناں، ہاں عروش! میں رو رہی ہوں، تمہارے

جا کر میری والدہ سے کہیے۔“ میں نے مسکرا کر کہا تھا کہ یہ ہماری باتیں نہیں ہیں اور ویسے بھی یہ باتیں بزرگوں کے منہ سے ہی اچھی لگتی ہیں۔ بزرگ جو چاہے وہ کر سکتے ہیں۔“ سن کر اس نے منہ لٹکایا اور کہا تھا۔

”میری والدہ سے تو کہہ سکتی ہیں نا۔“ پھر طے یہ پایا کہ اگلی جمعرات کو میں ان سے بات کروں گی۔ پروگرام کے عین مطابق میں ان کی والدہ سے ملنے گئی۔ ان سے ان کے صاحبزادے کی خواہش جو ابھی ابھی جنون کا روپ دھار چکی تھی ظاہر کی۔ ان کی والدہ نے بخوشی اس بات کا عندیہ دیا کہ معاملہ صاف ہی سمجھیں۔ یہ بات جب میں نے عدنان کو سنائی تو وہ باقاعدہ ناچنا شروع کر دیتا اگر جو میں اس کو یہ کہہ کر نہ روک لیتی۔

”اب بھی معاملہ پنڈولم کی طرح ہے مسٹر!“ اور مسٹر کا فشار خون یوں تیزی سے چڑھا کہ شرط لگی اگر یہ معاملہ صاف یعنی مثبت ہوا تو میں آپ کو آرگائی میں دسمبر کی ٹھٹھرتی سردرات میں ان تارکول بچھے سنسان سوئے ہوئے سڑکوں پر تانگے میں بٹھا کر سیر کرواؤں گا۔ اور پھر ہوا یوں کہ عدنان کی والدہ کو او کے کا اشارہ ملا۔ رسم پنجائی منگنی رچائی اور اگلے دو ماہ میں اسے خوب صورتی سے قصر وقار لانا تھا۔ دسمبر کی ٹھٹھرتی اور سنسنائی شب کو وہ مجھے ان سوئے سنسان بچھے تارکول سڑک پر گھماتا رہا۔ ایک آئس کریم پارلر سے بصد اصرار آئس کریم کھلائی۔

کل ہی تو ان کی مہندی ہوئی تھی۔ اب یعنی آج باراست محبت تھی۔ میں نے دو دلوں کو ملانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں ابھی فرحت کی خواب گاہ میں کھڑی اس کے بالوں میں نہیں لگا رہی تھی۔ وہ مکمل طور پر خاموشی کی چادر کی دبیز کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ ”فرحت!“ دفعتاً خاموشی کی چادر کو میں نے سرکایا۔ اس نے رخ موڑ کر مجھے دیکھا۔

”تم اداس ہو؟“ سرخی ملی رخسار دھک اٹھے۔

ظرف پر، تم عدنان سے محبت کرتی ہو اور وہ مجھ سے اور تم نے ہم دونوں کو یکجا کیا، کیوں؟“ میری دھڑکن ختم کر پتھر کی بن گئی۔

”کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں چھوٹی ہوں۔“
”تو کیا چھوٹوں کے سینے کے اندر دل اور دل کے اندر ارمان نہیں ہو سکتے؟ کیا ان کے معصوم اور کم سن دل میں محبت نہیں پنپ سکتی۔“ وہ چیخ اٹھی۔
”فرحت! چھوڑو یہ بے کاری باتیں۔“

”کیوں چھوڑوں۔“ یادیں سمٹ گئیں اور جھولی میں گرنے لگی تھیں۔ خوش شکل پریاں سفید لباس پہنے گنگنہ گنگنہ گھونسنے لگی تھیں۔
آج مہندی کی رسم ہو چکی تھی۔

☆.....☆

دریچوں پر سرخ حریری پردے لٹکائے گئے تھے۔ جملہ عروسی میں جہازی ساز بیڈ کے پائنتی پر فرحت بیٹھی خالی خالی نظروں سے خلا میں گھور رہی تھی۔ ان کی والدہ نے مجھے بلایا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ فرحت اکیلی ہے اور یوں بھی آپ ان کی اکلوتی پکی والی سہیلی ہیں۔ سو برائے مہربانی کر کے ذرا ہمارے گھر کی راہ لیں۔ میں اپنے محبوب کی دلہن کو سجا رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے دل کے رستے نکلتی آہوں کو دباتے ہوئے فرحت بہت خاموش تھی۔ ان دنوں جب خزاں نے کوچ کرنے کی ٹھانی۔ اداس کرغیں مسکرانے لگیں تو بہار بھی جھوم اٹھی۔ پرندوں کے کھوکھلے چونچوں میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔

موسم بہاراں تھا۔ دل خزاں پلٹ ہی رہا تھا۔ خزاں کے عادی اپنے جون میں واپس نہیں آتے۔ آنا چاہ ہی نہیں رہے ہوتے۔ جب ساری چاہتیں ہی مسخ ہو گئی ہوتی ہیں۔

”عدنان وقار! جو فرحت سے سچی محبت کرتا ہے۔ اس محبت کو شادی کی مقدس سیڑھی چڑھانے کے لیے سیدھا میرے پاس ہی آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آپ

”نہیں ہوں گی؟“
 ”اس میں عدن کا کوئی تہ نہ نہیں ہے۔“ میں نے
 وقتی طور پر اس کا دفاع کیا تھا۔
 ”مجھشتی ہوں خوب تمہاری ان اداؤں کو۔“ فرحت
 نے خفگی سے کہا۔

”دراصل فرحت! میں اس سے تب محبت کرنے
 لگی تھی۔ جب تم اس سے کتابیں مانگنے آتی تھیں۔
 بلکہ اس سے بھی پہلے مگر وہ تم کو.....“ فرحت نے
 درشتگی سے میرے الفاظ کاٹے اٹھی اپنا لباس سنبھالتی
 ماتھے پر ہل لیے ناک سکڑ کر بولی۔
 ”مگر وہ تم کو چاہتا ہے اور محبوب کی خوشی وراصل محبت
 کی جیت ہے۔ یہی کہنا چاہتی ہو تم ہماں؟“

☆.....☆

عدن شیروانی میں بہت خوب صورت لگ رہا تھا
 یونانی دیوتا سے ٹکر لینے کی حد تک۔ چاند معتبر صبح کی
 رنگینیوں میں کہیں ڈوب چکا تھا۔ محبت کی دیوی یوں
 جیسے آج مغموم مغنیہ بنی نغمہ سرائی میں گن گئی۔
 دلہن کی طرح سچی گاڑی سفید گیٹ کے سامنے
 آرکی تھی۔ باراتیوں کی ”جم عفیر“ شورا“ کرتا عدن
 کی دلہن کو اپنے ساتھ میں لینے آگئے تھے۔ زرد آنچل
 کے سائے میں، میں دونوں شانوں سے مضبوطی سے
 تھامے فرحت کو اونچے پھسلواں سنگ مرمر کے
 برآمدے کے وسط میں رکھے گئے صوفے تک لے
 جا رہی تھی۔ کتنی صوبنے پر ساحر بیٹھا ضبط کے صلیب
 پر لٹکایا گیا تھا۔

دل پر پڑی فسوں گری آہ!

کہتے ہیں کہ عاشق اور معشوق اس کچے دھاگے کی
 طرح ہوتے ہیں جس کا سراسر ایک ظالم شخص کے ہاتھ
 میں ہوتا ہے۔ وہ اس دھاگے کو مضبوطی سے یا ڈھیلی
 چھوڑنے میں گریز کرتا ہے۔ اگر مضبوطی سے تھامے تو
 دھا کہ ٹوٹ جاتا ہے اور اگر ڈھیلی چھوڑ دیں تو ہوا اس
 پر قابض ہو جاتی ہے اور دور کہیں اڑا لے جاتی ہیں۔

☆.....☆

لبالب بھرے نینوں کے کٹوروں میں سے کسی
 آنسو کو یہ اختیار نہ ملا تھا کہ میرے دامن میں گر کر
 میرے دامن کو بھگو دیں۔ آنسو میرے صبر کی توہین کرنا
 نہیں چاہتے تھے۔ لاج رکھ لی تھی۔

چائے کے بعد علاقائی رسم ہوئی اور قرآن کے
 سائے تلے فرحت کو اس کے ساتھ بٹھایا گیا۔ گاڑی
 اشارت ہوئی اور فرحت کی والدہ ماجدہ نے آنکھوں
 کے اشارے سے کہا۔ ”محترمہ! آپ کی راہ دیکھ رہی
 ہیں۔“ میں بھاگم بھاگ پینچی۔ اس کا سنگار آنسوؤں
 نے صاف کر دیا تھا۔

”عروش! بانو قدسیہ کہتی ہے کہ عشق انسان کو
 پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ اس عشق نے تمہارے مان،
 جذبوں کی صداقت کو پرکھ لیا کہ اہل وفا کبھی بھی کسی
 کے دامن کو بے وفائی کے داغ سے داغدار نہیں
 کرتے۔ یہ خصلت عشق کی افتخار ہے۔“ گاڑی
 اشارت ہوئی۔ گلی کے کٹڑے سے گزر کر میں اسے دیکھتی
 رہی۔ میں نے محبوب کو اس کی محبت دلائی۔ میں بہت
 خوش ہوں بس پتا نہیں کیوں یہ گرم گرم آنسو میرے
 رخسار پر پھسل رہے ہیں۔ پتا نہیں کیوں؟ میرا
 گریبان بھگور رہے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ردا ادا مجست 108 دسمبر 2016ء

زندگی بھولیں، جس جیت ٹھونٹھو

”سنوٹ کے۔“

”دیکھئے باجی میں آپ سے تو بالکل بات ہی نہیں کر رہا، میں تو ان سے مخاطب ہوں، اچھا خاصا فٹ پا تھ پر



کھڑا تھا، گاڑی مجھ پر چڑھانے کا ارادہ تھا کیا۔
”وہ اصل میں غلطی ہو گئی سوری۔“

نیل فرنے جھٹ معذرت بھی کر لی کیونکہ شہوار سے مسلسل باتوں میں اس کا پاؤں ایکسیلیٹر پر زیادہ ہی زور سے پڑ گیا تھا، اگر بروقت بریک نہیں لگاتی تو زبردست نقصان ہوتا۔

وہ تو اللہ نے بچا لیا، نیل فرنے شکر ادا کیا۔
”لگتا ہے آپ کو کسی نے یہ نہیں بتایا آپ ڈرائیونگ بہت بری کرتی ہیں۔“ حمزہ مسلسل شرمندگی کے ساتھ اسے زچ کئے دے رہا تھا۔

”ارے لڑکے تم کیا اب ناک سے لکیریں نکلاؤ گے، سوری کر تو لیا ہے۔“ شہوار چڑ گئی۔
”ایسے تو سوری قبول نہیں کروں گا۔“ حمزہ نے فرنٹ ڈور کھولا۔

شہوار نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔



شہوار

”دیکھیے باجی آپ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ جائیں، میں ادھر بیٹھوں گا۔“
”کس لئے؟“ شہوار نے اپنی جگہ بیٹھے ہی کہا۔

”اس لئے کہ میری بانٹک کا ٹائر پچھر ہو گیا ہے اور اسے بننے میں ٹائم ہے، میں گھر جانا چاہتا ہوں آپ کو مجھے
ڈراپ کرنا پڑے گا، ارے اترئیے یہاں سے۔“ حمزہ نے اب ڈراڈپٹ کے کہا۔

نیل فر تو کچھ بول ہی نہیں رہی تھی وہ سب جانتی تھی وہ کون ہے۔
”دیکھو اگر تمہیں اپنے گھر جانا ہے تو تم یہ گاڑی لے جاؤ ہم دونوں رکشے سے گھر چلے جائیں گے۔“
نیل فر شپٹا گئی گھبرائی ہوئی ہوگی وہ اگر اس کے ساتھ چلی گئی تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔

”جی میں اور آپ کی گاڑی لے جاؤں، بے وقوف نظر آتا ہوں، پیچھے سے آپ دونوں پولیس میں گاڑی
چوری کی کسپین کر دیں گی اور میں تو بے موت مارا جاؤں گا۔ میرے باپ کو نہیں جانتی ہیں وہ اپنی عزت کے لئے
کیا کچھ کر جاتے ہیں۔“ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

”میں ایسا بالکل نہیں کروں گی۔“ نیل فر نے یقین دلایا۔
”نہیں جی آپ مجھے ڈیفنس چھوڑیں۔“ اس نے پورا ایڈریس اسے سمجھایا۔
”گاڑی چلائی مجھے آتی بھی نہیں ہے۔“ اس نے بتایا۔

”واہ! آپ کے والد محترم نے بڑی نگہبازی آٹومینک گاڑی دلوائی ہے۔“
وہ اس کی خوبصورت گاڑی کو ستائشی انداز میں دیکھ رہا تھا۔

نیل فر کے ماتھے پر پسینے کے قطرے واضح ہو رہے تھے، وہ حمزہ کو جانتی تھی کون ہے اور اگر وہ یوں وہاں چلی گئی
تو؟ اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

”میں اتنی لانگ ڈرائیو نہیں کر سکتی۔“ اس نے قدرے توقف کے عذر پیش کیا۔
”بس غرے شروع ہو گئے۔ سوچ لیں میں پھر پولیس تک جاسکتا ہوں۔“ حمزہ نے ہنسی روک کے ڈرایا۔
حمزہ کا سیل اسی وقت بیپ دینے لگا۔

”ای بس آرہا ہوں اور ہاں بڑی زبردست پروجیکشن کے ساتھ۔“ وہ اپنی ماں کو بتا رہا تھا۔
نیل فر اور شہوار ایک دوسرے کو تذبذب میں دیکھنے لگیں۔

”مام! میں آکے بتاتا ہوں، اوکے یو۔“ اس نے بات کر کے اپنا سیل بند کیا۔
”جلدی چلیے میری ماں پریشان ہو رہی ہے۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔

نیل فر کو مانتے ہی بن رہی تھی، گاڑی اشارٹ کر دی تھی، دل کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا
کوئی طوفان آگیا ہو۔

حمزہ اسے راستہ بتاتا جا رہا تھا اور وہ چپ چاپ ڈرائیو کر رہی تھی۔ پنک کپڑوں میں اس کی رنگت سفید پڑ گئی
تھی، بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا ہوا تھا۔

”بس بس روک دیں۔“ وسیع و عریض رقبے پر پھیلے بنگلے کے آگے گاڑی رکی تھی، ایریا ایسا تھا اور شام کا ٹائم تھا
پھر بھی یہاں سناٹا تھا۔

فرنٹ ڈور سے نکل کے اس نے نیل ڈور پر ہاتھ رکھا، گیٹ آٹومینک تھا، کھل گیا، چوکیدار نے آگے بڑھ کے
گیٹ کو اور کھولا۔

”آپ لوگ بھی آئیے۔“

”نن... نہیں ہم نہیں آ سکتے۔“

نیل فر تو وحشت زدہ ہو گئی، نیم پلیٹ پر شکیل احمد دیکھ کر تودہ اور ہی احساس میں چلی گئی۔
”ارے میری ماں سے تو مل کے جائیے۔“ وہ بضد تھا۔

پچھلے سے کسی گاڑی کے ہارن پر نیل فر نے ناگواری سے مڑ کے دیکھا۔

”اوہ ہاں اپنے برادر بھی ادھر ہی ہیں۔“ حمزہ نے فہر کو دیکھا۔

”آئی نکلیے۔“

”میں چلوں گی۔“

وہ گاڑی کو راستہ دینا چاہتی تھی، سمجھ گئی تھی اسی گھر کے لوگ ہیں۔

”بار حمزہ! گاڑی اندر کیوں نہیں جا رہی۔“

فہر نکل کے باہر آ گیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی نیل فر کو دیکھ کر ہزار والٹ کا کریٹ لگا اور نیل فر بھی وحشت

زدہ ہی ہو گئی، شہوار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا، دونوں کی ہی حالت عجیب ہو گئی تھی۔

فہر کچھ بولنا ہی چاہتا تھا مگر آواز منہ میں ہی دبالی۔

نیل فر نے نگاہ چرائی کیونکہ اتنی مہنگی ترین گاڑی کو فہر اس جھامیہ نگاہوں سے ہی دیکھ رہا تھا۔

نیل فر نے گاڑی اشارٹ کی مگر حمزہ تو آگے ہی آ گیا۔

”کہاں چلیں محترمہ! اپنا نمبر وغیرہ دیں۔“

”ارے تم تو ہماری جان کو ہی آگے ہو جانے دو اب تو۔“

شہوار نے ہی سچویشن سنبھالی کیونکہ نیل فر تو بولنے کے قابل ہی نہیں تھی۔

”یہ کون؟“

”ارے فہر بھائی یہ محترمہ تو مجھے ٹھوکنے والی تھیں میں بھی جان کا عذاب بن کے ان کو یہاں تک لے آیا۔“

”اب جان کا عذاب بن کے ان کے گھر تک بھی جاؤ۔“

فہر کو اپنی پڑی تھی کسی طرح گھر بھی پتہ چل جائے۔

”گھر ان کا پتہ ہے مجھے۔“

نیل فر تو اچھل گئی اور پھر اس نے گاڑی اشارٹ ہی کر دی۔ حمزہ کو بھی ہنسا پڑ گیا وہ یہ جاوہ جا ہو گئی۔

”شہوار وہ فہر بھی وہاں آ گیا، اگر اس وقت ابو ہوتے یا پھر یہ حمزہ زبردستی اندر لے جاتا تو کیا ہوتا۔“ نیل فر کا

خون ہی خشک ہو گیا تھا۔

”میں تو اوپر والے کا کرشمہ دیکھ رہی تھی، تمہیں وہاں تک بھی لے گیا، اے اللہ! اسے اس گھر میں بھی پہنچا دینا۔“

شہوار نے ساتھ ہی دعا بھی کی۔ دونوں پورے راستے پھر خاموش ہی رہی تھیں۔

☆.....☆

”ای! ان دونوں کی شکلیں دیکھنے والی تھیں۔ ایسی خوفزدہ ہو گئی تھیں کیا بتاؤں۔“ حمزہ سب کو ہی ان دونوں

کے بارے میں بتا رہا تھا جبکہ فہر کو یہ تسلی تھی حمزہ کو ان کے گھر کا پتہ ہے۔

مگر فہر کا دماغ اس بات پر الجھا ہوا تھا سلام ڈرائیور کی بھانجی اتنی مہنگی ترین گاڑی میں تھی، اس دن تو شاپنگ

مال میں اتنی ڈریپنگ سی لگ رہی تھی اور آج تو وہ اتنی پر اعتماد انداز میں ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ڈرائیونگ کر رہی تھی۔
 ”فہر بیٹا! تم کچھ لے کیوں نہیں رہے۔“ ثریا نے اس کے آگے سینڈویچ کی پلیٹ رکھی۔
 ”جی ماما لے رہا ہوں۔“

”فہر بھائی! کیا بات ہے اس لڑکی کے حسن کے بیچ و خم میں کھو گئے ہیں۔“ حمزہ نے معنی خیز اور شرارتی لہجے میں مسکرا کے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ جھینپ گیا۔

”کیا وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔“

ثریا کو بھی تجسس ہوا، وہ جیسر کھسکا کے بیٹھ گئیں۔

فہر نے حمزہ کو گھورا اور سینڈویچ اٹھا کے کھانے لگا، واقعی وہ نسل فر کے خیالوں میں ہی کھویا ہوا تھا۔

”امی! آپ کو بتایا تو ہے خوبصورتی میں یکتا۔“

”میک اپ کا کمال ہوگا۔“ وہ مسکرا کے گویا ہوئیں۔

”ای وہ میک اپ نہیں کرتی ہیں، انتہا سے زیادہ ڈریپنگ ہی لگتی ہیں مگر میں یہ دیکھ کر حیران ہوں براؤنڈ گاڑی

ڈرائیو کر رہی تھیں، مجھے تو رشک آ رہا تھا۔“

”تمہارے ابو بھی تمہارے لئے کوئی کی نہیں چھوڑتے ہیں۔ گزشتہ ماہ اسپورٹس بائیک تمہیں گفٹ تو کی ہے،

دوسروں کو دیکھ کر کب سے رشک کرنے لگے۔“ ثریا نے اس کے سر پر چیت لگائی۔

”تمہارے ابو جب ضرورت محسوس کریں گے تمہیں گاڑی دلوادیں گے۔“

”مامی! میں اب چلوں گا۔“

”ارے بیٹا بیٹھو، آتا ہی ہو گا ضیاء بھی اور تمہارے ماموں بھی۔“ ثریا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

فہر کے دل میں تو بے چارے بڑھ گئی تھیں، نسل فر اس کے اتنی قریب سے گزر گئی تھی وہ کچھ بھی نہیں کر پایا تھا۔

”ای! فہر بھائی لگتا ہے واقعی اس لڑکی کی زلف کے اسیر ہو گئے ہیں۔“

”زیادہ فضول نہیں ہانکو۔“ اس نے حمزہ کے پاؤں پر پاؤں مارا تھا۔

”لگتا ہے لڑکی خوبصورت ہے میرے بیٹے نے تو اس کے متعلق کافی کچھ بتایا ہے۔“

”مامی! آپ اس کی فکر کریں ابھی میں کا بھی نہیں ہے اور لڑکیاں پسند کرنے لگا۔“

”جی نہیں مجھ سے بڑی ہیں، میں تو آپلی یا باجی بولتا ہوں اور یہ میرا اصول ہے اپنی سے بڑی لڑکی کو آپلی باجی

ضرور بولتا ہوں۔“ اس نے چائے کے سپ لئے۔

”فہر بھائی! مزے کی بات بتاؤں، وہ جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھیں ان کی وہ دوسری والی جانے بہن تھی یا

فرینڈ وہ تو میرے باجی کہنے پر لڑنے ہی لگی تھیں۔“

فہر اور ثریا ہنسنے لگے تھے، کچھ ہی دیر میں ضیاء اور شکیل احمد بھی آگئے تھے، فہر نے دونوں سے ہی سلام و دعا کی تھی۔

”ہم تو بس نکلنے ہی والے تھے آپ بھی آگئے۔“

زہرہ اندر مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں، وہ آج فہر کے ساتھ چلی آئی تھیں۔

”پھپھو! آپ کو بھی فرصت مل گئی۔“ ضیاء نے خوش ہو کے کہا۔

”تم بھتیجیوں اور بھائی بھادج کو تو فرصت نہیں ایک ہی بہن ہے اس کی خبر خیر ہی لے لیں۔“ وہ شکوہ کرنے لگیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”پھپھو! صاف کہیں ہماری امی منع کرتی ہیں کیونکہ نند بھوج کا بیرو شروع سے ہی چلتا آ رہا ہے۔“
 ”فضول بکواس نہیں کیا کرو۔“ ثریا نے ایک زوردار پھٹراس کی پشت پر لگایا تھا۔
 ”اوئی امی اتنی زور سے مارا ہے۔“ وہ منہ بسورنے لگا۔ سب ہی ہنسنے لگے تھے۔
 ”اور زہرہ، فہر کی شادی کب کر رہی ہو۔“

”یہ ہاتھ ہی نہیں آ رہا، میں نے تو یہ تک کہہ دیا ہے کوئی اگر پسند ہو تو بتا دے۔“ وہ فہر کو دیکھنے لگیں جو مسکرا رہا تھا۔
 ”پھپھو! ابھی جولا کی بھی آپ بھی دیکھ لیتیں نا جھٹ فہر بھائی کے لئے پسند کر لیتیں۔“
 ”کون سی لڑکی؟“ شکیل احمد نے بھی پوچھا۔

”آپ کے صاحبزادے کو آج پھر وہی لڑکی ملی تھی اسے ڈرا دھمکا کے اسی کی گاڑی میں گھر تک آیا ہے۔“ ثریا نے پھر تفصیل سے بتایا۔

”شریف لڑکی تھی جو شور نہیں مچایا اور نہ وہ دونوں اسے مل کر پیٹ بھی سکتی تھیں۔“ ضیاء نے ہنس کے کہا۔
 ”فہر بھائی آپ تو کچھ کھوئے کھوئے ہو گئے ہیں۔“ حمزہ مسلسل اسے فوکس کئے ہوئے تھا۔
 وہ جواب میں جھینپ کے اسے گھورنے ہی لگا۔

”پھپھو! ان کی سچ میں شادی کر دیں۔“
 ”مائی! یہ میرے ہاتھوں بہت پٹے گا۔“

فہر ایسے چیخنے لگا جیسے اسے مارنے کے لئے وہ اندر کی طرف بھاگ گیا۔
 ثریا اور شکیل احمد نے انہیں رات کے کھانے پر روک لیا اور پھر فون کر کے مہا دا اور سجاد احمد کو بھی بلایا تھا۔ فہر اور ضیاء تو باہر ڈرائیو پر نکل گئے تھے۔ فہر نے ضیاء سے بھی نیل فر کے متعلق کچھ شیئر نہیں کیا تھا وہ ویسے بھی سیدھے طریقے سے اپنا رشتہ بھیجنا چاہتا تھا۔

☆.....☆

”بھلا شخص ہے، راہ چلتے لوگوں کی بھی مدد کرتا ہے۔“
 امی تو اس دن سے ڈاکٹر شہیر کی تعریفیں کرتے نہیں سکتی تھیں، رمضانہ کوئی بھی کمٹنس پائیں نہیں کرتی تھی مگر اس وقت اسے ناگوار ہی گزر رہا تھا، وہ جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی اور اپنی وین کا انتظار کر رہی تھی۔
 ”امی بس بھی کریں ایک دفعہ کی ملاقات میں ہم کسی کے متعلق نہیں جانتے۔“ رمضانہ نے تیز لہجے میں کہا۔
 ”تمہیں تو ہر کوئی غلط ہی لگتا ہے۔“

انہوں نے ذرا برامان کے کہا ساتھ ساتھ وہ ناشتے کے برتن بھی دسترخوان سے اٹھا رہی تھیں۔
 اجدا اور ثمرہ تو اسکول و کالج کے لئے نکل چکے تھے وہ آخر میں جاتی تھی۔ نوید احمد بھی اپنے کمرے میں لیٹے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ رمضانہ کی محتاط طبیعت سے واقف تھے، وہ گھر کی تمام تر ذمہ داریاں بالکل بڑے بیٹے کی طرح سنبھالے ہوئے تھی۔

”میں انہیں غلط نہیں کہہ رہی مگر آپ کی تعریفیں مجھے اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔“

اتنے میں وین کے ہارن کی آواز آئی تو وہ اپنا دوپٹہ اچھی طرح اوڑھ کے کھڑی ہوئی۔

”اچھا امی! جارہی ہوں، اللہ حافظ۔“ اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔

آفس آ کے بھی اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ امی سے وہ اتنے سخت لہجے میں بولی تھی اسے شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔

”ہیلو مس نوید۔“ شہیر نے سی گرین پر ہنڈ کیڑوں میں ملبوس گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی رمضان کو دیکھا، شہیر کو وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی دل کر رہا تھا اسے یونہی لمحوں کو امر ہوتے دیکھتا رہے مگر پھر اپنی پوزیشن کا بھی خیال تھا جھٹکھنچل بھی گیا، پورا ہسپتال ہی اس وقت گہما گہمی میں تھا۔

”مس نوید۔“ اس نے کاؤنٹر پر کی رنگ بجائی۔

رمضان نے چونک کے اسے دیکھا، جھینپ کے لب بھینچ لئے تھے۔

”کیا بات ہے، آپ کسی پرابلم کا شکار ہیں۔“

”نہیں سر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس نے کمپیوٹر کے مانیٹر پر نگاہ جما دی۔

”اوکے میں ویسے بھی پرسل کسی کی شیئر نہیں کرتا کیونکہ لوگ اکثر پسند نہیں کرتے ہیں۔“ شہیر کا اشارہ صاف

اس کی طرف ہی تھا۔

”اپنی دے، آپ کل شام کی ساری رپورٹس ریڈی کرویں تاکہ مجھے مل جائے۔“

”اوکے سر!“ اس نے سر ہلایا۔

شہیر کاؤنٹر پر موجود دوسری لڑکی سے کسی رپورٹس کی بات کرنے لگا۔

رمضان نے کن انکیوں سے دیکھا، وہ مکمل فائل میں بڑی تھا۔ شہیر پھر کوریڈور میں چلا گیا، وہ آج کام میں اتنی بڑی رہی کہ اسے کھانے تک کا خیال نہیں رہا۔

”مس نوید! آپ کیا بھوک ہڑتال پر ہیں۔“

”نہیں تو سر۔“ وہ اچھل گئی۔

”پھر کھانا کیوں نہیں کھایا۔“ وہ مسکرا کے پوچھ رہا تھا۔

”وہ کام میں اتنی مصروف رہی خیال ہی نہیں رہا۔“

اس نے سر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے خوش ولی سے شہیر کو بخوردیکھا۔

”سر! میں نے ان سے لپچ کا کہا تھا مگر یہ کہتی رہیں بھوک نہیں ہے۔“ ریسپشن پر موجود زرین نے بھی تائیدی کہا۔

”وہ اصل میں سر کام زیادہ تھا اس لئے میں نے سوچا کام ضروری ہے۔“ وہ جھٹک گیا ہوئی۔

”مس نوید! کام کے لئے صحت بھی ضروری ہے اور صحت اسی وقت ہوگی جب آپ کھائیں گی، پیئیں گی وقت

پرتو ہی آپ میں انرجی ہوگی تو کام کر سکیں گی۔“ مسکرا کے اسے کافی لمبا لپچھروے رہا تھا۔

رمضان جزبزی ہو گئی۔ جتنا وہ اس سے بچتی تھی وہ اسے نروس کرنے آ جاتا تھا۔

”جی اچھا! ابھی کھاتی ہوں۔“ اس نے کمپیوٹر کی اسکرین سے نگاہ ہٹا کے کہا۔

”گڈ، آپ تو میری ہر بات سمجھنے لگی ہیں۔“ لہجہ اس کا معنی خیز اور کچھ شرارتی ہو گیا۔ رمضان نے لب بھینچ لئے۔

شہیر اس پر مسکراتی نگاہ ڈال کے آگے بڑھ گیا۔

رمضان کی اچھل پھل دھڑکنوں میں اتنا شور تھا کانوں میں سنائی دے رہا تھا، جانے کیوں جب بھی شہیر سامنے

آتا وہ نروس ہونے لگتی تھی مگر رمضان نے اپنی اوقات سے زیادہ خواب نہ دیکھے اور نہ دیکھتی تھی، وہ چاہتی تھی زندگی

سہل پسندی سے گزر جائے۔

اس کی ڈیوٹی چار بجے آف ہوتی تھی اور اسی وقت شہیر کی بھی ہوتی۔

”اتنی جلدی جلدی کہان بھاگ رہی ہیں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ ایڈجسٹ 116 دسمبر 2016ء

”جی۔“ رمضان کے اٹھتے قدم رک گئے۔

”وین آگئی ہے۔“

”اچھا اچھا میں سمجھا آپ کے پیچھے کوئی لگ گیا ہے۔“ وہ ہنساتھا۔

دونوں پارکنگ ایریے میں تھے۔

”یار! تم آگئے۔“ شہیر نے شہزیل کو سامنے دیکھا۔

رمضان نے چوبک کے بلیک پینٹ پر اسکاکی بلیو شرٹ میں ملبوس سویر سے شہزیل کو بخور دیکھا، نگاہ شہزیل کی بھی اس پر پڑی تھی۔

”جانے کیوں یہ لڑکی چونکاتی کیوں ہے۔“ شہزیل نے اچھتی نگاہ ڈالی۔

”تم شور مچانے لگتے اس لئے آگیا جلدی۔“ رمضان وین میں بیٹھ چکی تھی، شہزیل کی نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا تھا، دل میں بے چینی کیوں تھی۔

☆.....☆

اس نے شہیر کو گھر ڈراپ کیا اور خود پھر اپنے پرانے محلے میں آگیا، ایک آس و امید لے کے آج تو مکمل معلومات اور ایڈریس مل ہی جائے گا، اس نے دروازہ ٹاک کیا۔

”جی کون؟“ اندر سے خاتون کی آواز آئی۔

”میں شہزیل، اس دن بھی آیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا اچھا۔“ وہ خاتون جلد ہی اسے پہچان گئی تھیں۔

”میں آپ سے نوید احمد کا ایڈریس کا پوچھ رہا تھا۔“

”نوید احمد بفرزون میں رہتے ہیں، اس سے زیادہ ہم نہیں جانتے۔“ وہ گویا ہوئیں۔

شہزیل مایوس ہو گیا، وہ تو بہت آس و امید کے ساتھ آیا تھا، دل میں ایسا لگا کچھ ٹوٹا ہو وہ مایوس اور افسردہ قدموں سے گاڑی میں آ کے بیٹھ گیا تھا۔

زندگی میں ایک جینے کی رقم نظر آئی تھی وہ بھی ماند پڑ گئی، ایسی زندگی کا مقصد اسے بے مقصد ہی لگ رہا تھا۔ کتنے عرصے سے وہ انہیں ڈھونڈ رہا تھا مگر آج وہ بھی ختم ہو گیا، اتنا بڑا بفرزون ہے کہاں کہاں وہ دیکھے اور پوچھے۔

گاڑی وہ ڈرائیو کر رہا تھا مگر ذہن الجھا ہوا تھا، شہیر کو گھر ڈراپ کر کے وہ نکل گیا تھا، کتنا خوش خوش نکلا تھا۔

گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ ماہا کی نگاہوں نے اسے دیکھ لیا تھا مگر وہ ووڑ کے نہیں آئی تھی۔

”اے بیٹا! کبھی ادھر بھی بیٹھ جایا کرو کیا اپنا قیام ہر وقت کمرے میں ہی رکھتے ہو۔“ دادی جان نے اسے روک لیا تھا۔

سارے ہی ہال کمرے میں بیٹھے تھے۔ شام کی چائے پی جا رہی تھی، ماہا بھی اپنے کمرے سے نکل کے آگئی تھی۔

”میں بس ابھی آیا۔“

اس وقت شہزیل کی حالت ایسی ہو رہی تھی وہ ان سب کے درمیان بیٹھنا نہیں چاہتا تھا، بشری سمجھ گئی تھیں وہ اپنے پرانے محلے میں گیا تھا۔

ماہا سب کی نظروں سے چھپ کے اس کے پیچھے پیچھے آگئی تھی۔

”پلیز ماہا! آپ اس وقت چلی جائیے۔“ وہ بہت بے زار اور تھکا تھکا ہو رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM 117 دسمبر 2016ء

ماہا اس کے سامنے چنک کر خائفی کی کرتی پر بلیک ٹراؤز میں سائیڈ پر دوپٹہ ڈالے کھڑی تھی۔

”تم آخر مجھ سے اتنا بے زاریوں رہتے ہو۔“

”آپ کا وہم ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

وہ وارڈ روم سے کچھ تلاش کرنے میں لگا ہوا تھا۔

”ایسی ہی بات ہے، تمہیں میری آنکھوں میں اپنے لئے محبت نظر نہیں آتی۔“ وہ اس کے آگے کے کھڑی ہو گئی۔

شہزیل نے ناگواری سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

”ادھر دیکھو شہزیل تم مجھ سے کیوں بات نہیں کرتے ہو، کوئی بات کیوں شیئر نہیں کرتے ہو۔“

”سوری! میں اپنی باتیں کسی کے ساتھ شیئر کرنا بھی نہیں چاہتا۔“

”یعنی تمہاری نظر میں ہماری کوئی اہمیت نہیں۔“ وہ تڑخ کے گویا ہوئی۔

”میں آپ لوگوں کی بات نہیں کر رہا، میں صرف اپنی باتوں کی بات کر رہا ہوں کیونکہ کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں

جو میں سمجھتا ہوں میں ہی سولو کر سکتا ہوں۔“ اس نے جھٹ وضاحت دی۔

ماہا اسے چھوٹی پچی ہی لگتی تھی یا پھر وہ اس پر توجہ نہیں دینا چاہتا تھا۔

”شہزیل! ایک بات یاد رکھنا، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ ماہا اس کی پشت سے لگ گئی۔

شہزیل کرنٹ کھا کے پیچھے ہو گیا۔

”پلیز! آپ یہاں سے جائیں مجھے فریش ہونا ہے۔“

وہ اسے دھکیل کے باتھ روم میں کھس گیا، ماہا کی بے ساختہ حرکتوں سے وہ پریشان ہونے لگا تھا۔

☆.....☆

نیل فر نے ٹھیکل احمد کو نہیں بتایا تھا کہ وہ ان کے گھر تک گئی تھی، حمزہ اسے دو دفعہ مل چکا ہے اور تو اور فہر بھی ملا

تھا۔ وہ قدرت پر حیران تھی وہ اسے بار بار مل رہی تھی جتنا وہ ان سب سے چھپ کے رہ رہی تھی۔

فہر کی کال نے اسے الگ ڈسٹرب کیا ہوا تھا، وہ بار بار تو اپنا سیل آف نہیں رکھ سکتی مگر اس نے جب سے سامنا

ہوا تھا فہر سے بات نہیں کیا تھی۔

شہوار یونیورسٹی گئی ہوئی تھی، وہ گھر میں اکیلی تھی۔ زبیدہ خالہ مارکیٹ تک گئی ہوئی تھیں گھر کا سودا سلف لینے گئی تھیں۔

سیل پھر تیسری دفعہ پ دے رہا تھا۔ نیل فر نے ناگواری سے دیکھا، فہر کی ہی کال تھی۔

”کیوں یہ شخص میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔“

اس نے سیل اٹھایا، مسلسل سیل چیخ رہا تھا اور نیل فر جانتی تھی فہر کو اس دن کی پریشانی ہوگی، وہ حمزہ کے گھر اور نیو

براؤنڈ گاڑی میں اس کی خودی سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ مجبوراً کال ریسیو کی کیونکہ جانتی تھی یہ جان کا عذاب ہے۔

”آپ کو آخر کیا پریشانی ہے۔“ وہ تڑخ کے گویا ہوئی۔

”گڈ، کال ریسیو کر لی ورنہ آپ جانتی ہیں میں کیا کر سکتا ہوں۔“

فہر نے شوخ سے لہجے میں اسے ڈرایا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا وہ مسکرا بھی رہا ہوگا، وہ تو تپ کے رہ گئی۔

”کیا کر سکتے ہیں، مجھے ڈر رہا ہے ہیں۔“

”یہی سمجھ لو۔“ وہ ہنسا تھا۔

”ویسے اتنی مہنگی ترین گاڑی میں وہ بھی آپ ڈرائیو کر رہی تھیں، کیسے کہاں سے آ گئی۔“ استفہامیہ انداز میں

کہتے ہوئے اس کا لہجہ فہمائشی بھی ہو گیا تھا۔
 ”میری فرینڈ کی گاڑی تھی۔“ زک رگ کے گویا ہوئی۔
 ”آپ کے ماموں جو کہ میرے ماموں کے ڈرائیور ہیں، ان کی بھانجی کی ایسی کون سی کروڑ پتی فرینڈ ہے جو
 گاڑی تک دے دی۔“ وہ مسلسل جرح ہی کئے جا رہا تھا۔
 نیل فریج ہو رہی تھی، اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کہے، کیسے بات کو سنبھالے۔
 ”دیکھئے مسٹر۔“

”مسٹر کو فہر احمد کہتے ہیں۔“ اس نے نام بتایا۔
 ”جو بھی کہتے ہیں مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ آپ بس یہ بتادیں آپ کو کیا پریشانی ہے کیوں مجھے چیپ
 لڑکوں کی طرح کال کرتے رہتے ہیں۔“ وہ بری طرح دانت پیس رہی تھی۔
 ”مجھ سے ایک بار مل لیں کیونکہ سیدھے طریقے سے میں آپ کے گھر رشتہ بھیجنا چاہتا ہوں۔“
 ”ناممکن ہے میں آپ سے کیا کسی سے بھی کبھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ اس نے جھٹ کہا۔
 ”کسی اور سے میں آپ کو کرنے بھی نہیں دوں گا جب میں موجود ہوں۔“ فہر کو تو جیسے ضد ہو گئی تھی اس لڑکی کو حاصل کرنے کی۔
 ”بکو اس بند کریں۔“

اس کا دل جانے کیوں آج پہلی دفعہ دھڑکا تھا اور اسے فہر سے شادی کی بات کرتے ہوئے حیا بھی آرہی تھی۔
 ”یہ بکو اس نہیں ہے، سیدھی بات کر رہا ہوں، سول انجینئر ہوں، ٹھیک ٹھاک کماتا ہوں، ہر آسائش آپ کو
 دوں گا اور سب سے بڑھ کر میرے گھر پر راج کریں گی۔“
 ”مجھے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“

نیل فرک اس دقت نہایت ناگوار گزار رہا تھا اس سے بات کرنا اور وہ اتنا تو سمجھ گئی تھی فہر ضد کا پکا اور اڑیل ہے
 اس کو اندازہ نہیں تھا وہ اس کی کزن بھی ہے۔
 ”ضرورت تو خیر ایسی چیز ہے جو ہر چیز کی وقت پر ضرورت پڑ جاتی ہے، مثلاً جب شادی ہوتی ہے تو اولاد کی
 ضرورت ہو تو پھر اولاد کے لئے اس کی ضرورتوں کی فکر ہوتی ہے۔“
 ”آپ اپنی یہ بے ہودہ بکو اس بند کریں تو زیادہ اچھا ہے کیونکہ مجھے ان سب کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”نیل فر! تم آرام سے اور آسانی سے مان جاؤ تو یہ تمہارے لئے اچھا ہے، میں تمہاری رضامندی کے بغیر تو
 رشتہ بھی استوار نہیں کرنا چاہتا۔“

فہر کو اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا چاہے وہ نفرت و غصے سے بنی کرتی تھی کم از کم بات تو کرتی تھی۔
 ”میری طرف سے ہمیشہ نا ہی رہے گی میں کبھی رضامند نہیں ہوں گی، آپ اپنی کلاس میں رشتہ استوار کریں
 تو زیادہ اچھا ہے میں آپ کے مقابلے کی نہیں ہوں۔“
 ”میں پیسہ دولت کو کبھی اہمیت نہیں دیتا، مجھے تو آپ پسند آئی ہیں۔“
 ”ایک ڈرائیور کی بھانجی ہوں پھر بھی۔“

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ فہر اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔
 ”فہر صاحب! آپ شاید میرے متعلق جانتے نہیں ہیں، اس لئے یہ بات کہہ رہے ہیں۔“ نیل فر کے لہجے
 میں حسرت اور طنز تھا۔

”میں سب جان کے ہی کہہ رہا ہوں، بولے اپنے گھر والوں کو کب بھیجوں؟“
 ”کبھی نہیں اور کبھی بھی نہیں۔“ وہ تیز لہجے میں گویا ہوئی۔

”ٹھیک ہے آپ اپنی پراڑی رہے میں اپنی پر، دیکھتے ہیں آپ کی نہ نہ کب تک چلے گی، ایک دن آپ میری جھولی میں ہی گریں گی اس وقت کا سوچیں۔“ وہ مسخراڑا کے پر یقین آواز میں گویا ہوا تھا۔
 نیل فر تو شرم و ذریعے سہم گئی، اس نے پھر سیل ہی آف کر دیا اور سر تکہ پر رکھ دیا، قدرت بار بار اسے انہی لوگوں میں کیوں لے کے جارہی تھی جہاں اس کی جگہ ہی نہیں۔ آنسو رخسار پر بہنے لگے تھے، آج ماں شدت سے یاد آنے لگی۔
 ”امی! دیکھیں آپ کی بیٹی کو کیا کیا دیکھنا پڑ رہا ہے۔ آخر کب تک میں بھاگتی اور چھپتی رہوں گی۔“
 وہ واقعی تھک گئی تھی۔ ادھر حمزہ اسے ملتا رہتا تھا ادھر فہر اس کی جان سے چمٹ گیا تھا۔
 ”یا اللہ! مجھے بھی سکھ دے دیے، مجھے بھی جینے کا مقصد دیے دے۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔ کافی دیر تک روتی رہی تھی، زبیدہ خالہ آگئی تھیں اور شہوار بھی یونیورسٹی سے آگئی تھی، وہ ہاتھ روم میں گھس گئی تھی، شہوار کے لاتنا ہی سوالوں سے وہ بچتی تھی۔
 ”نیل فر، یار! تم کلاسز تو اینڈ کر لو۔“

”میں پڑھنا ہی نہیں چاہتی تو فضول ہے۔“
 وہ ڈرینک ٹیبل کے مرر کے آگے کھڑی بالوں میں برش چلا رہی تھی۔
 ”تم کیا رو رہی تھیں؟“ شہوار نے چونک کے اس کی سوچھی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔
 ”سورہی تھی۔“ اس نے زبردستی چہرے پر ہنسی دکھائی۔
 نیل فر کا سیل آف تھا، وہ اٹھا کے چیک کیا، سمجھ گئی ضرور اس شخص نے اسے تنگ ہی کیا ہوگا۔
 ”سیل کیوں آف ہے؟“

”بیٹری لو ہو گئی ہوگی۔“ اس نے بات بنائی۔
 ”تو تو نہیں ہوئی تم نے آف کیا ہوا ہے، لگ رہا ہے اس کی کال آئی ہوگی۔“
 ”کس کی؟“ وہ پھر انجان بنی۔

”میرے سامنے بنو میت، جلدی سے بتاؤ کیا بول رہا تھا۔“
 شہوار تو پیچھے ہی پڑ جاتی تھی اور پھر نیل فر کو اسے ساری باتیں بتانی ہی پڑیں۔ کم از کم بتانے سے دل کا بوجھ کچھ تو ہلکا ہو جاتا تھا۔

☆.....☆

سیل آف ہوتے ہی اسے ہنسی آگئی تھی، وہ نیل فر کو جان بوجھ کے بھی تنگ کر رہا تھا مگر فہر کو اس کے متعلق جاننے کی بھی بے چینی تھی۔ اس دن وہ شکیل احمد کے گھر بھی اسی لئے گیا تھا کسی طرح بھی ڈرائیور سے اس کے متعلق جان لے تو ہی وہ بات آگے بڑھائے گا مگر وہ ڈرائیور پر ایسا کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اسے غلط سمجھے۔
 ”کیا بات ہے سیل نیا لیا ہے۔“ مہاد نے اس کے ہاتھ سے سیل ہی اچک لیا، فہر اچانک افتاد پر بوکھلا ہی گیا۔
 ”یار! کیا بد تمیزی ہے۔“ وہ ذرا برہم بھی ہوا۔
 ”یار بھائی جان یہ بد تمیزی تو بالکل نہیں ہے، میں یہ دیکھنا چاہ رہا ہوں میرے ہیرو جیسے بھائی کسی لڑکی وغیرہ سے تو بات نہیں کر رہے تھے۔“
 وہ سیل کو اپنے ہاتھ میں دبائے ہوئے تھا اور فہر نے اسے گدی سے پکڑ لیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

120 دسمبر 2016ء

”اوئی ای، امی۔“ اس نے تو چیخنا شروع کر دیا۔

”کیا وحشت ہے۔“

زہرہ تو ہانپتی کانپتی آئی تھیں وہ ظہر کی نماز پڑھ کے تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

”امی بھائی جان کو دیکھیں۔“

”امی اس سے میرا سیل دلوائیے۔“ فیر اس کی گدی چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

زہرہ ان کی ہاتھ پائی پر پریشان ہو گئی تھیں۔ مہاد سے سیل لے کے فیر کو دیا۔

”بھائی جان یہ فائل ہے۔“ وہ گدی سہلانے لگا۔

”یہ سب کیا چل رہا ہے؟“

”امی! یہ موصوف کسی لڑکی سے باتیں کر رہے تھے اور اسے ڈرا دھمکا بھی رہے تھے۔“

فیر تو بوکھلا ہی گیا، مہاد نے کب اس کی گفتگو سن لی۔

”امی یہ فضول ہانک رہا ہے، میں تو آفس سے ابھی آیا تھا، کسی کی کال تھی اس پر بات کر رہا تھا۔“ اس نے

صفائی سے جھوٹ بولا۔

”جھوٹ، بالکل جھوٹ۔“

مہاد نے ہاتھ اٹھا کے نفی کی۔

”چل بکواس نہ کر۔“

فیر اپنے روم کی طرف بڑھ گیا مگر زہرہ کی جانچتی اور تفتیشی نگاہیں فیر پر ہی تھیں جو مسکراتا ہوا اندر گیا تھا۔

”امی! پوچھیے تو۔۔۔“

”تم اپنا کام کرو میں پوچھ لوں گی۔“

انہوں نے مہاد کو وہاں سے ٹالا تھا وہ ابھی تسبیح پڑھ رہی تھیں اس لئے بھی اس قصے کو چھیڑنا نہیں چاہتی تھیں۔

روم میں آ کے فیر اپنے بیڈ پر جوتوں سمیت لیٹ گیا تھا، وہ ٹیل فر کو سوچنا چاہتا تھا جو آہستہ آہستہ اس کے دل

کے قریب ہو گئی تھی، اس کا ہر ہر انداز وحشت زدہ ڈرا سہا ہے اچھا لگتا تھا، بالکل ہر نی کی طرح ہی لگتی تھی۔

”ٹیل فر مجھے اپنے جذبوں پر یقین ہے، ایک دن میں تمہیں تمہارے دل سمیت جیت لوں گا، اس کے لئے

مجھے چاہئے کتنا وقت اور کار ہو۔“

مگر فیر کو یہ حیرانگی تھی، وہ اتنے پر اعتماد انداز میں گاڑی ڈرائیو کرتی ہوئی گئی تھی وہ بھی اتنی مہنگی ترین۔

”یہ خود بہ خود کیوں ہنسا جا رہا ہے؟“ اس کے زہرہ روم میں چلی آئی تھیں۔

فیر تو بوکھلا کے اٹھ بیٹھا اور لب بلیچ لے لے۔

”آپ امی۔۔۔“

”یہ بتاؤ ہنسا کیوں جا رہا تھا؟“ وہ معنی خیزی سے پوچھ رہی تھیں۔

”وہ کچھ نہیں۔“ اس نے سر کھجایا۔

”کہیں واقعی میرا بیٹا کسی لڑکی کے چکر میں تو نہیں پڑ گیا۔“

”ارے امی! ایسا کچھ نہیں ہے اور اگر ہوا تو سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گا کیونکہ آپ اپنے بیٹے کو جانتی ہیں

مشکل سے ہی کوئی پسند آئے گی اور وہ پہلی اور آخری ہوگی۔“ اس نے یہ کہہ کر انہیں مطمئن ہی کیا۔

زہرہ کو ایسا لگا جیسے واقعی کوئی بات ضرور ہے۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُم مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کوئی غیرِ خاطر نہ جی رہا

”مہی.....! نام کہاں ہیں آپ؟“ وہ جو پیزا بیک کرنے میں منہمک تھی۔ انشوی کی چہلتی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔



”کچن میں ہوں سوئیٹ ہارٹ!“ بیکنگ گلوں ہاتھوں سے نکالتے چائے زیاں ”واصف پر سرسری سی نگاہ ڈال کر وہ کچن سے نکلی تھی۔ وہیں انشونے اسے چالیا۔“ یہ دیکھیں مام! میں آپ کے لیے کیا لائی ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھوں کو پیچھے چھپائے روشنا سے مخاطب تھی۔

”کیا لائی ہو؟“ اس کے پھولے گالوں پر پیار کرتے روشنا نے استفسار کیا۔ چائے پیتے زیاں کی نگاہیں بدستور ماں بٹی پر ہی مرکوز تھیں۔

”آپ کیس کریں۔“ انشونے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جلدی سے بتا دو کیا لائی ہو۔ ورنہ جو میں تمہارے لیے پیزا بیک کر رہی ہوں وہ جل جائے گا اور تمہاری

تاریخ صورت میں دیکھ نہیں پاؤں گی۔“ روشنا نے محبت سے پر لہجے میں کہا۔

”اوہ ریلی می! تو یہ لیجیے۔“ اس نے اپنے ننھے ہاتھوں میں تھاماتھفہ روشنا کی جانب بڑھایا دیا۔



”پہی برتھ ڈے ٹوی می۔ یہ کہتے ہوئے وہ روشنا سے لپٹ گئی۔ روشنا کی آنکھیں یکدم نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

”شکر یہ میری جان!“ آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں سے صاف کرتے اس نے انشو کو خود میں بھینچا تھا۔

”ممی آپ رورہی ہیں؟“ انشراح نے حیرانگی سے استفسار کیا تھا۔

”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“ روشنا نے مسکرا کر جواب دیا۔ زیان واصف نے اس روتی لڑکی کو عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ چائے کا گگ ڈانگ پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ان دونوں کو یکسر نظر انداز کیے پورچ کی جانب بڑھ گیا۔

”ڈیڈی دیکھیں ناں میں ممی کے لیے کیا لائی ہوں۔ ادھر آئیے ناں پلیز۔“ انشراح نے ملتجیانہ لہجے میں زیان سے کہا۔

”بیٹا آپ گفٹ اپنی ممی کو دکھاؤ مجھے بزنس ڈنر کے لیے ابھی نکلتا ہے۔ میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کر سکتا۔ اللہ حافظ۔“ انشراح کو ہاتھ ہلاتے وہ اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ جب کہ انشراح اسے دیکھ کر رہ گئی اس کی نظروں میں افسردگی تھی۔

روشنا کا دل چاہا اپنی تمام تر خوشیاں وہ اس پیاری بچی کے نام کر دے۔ اس کی زندگی کا مقصد یہی تو تھا اس کی تمام تر خوشیاں انشو سے ہی تو واپس تھیں۔ انشو کا اتر اچہرہ دیکھ کر اسے زیان واصف پر بری طرح غصہ آیا۔ انشو کا ہاتھ تھا اسے وہ صوفے پر براجمان ہو گئی اور انشراح کے لائے گئے تحفے کو اس کے سامنے کھولنے لگی۔ انشراح اسے گفٹ کھولتے دیکھ کر خوش ہونے لگی۔ انشو کے لائے رست و ارج کو اس نے فوراً پہن لیا۔

”ممی! آپ بہت اچھی ہیں۔“ روشنا کے گود میں سر رکھے انشو نے معصومیت سے کہا۔

”آپ نے کس کے ساتھ جا کر یہ گفٹ لیا؟“ روشنا نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے نہایت نرمی سے استفسار کیا۔

”اسکول سے واپسی میں، میں نے ڈرائیور انکل سے کہا تھا وہ مجھے لے گئے تھے۔“ انشو نے سادگی سے جواب دیا۔

”بیٹا اب اس طرح جانے کی ضرورت نہیں جب بھی کہیں جانا ہو مجھے کہہ دینا میں یہاں تمہارے لیے ہی تو ہوں۔“ روشنا نے آخری جملہ نہایت افسردگی سے کہا تھا۔

”ممی آپ کو جلنے کی بو نہیں آرہی؟“ انشو نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ روشنا، انشو کو صوفے پر بٹھاتے ہوئے فوراً کچن کی جانب بڑھی۔ پیار سے بنائے گئے پیزا کا حال برا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کولے کی کان سے نکل کر آیا ہے۔ بیکنگ ٹرے اوون سے نکالتے روشنا اور انشراح کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

☆.....☆

”انشراح یہ تو لو۔“ روشنا، انشراح کی پلیٹ میں تو س ڈال رہی تھی جو اسکول یونیفارم میں برے برے منہ بنانے میں مگن تھی۔

”ممی مجھے صرف جوس چاہیے۔“ انداز بچہ تھا۔

”جی نہیں صرف جوس نہیں ساتھ میں تو س بھی لینا ہے۔“ روشنا نے سرزنش کی تھی۔

”گڈ مارننگ ایوری ون۔“ وہ جو انشو کے ساتھ مگن تھی۔ زیان واصف کی آمد سے یکدم الٹ ہو گئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رواڈ انجسٹ 124 دسمبر 2016ء

”گڈ مازنگ۔“ کہہ کر زیان کی توجہ انشو کی جانب تھی روشنا کو اس نے یکسر نظر انداز کیا۔
 ”بے حد اچھا کیونکہ انشو کی مام جوتانی اچھی ہیں۔“ انشو نے معصومیت سے روشنا کا پلو تھاما اس ادا پر روشنا نے مسکرا کر انشو کو دیکھا تھا۔

”اور ڈیڈی اچھے نہیں ہیں؟“ زیان واصف نے روشنا پر اجنبی نگاہ ڈال کر مسکرا کر پوچھا تھا۔
 ”ڈیڈی بھی اچھے ہیں مگر مام زیادہ اچھی ہیں۔“ ہر بار کہے جیسے کو انشو نے اس بار بھی دہرایا تھا۔
 روشنا نے چائے زیان کی طرف بڑھائی تھی اور خود بریڈ پر مار ملیڈ لگانے لگی۔
 ”روشنا! آپ سامان پیک کر لیجیے گا۔ ہم چند ماہ کے لیے اسلام آباد جا رہے ہیں۔ وہاں اپنا نیا بزنس سیٹ کر رہا ہوں۔“ روشنا نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بدستور مار ملیڈ لگانے میں مگن رہی۔
 ”آپ سن رہی ہیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ انداز سوالیہ تھا۔
 ”جی ٹھیک ہے۔“ روشنا نے اتنا ہی کہا تھا۔

”ڈیڈی ہم اسلام آباد کب جائیں گے۔ اب تو میرے اسکول کی چھٹیاں بھی ہونے والی ہیں۔“ انشو نے پوچھا تھا۔

”ہم اسلام آباد پر سوں جا رہے ہیں۔“ سلاکس کا بائیٹ لیتے زیان نے اطلاع دی تھی۔ روشنا نے سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ نگاہوں کے تصادم پر زیان واصف نے بے ساختہ نظریں جڑائی تھیں۔
 ”ڈیڈی پھر ہم مری، سوات وغیرہ بھی جائیں گے؟“ انشراح نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا تھا۔
 ”جی پیٹا۔“ زیان نے انشو کے ہاتھ پر پھینکی دیتے یقین دلایا تھا۔

”Thats great“ پھر وہاں آپ مٹی اور میں ڈھیر ساری پکچرز بھی بنوائیں گے ٹھیک ہے ناں؟“ انشو کی خوشی قابل دید تھی۔

بزنس ٹور پر زیان تنہا ہی جایا کرتا اور انشو کی ضد کی بنا پر وہ کراچی میں ہی پکنک اسپاٹ اور باہر ڈنرو لے کر واپس پر اکتفا کرتا تھا۔ اپنی ذات کے خول میں بند شخص زیان کو دوسروں کے جذبات و احساسات کی پرواہ کب تھی یا تو وہ مصروف رہتا یا پھر اپنی سوچوں میں گم۔

”اوکے اوکے ڈیڈی! پھر ملتے ہیں باپ۔“ ڈرائیور انکل نے ہارن بجایا تھا انشو اٹھ کھڑی ہوئی۔ روشنا نے بھی اپنا ناشتہ ادھورا چھوڑا۔ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے وہ انشو کی جانب بڑھی اس کا تھرماس، بیج، ماکس اور بیگ گاڑی میں رکھوا کر اسے رخصت کرنے لگی۔ انشو روشنا کے گالوں پر پیار کرتے گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔
 جب تک انشو نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی وہ دروازے پر ایستادہ رہی۔ جب وہ واپس ڈائینگ میں آئی تو زیان واصف کو کسی گہری سوچ میں گم پایا۔ روشنا کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ زیان کو نظر انداز کیے روشنا نے ٹھنڈی چائے کے گھونٹ حلق سے اتارے۔

☆.....☆

”وہ سامان پیک کر کے سونے کی غرض سے لیٹی ہی تھا۔ وقت زیان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
 ”روشنا! اگر آپ ڈنر نہ ہوں تو ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔“ زیان نے تمہید باندھی۔
 ”جی کہیے۔“ روشنا شانوں پر دوپٹے درست کرتی لیٹے سے اٹھ بیٹھی۔
 ”ابھی انشو کے انکل ارحم کی کال آئی تھی۔ انشو کی گرینی کی طبیعت بے حد خراب ہے۔ وہ انشو کو چند دنوں

کے لیے اپنے پاس بلانا چاہ رہی ہیں۔“ صوفی نے پریشانی سے ایلانہ عایان کیا تھا۔
 ”تو؟“ روشنا کے انداز سوالیہ تھا۔

”تو ارحم کل انشو کو لینے آرہا ہے۔“ زیان نے جتایا تھا۔
 ”مگر ہم تو کل اسلام آباد جا رہے ہیں۔ انشو کیسے چلی جائے گی۔ اس کے بغیر میں کیسے رہوں گی۔ انشو کو میرے بنارہنے کی عادت نہیں ہے۔“ روشنا نے کربناک لہجے میں کہا تھا۔ اس کے چہرے پر تارکی تھی۔
 ”ہم اسلام آباد جا رہے ہیں چند دنوں بعد انشو وہیں آجائے گی اور جہاں تک آپ کا یہ کہنا ہے کہ انشو کو آپ کے بغیر رہنے کی عادت نہیں ہے۔ یہ بالکل احمقانہ بات ہے۔ کیونکہ جب آپ نہیں تھیں تب بھی انشو رہتی تھی میرے ساتھ۔“ زیان نے بالکل عام سے لہجے میں کہا تھا مگر اس کے لفظوں کے تیر روشنا کی روح تک گھائل کر گئے تھے۔

”آپ انشو کی پیکنگ کر دیں ارحم صبح آجائے گا ان کی فلائٹ دوپہر کی ہے۔“ زیان یہ کہہ کر رکنا نہیں تھا۔ اس کے قدم اسٹڈی کی جانب تھے مگر نجانے کیا تھا اسے لگا شکوہ کرتے دوین اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ وہ بے ساختہ پلٹا تھا۔ روشنا پر شکوہ لگا ہوں سے اس کی پشت کو گھور رہی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ انشو جلد اسلام آباد آجائے گی آپ کے پاس۔“ زیان نے یقین دلاتے نہایت نرمی سے کہا۔

”مگر میرا دل نہیں مان رہا۔ میں نہیں رہ پاؤں گی انشو بھی پریشان ہوتی رہے گی۔“ روشنا کی آنکھیں نم تھیں۔
 ”روشنا! آپ بالکل بچوں کی طرح ری ایکٹ کر رہی ہیں۔ انشو بڑی ہو رہی ہے اسے کوئی دقت نہیں ہوگی۔ آپ خود کو کمپوزڈ کریں۔ گڈ نائٹ۔“ اسے روتا بلکتا چھوڑ کر زیان نے اسٹڈی روم کا رخ کیا تھا اور روشنا اس بے درود شخص کو فقط دیکھ کر رہ گئی۔ آخر کیا تھا اس کی زندگی میں سوائے انشراح، زیان کے۔ وہ تو اس کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی اور نجانے کتنے دنوں تک اسے انشو کے بنارہنا تھا۔ یس لیٹی انشو کو اس خود سے مزید قریب کیا تھا۔ اس کی پیشانی پر لب رکھے نجانے وہ کتنی دیر تک آہ و زاری کرتی رہی تھی۔

☆.....☆

نجانے رات کب سوئی تھی۔ جب تک جاگتی رہی آنکھوں میں سیل رواں تھے۔ آنکھ کھلی تو انشو کمرے میں موجود نہ تھی اور نہ زیان اسٹڈی روم میں۔ وہ یونہی حواس باختہ ہو کہ کمرے سے نکلی۔ انشو کو نہ پا کر اسے عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کوئی اس کی متاع اس سے چھین لے گیا ہے۔ زینہ طے کرتے وہ مسلسل انشو کو آوازیں دے رہی تھی۔ نی وی لاونج میں بیٹھے زیان اور انشراح کو دیکھ کر اسے قدرے قرار آیا تھا۔ وہ بھاگ کر انشراح تک گئی اسے خود سے لگاتے ہچکیوں سے رونے لگی۔

”می! کیا ہوا! کیا ہوا؟“ انشو اچانک افتاد پر پریشان ہو گئی۔ روشنا اسے چومتے ہوش و خود سے یکسر بیگانہ تھی۔ زیان اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اچھے بکھرے بال، دوپٹے سے بے نیاز، چہرے پر صدیوں کی تھکن! یہ تو کوئی اور ہی روشنا تھی۔

”می! آپ رو کیوں رہی ہیں؟“ انشو پریشانی سے پوچھتی رہی۔
 ”مجھے لگا آپ مجھے چھوڑ کر لاہور چلی گئی ہو اور مجھے جگایا بھی نہیں۔“ آنسوؤں کے درمیان روشنا نے بمشکل جملہ ادا کیا تھا۔

”مہی! میں آپ کو ایسے چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی۔“ اپنے ننھے ہاتھوں سے روشنا کے آنسو صاف کرتے انشونے یقین دلایا۔

”میری گڑیا!“ کہہ کر روشنا نے ایک بار پھر اسے خود سے لگایا تھا۔

وہ زیان کی موجودگی کو یکسر فراموش کیے ہوئے تھی انشو کو خود سے لگائے وہ اپنی ماما کو تسکین پہنچا رہی تھی۔ زیان پھر وہاں رکنا نہیں روشنا اور انشراح پر نگاہ ڈال کر وہاں سے واک آؤٹ کر گیا۔ روشنا کو اپنے حلیے اور پاگل پن کی وجہ سے سخت ندامت محسوس ہوئی نجانے وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔ میرے بارے میں۔ روشنا عجیب سی کیفیت سے دوچار تھی۔

☆.....☆

انشراح نے اسے جلد آنے کا یقین دلایا تھا۔ روشنا سے ذہیروں وعدے کیے وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گئی۔ روشنا کو لگا اس سے کوئی قیمتی شے چھین لی گئی ہو۔ زیان و اصف نے روشنا کے کربناک چہرے کو بغور دیکھا۔ وہ ہرگز بھی انشو کو روشنا سے چھیننا نہیں چاہتا تھا اور انشو کو خود سے دور کرنا زیان و اصف کے لیے بھی آسان نہ تھا۔ روشنا کو الجھا بکھرا چھوڑ کر وہ گھر سے باہر جا چکا تھا اور ہمیشہ کی طرح صبر کرنے والی روشنا نے دل پر پتھر رکھ کر زیان و اصف کے ہمراہ کراچی سے اسلام آباد تک کا سفر طے کیا تھا۔

اسلام آباد آنے کے بعد زیان کی جھپ ہی نرالی تھی۔ صبح کے گئے رات کو واپس آنا اور پورا دن روشنا تنہا رہ جاتی۔ انشراح کے ساتھ اس کا وقت بے حد اچھا گزرتا تھا یہاں وہ انشراح کو بہت یاد کرتی جب اس قدر مصروفیت بھی تو زیان اسے ساتھ کیوں لایا تھا۔ یہ سوچ کر روشنا کا موڈ ہمیشہ آف ہو جایا کرتا۔ اسلام آباد میں زیان کا گھر تھا۔ اس چھوٹے سے گھر میں ضرورت کی تمام تر آسائشیں موجود تھیں مگر پھر بھی روشنا کا دل نہ لگتا وہ جلے ہیر کی بلی کی مانند پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ ملازموں سے وہ زیادہ باتیں کب کرتی تھی وہ اپنے انشراح اور زیان کے کام خود ہی کیا کرتی تھی۔ زیان اسے مخاطب کب کرتا تھا۔ زیان کے پاس روشنا کے لیے وقت کب تھا اس کے باوجود اس کی موجودگی سے روشنا کے دل میں طمانیت کا احساس جاگا رہتا۔ مگر اس لیے بزنس کی وجہ سے زیان و اصف کے پاس خود کے لیے وقت نہ تھا۔ انشو بھی موجود نہ تھی۔ جو اس کی مصروفیت کے باعث شکایتیں کرتی۔ زیان گھر پر بھی موجود ہوتا تو متعدد فون کالز، میسجز کا تاننا بندھا ہوتا۔ اس کے پاس تو اپنے کھانے، پینے کا بھی وقت نہ تھا۔ روشنا اور زیان کی سرسری ملاقات ہو جایا کرتی وہ تو اس قدر بے بس تھی محبت کا حق استعمال کر کے اس کا خیال ہی رکھ لیتی مگر زیان و اصف نے اسے یہ تمام تر حق دیے ہی کب تھے۔ ابھی شہر میں اجنبی شخص کے ہمراہ روشنا خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔

اس طرح بوریٹ کا شکار روشنا نے چند قدموں کے فاصلے پر موجود شاپنگ مال جانے کا ارادہ کیا تا کہ کچھ وقت کے لیے اس کا دل بہل جائے۔ ادھر ادھر کی فضول سوچوں سے کچھ وقت کے لیے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں کم مال میں داخل ہوئی مال میں یونہی پھرتے اسے خاصا وقت گزر گیا تھا۔ روشنا کی نظر پنک جوڑیے میں ملبوس لڑکی پر گئی جو گود میں صحت مند سے بچے کو لیے ہوئے تھی۔ وہ شاید شاپنگ کی غرض سے آئی تھی۔ اس کی تمام تر توجہ ڈیزائنڈ ریسر کی جانب تھی۔ روشنا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکی نے بھی جان لیا تھا کہ کوئی انہماک سے اسے دیکھ رہا ہے۔ روشنا سست روی سے چلتے ہوئے اس لڑکی تک آئی تھی۔

”اگر میں غلط نہیں ہوں تو یقیناً آپ سزا مسئلہ شہزاد ہیں؟“ روشنانے پر یقین لہجے میں استفسار کیا تھا۔
 ”روشنی یہ تم ہو؟“ مسئلہ کا سحر ٹوٹا تھا اس نے روشنا کو خود میں بھینچا تھا۔ دو آنسو پلکوں کی دہلیز پر آن ر کے

تھے۔

”تم یہاں کیسے روشنا؟“ مسئلہ نے محبت سے پر لہجے میں استفسار کیا تھا۔
 ”زیان اپنا نیا بزنس اسلام آباد میں سیٹ کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں، میں ان کے ہمراہ آئی ہوئی ہوں۔“

روشنانے بتایا۔
 ”تم نے تو رشتہ ہی توڑ لیا۔ انکل، آنٹی کے انتقال کے بعد تم نے کراچی آنے کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا۔ تم سے میرا رابطہ بھی ختم ہو کے رہ گیا۔“

”روشنی یقین کرو میں اب تک اس حادثے کے زیر اثر ہوں۔“ مسئلہ کے لہجے میں کرب پنہاں تھا۔
 مسئلہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد بھی۔ تمام تربیتیں اس نے تنہا سینیٹی تھیں۔ بیاہ کر اسلام آباد آنے کے ایک ماہ بعد ہی اس کے ماما پاپا ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اس وقت سے مسئلہ نے کراچی آنے کا سلسلہ ترک کر دیا تھا۔

”اچھا تم بالکل او اس نہ ہو۔“ اس کا کندھا جھٹھپاتے شاپنگ سینٹر کے باہر موجود چھوٹے سے کافی شاپ کی جانب اشارہ کیا۔ بل ادا کر کے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دونوں کافی شاپ تک آئی تھیں۔

”مسئلہ تمہارا بیٹا بے حد پیارا ہے۔“ روشنانے عثمان کے پھولے گالوں کو پیار سے چھوتے محبت سے کہا تھا۔
 ”شکر یہ محترمہ بالکل اپنی مام پر گیا ہے۔ عثمان بھی اور ارمان بھی۔“ مسئلہ نے مسکرا کر بتایا۔

”ویری گڈ۔“ روشنانے مسکرا کر تائید کی۔

”تمہارے کتنے بچے ہیں؟“ مسئلہ نے استفسار کیا۔

”میری ایک بیٹی ہے۔“ روشنانے مسکرا کے بتایا۔ بیٹی کی محبت اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔

”سو سو میٹ کیا نام ہے۔ کتنے سال کی ہے؟“ مسئلہ نے مزید پوچھا۔

”انشریح زیان نو سال کی ہے۔“ روشنانے آخری لفظ آہستگی سے کہے اور نظریں نیچی کر لی تھیں۔

”ہمیں الگ ہوئے چھ سال ہوئے اور تمہاری بیٹی نو سال کی ہے۔“ مسئلہ نے حیرانگی سے پوچھا تھا۔ وہ اس

انکشاف پر قدرے حیران تھی۔

”وہ زیان کی بیٹی ہے۔ اس طرح میری ہی ہوئی ناں۔“ روشنانے عام سے لہجے میں کہا تھا۔ جیسے یہ بالکل

عام سی بات ہو۔ نظریں ہنوز نیچے تھیں۔

”روشنا! مجھے یقین نہیں آرہا تم کسی شخص کی دوسری بیوی کیسے بن سکتی ہو؟ تمہارا تو ایک آئیڈیل تھا اور تم نے

کہا تھا اگر تمہیں تمہارا آئیڈیل نہ ملا تو مرنا پسند کرو گی مگر کسی ان چاہے شخص کا ساتھ قبول کرنا نہیں، اس کی شخصیت

ایک دم چھا جانے والی ہو۔ مسکرائے تو دل جیت لے۔ چھ فٹ ہاسٹ، سرخ و سپید رنگت، ذہانت سے بھرپور، کالی

آنکھیں، ستواں ناک، کالی مونچھوں تلے گلابی لب، کوالیفائیڈ اور بے تحاشہ ذہین، اسے دیکھ کر تمہیں ایسا لگے کہ

یہی وہ شجر ہے جس کے سائے میں، میں اپنی زیست بتا سکتی ہوں۔“ مسئلہ نے من وعن وہ تمام تر باتیں دہرا دی

تھیں جس کا تذکرہ روشنانے مسئلہ سے بارہا کیا تھا۔

اسکول، کالج، یونیورسٹی تک دونوں سہیلیاں ساتھ رہیں۔ مسئلہ روشنا کے آئیڈیل سے بخوبی واقف

تھی۔ روشنا کے ساتھ ایشلہ نے بھی اپنا ایک آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ دونوں سہیلیاں کسی شہزادے کی منتظر تھیں۔ ان کے ذہن و دل پر ان کا آئیڈیل اس قدر بسا تھا کہ اپنے خوب روکڑنر اور کلاس میٹس کو دیکھنا تو درکنار انہیں سوچنا بھی غلط تصور کرتی تھیں۔ یونہی آئیڈیل بناتے بناتے ایشلہ اپنے فرسٹ کزن کے ہمراہ پیادیس سدھار گئی۔ شہروز عام سی شکل و صورت کا بے حد ذہین نوجوان تھا۔ C.A کرنے کے بعد دیگر ممالک سے کورس کیے وہ اسلام آباد میں بزنس سیٹ کر چکا تھا۔ ایشلہ خوب صورت تھی مگر روشنا سے قدرے کم ایشلہ نے بھی آئیڈیل بنا رکھا تھا اس کے باوجود بھی وہ شہروز کے ساتھ اریٹج میرج کرنے پر راضی ہو گئی تھی۔ روشنا نے اسے خیر میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ کنفیوژن کی کیفیت میں تھی عثمان کے رونے کی آواز سے وہ ماضی سے حال میں واپس آ گئی۔

”کہاں کھو گئی تھیں؟“ روشنا نے استفسار کیا۔

”کہیں بھی نہیں بس ایسے ہی۔“ عثمان کو تھکتے ہوئے ایشلہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”تمہیں ابھی تک میرا آئیڈیل یا ہے۔ مجھے لگا تھا تم بھول گئی ہو گی۔“ روشنا کے لہجے میں کرب پہنا

تھا۔ ایشلہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی۔

”اگر میں یہ کہوں کہ مجھے میرا آئیڈیل ہی ملا ہے اس وقت بھی تو اس وقت بھی تم مجھے بے یقینی سے دیکھو

گی؟“ روشنا نے اس کی بھوری آنکھوں میں نظریں جمائے استفسار کیا تھا اور نہایت بے رحمی کا شکار ہو کر کافی کے

سب لینے لگی۔ محسوس ہو رہا تھا وہ کافی کی تمام تر خوبی اسیے اندر تار رہی ہو۔

”روشنی! تم مجھے میری وہ روشنا ہرگز بھی نہیں لگیں جو بہت زندہ دل تھی۔“ ایشلہ نے روشنا کو بغور دیکھتے

ہوئے جملہ ادا کیا تھا۔

”ایشلہ ڈنیر! میں وہی روشنا ہوں تمہارا میرے لیے پہلے کی طرح پریشان ہونا اچھا لگا۔“ ایشلہ کے ہاتھوں

کو گر مجوشی سے دباتے ہوئے روشنا نے قدرے تاسف سے کہا تھا۔

”تم میرے لیے اتنا پریشان نہ ہو۔“ روشنا نے کہا۔

”روشنا! تم ذہنی الجھن کا شکار لگ رہی ہو۔ تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے کہہ دو۔ آخر ایسی کیا وجہ رہی

مجھے حرف بہ حرف سب بتاؤ۔“ ایشلہ نے اپنائیت سے کہا تھا۔

روشنا، ایشلہ کا حوصلہ پا کر بیٹے دنوں کی روداد اس کے گوش گزار کرنے لگی۔

”تمہارے ماما، پاپا کے انتقال کے بعد تم سے بھی رابطہ ختم ہو گیا میں بالکل تنہا ہو گئی تھی۔ ہمارا معاہدہ تھا

ہم دونوں کی دوستی میں کبھی کوئی تیسرا فریق شریک نہیں ہوگا۔ میں نے اس معاہدہ کو کبھی نہیں توڑا۔ اسٹڈی

سے بھی ہم فاریغ ہو ہی چکے تھے تمہارے نہ ہونے کے باعث وقت گزرتا ہی نہیں تھا۔ میں ان دنوں سخت

بوریت کا شکار تھی۔ میں نے آرٹ اسکول جوائن کر لیا۔ وہاں میں آرٹ سکھانے لگی۔ وقت اچھا گزرنے

لگا۔ ماما، پاپا، بھیا میری شادی پر زور دینے لگے مگر میں انہیں اپنے آئیڈیل کی بابت کیا بتاتی۔ سب مجھے پاگل

اور خطی سمجھتے میں نے بس اتنا ہی کہا کہ میں ابھی شادی کا ارادہ نہیں رکھتی۔ خاندان کے بے حد اچھے پر پولر

میں نے ریجیکٹ کیے مجھے اپنے آئیڈیل کی تلاش تھی۔ میں بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ جب ہی میرے

پاپا نے مجھے اور ماما کو ایک بزنس ڈنر میں چلنے کے لیے کہا مگر ان دنوں میری پیاری بھابی علیہ تھلیق کے عمل

سے گزر رہی تھیں۔ دن قریب تھے بھیا ان کے ساتھ ہی رک گئے۔ میں بھی بھابی کے ساتھ ہی رکتا چاہتی

تھی مگر پیانے رکنے نہیں دیا۔ میں نہایت بے دلی سے تیار ہوئی کیونکہ میں بھابی کو ہرگز بھی تنہا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس قدر پیاری جو ہیں۔ نہ وہ کبھی روایتی بھابی بنیں نہ میں روایتی بند۔ ہم بالکل بہنوں کی طرح تھے۔ بھابی نے محبت سے میرے گال چھوئے اور مجھے جانے کے لیے کہا میں نے بلیک ڈریس زیب تن کیا اور مہما، پیانے کے ساتھ چل دی۔

پرل پیلس بے حد شاندار تھا۔ مجھے آج تک اپنا وسیع عریض بنگلہ ہی شاندار لگتا تھا مگر پرل پیلس دیکھ کر مجھے اپنا بے حد عالیشان بنگلہ معمولی سا لگا۔ وسیع و عریض لان میں فنکشن آرینج کیا گیا تھا۔ جہاں سبزہ بے حد نمایاں تھا۔ لان کے درمیان میں سوئمنگ پول تھا۔ اس کے اطراف میں رنگ برنگی مسکور کن مہک سے مزین پھولوں کی باڑھ تھی، درختوں و پودوں کی کٹنگ منفرد تھی لان کے عین وسط میں سفید محل بنا تھا۔ اس کے ماتھے پر ”پرل پیلس“ درج تھا۔ پرل پیلس کا آدھا حصہ گریزی سے ڈھکا ہوا تھا۔ تمام ترکٹر کیاں، دروازے گلاس کے تھے مجھے اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ میں کسی خواب محل میں آگئی ہوں۔ میں پرل پیلس کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئی۔ میں نے پیانے سے تعریف کی تو وہ فقط مسکرا کر رہ گئے۔ پارٹی آرگنائز کرنے والے شخص کو میں نے اب تک دیکھا نہیں تھا۔ یا میں ماحول کی دلکشی میں اتنا محو تھی کہ میرے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ مجھے ذرا خبر نہ تھی جب ہی مجھے احساس ہوا۔ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ میں نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا تھا مگر وہاں خواتین اور چند مردوں پر مشتمل گروہ کسی بات پر تہمتہ لگا رہا تھا۔ میں اس پر براجمان ہو گئی منتخب کردہ کرسی پر چھٹی ہونے کے باعث مجھے بالکنی میں بلیک ڈنرسوٹ میں کوئی دکھا تھا۔ بے تحاشہ سبزہ اور آنکھیں چند ہیادینے والی روشنی کے سبب مجھے واضح نہیں دکھ رہا تھا کہ وہاں کون ہے؟ پھر کچھ لمحے بعد بالکنی میں موجود دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اب وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔

میں بام کے پاس جانیٹھی کے سامنے سے وہی بلیک ڈنرسوٹ میں ملبوس شخص دکھائی دیا۔ اس وقت اس کے نقوش واضح تو نہ تھے مگر وہ اب میرے سامنے پیانے سے محو گفتگو تھا۔ اسے دیکھ کر میں بالکل سحر زدہ ہو گئی تھی اس کی شخصیت بالکل چھا جانے والی تھی۔ قد ہائٹ، سرخ سفید رنگت، ذہانت سے بھرپور آنکھیں، ستواں ناک، گلابی لب میں ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ پیانے سحر توڑا۔

”بیٹا! یہ میرے بزنس پارٹنرز یاں واصف ہیں۔ میں نے اپنا نیا بزنس ان کے ساتھ ہی شروع کیا ہے۔ بے حد ذہین واقع ہوئے ہیں۔ مسٹرز یاں واصف بے حد کم عمری سے انہوں نے بزنس سنبھالا ہوا ہے۔“ پیانے تعارف کروایا تھا۔

”اور زیان! یہ میری وائف عافیہ ملک اور یہ میری سویٹ اینڈ کیوٹ ڈائریکٹریٹ ملک جسے رنگوں سے بے حد محبت ہے۔“ پیانے زیان کو ہمارا تعارف کروایا۔ زیان واصف نے مجھ پر اچھتی نگاہ ڈالی اور صرف سلام کرنے پر اکتفا کیا اور پیانے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ میں ہرگز بھی اتنی معمولی نہ تھی کہ زیان اس طرح مجھے نظر انداز کرتا مگر زیان واصف کا گریز میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ آئیڈیلزم کی ماری لڑکی کا آئیڈیل ملے ہی وہ ہواؤں میں اڑنے لگی مگر زیان واصف کا گریز سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ جہاں بھی جا رہا تھا میری نظریں اس کا ہی طواف کر رہی تھیں۔ زیان واصف یہ جان گیا تھا کہ میں مسلسل اسے ہی دیکھ رہی ہوں۔ وہ بھولے سے بھی مجھ پر نگاہ غلط نہیں ڈال رہا تھا۔ ڈنر بھی سرو کیا جا چکا تھا۔ میں بے دلی سے پلیٹ میں چمچہ ہلا رہی تھی۔ میرے اندر کچھ ٹوٹ رہا تھا۔

آئیڈیل ملا بھی تو وہ جو مجھے ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہا۔ میرے دل میں عجیب ”دوسے“ آسمائے

تھے۔ شاید یہ کسی اور سے محبت کرتا ہے اور وہ محبت اس قدر مضبوطی سے اس کے دل میں موجزن ہے جس کے باعث وہ مجھے دیکھنا تک گوارہ نہیں کر رہا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں مگن تھی۔
جب ہی بے بی پنک فیہرک میں 4 سالہ کیوٹی بیچی زیان واصف تک آئی تھی۔
”ڈیڈی! پارٹی کب ختم ہوگی۔“ بے حد لاڈ سے اس کا ہاتھ تھامے بیچی اسے ڈیڈی کہہ رہی تھی۔ میں جو ماما کے ساتھ اس سے گھر جانے کی اجازت لینے آئی تھی۔ بیچی کہ ڈیڈی کہنے پر جھٹکی اور بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ میں اس وقت ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔ زیان واصف نے پہلی بار مجھے بغور دیکھا تھا۔

وہ آنکھوں کی جنبش سے جو دل کی بستی لوٹ گیا
آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں اور ہاتھ سے ساغر چھوٹ گیا
دل اس کا بھی ہے میرا بھی ہے فرق قاتل تو صرف اتنا
وہ پتھر ہے جو ثابت ہے یہ شیشہ تھا جو ٹوٹ گیا
اس کی نگاہیں مجھے بہت کچھ باور کروا رہی تھیں۔ مجھے اب اس کے گریز کی وجہ سمجھ آئی تھی۔ میں نے مضبوطی سے آنکھیں میچ لی تھیں۔ جیسے اس حقیقت سے نظریں جڑا رہی ہوں۔
”او کے میرا بیٹا آپ چلو میں بس ابھی آیا۔“ بیچی کے رخساروں پر پیار کرتے ہوئے اس نے بے ساختہ مجھے دیکھا تھا۔

میرے چہرے پر تاریک سایہ آکر گزر رہا تھا۔ اسے یہ جاننے میں لجنہ بھی نہ لگا تھا کہ میں گہری اذیت کا شکار ہو رہی ہوں۔ اس نے مجھے نظر انداز کیا اور پیپا کو الوداع کہنے لگا۔ میں نے مڑ کر الوداعی نظر اس پر ڈالی تھی۔ میں جان گئی تھی وہ سب اب ہے مگر دل اس سے دستبرداری پر آمادہ نہ تھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا مگر اس کے چہرے سے کچھ بھی اخذ کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کا چہرہ ہر احساس سے میرا تھا۔ میرا دل بند ہونے لگا۔ تو میں دل کی کرچیاں سمیٹتے ہوئے کھوکھلے وجود کے ہمراہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بے بسی پر ماتم کرنے لگی۔

”مجھ سا جہاں میں کوئی نادان بھی نہ ہو
کر کے جو عشق کہتا ہے نقصان بھی نہ ہو
رونا یہی ہے اسے چاہتے ہیں ہم
سعد جس کے ملنے کا امکان بھی نہ ہو“

ان دنوں میں گہری اذیت سے دوچار تھی۔ ذہن ماؤف دل بند ہونے لگا تھا۔ یقیناً اس کی بیوی بھی ہوگی جو اس سے بے حد محبت بھی کرتی ہوگی۔ وہ اپنی بیٹی سے تو بہت محبت کرتا ہے۔ مجھے میرا آئیڈیل ملا بھی تو شادی شدہ جس کے بیوی اور بچے ہیں۔ میں کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہر شے سے دلچسپی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ماما، پیپا، بھابی سب ہی میرے ابا نازل ایکٹ کو ملاحظہ کر رہے تھے مگر وجہ کوئی بھی جان نہیں پایا تھا۔ کیونکہ میں نے بھابی سے بھی کچھ شیئر نہیں کیا تھا۔ انہیں بتانے کے لیے میرے پاس تھا بھی کیا۔ میں لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ ماما، بھابھ، بھابی کے ہمراہ ہسپتال گئے ہوئے تھے اور پیپا بزنس کے سلسلے میں شہر سے باہر تھے۔ میں متوقع خوش خبری پر وقتی طور پر بے حد خوش تھی۔ جب ہی گیٹ کیپر نے مجھے اطلاع دی کہ زیان

دعافہ آئے ہیں۔ وہ کبھی اس طرح ہمارے گھر نہیں آئے تھے۔ اپنی حیرت کو قابو کرتے ہوئے میں نے انہیں گیسٹ روم میں بٹھانے کے لیے کہا اور خود کو کمپوز کرنے چل دی۔

چند منٹوں بعد لوازمات کی ٹرالی تھامے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ جہاں زیان داصف بلیک پیٹ، وائٹ شرٹ میں ملبوس میری پینٹنگ دیکھ رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں جا بجا میری بنائی گئیں پینٹنگز آویزاں تھیں۔ وہ انہماک سے اسے دیکھ رہے تھے۔ میرے سلام کرنے پر ان کی نظروں کا ارتکاز ٹوٹا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا تھا۔

”وعلیکم السلام!“ زیان نے جواب دیا تھا۔ ان کا چہرہ بالکل ساٹ تھا اور نگاہیں اب سامنے وال پر لگی تھیں۔ میں ابھی تک دروازے پر ہی ایستادہ تھی۔ جیسے میں ان کے گھر کے واقعی دروازے میں کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت طلب کرنا چاہ رہی ہوں۔

”آپ کھڑی کیوں ہیں آئیں بیٹھیں۔“ جو مجھے کہنا چاہیے تھا وہ زیان نے مجھے نہایت مودبانہ انداز میں کہا تھا۔

”جی اچھا۔“ کہہ کر میں صوفے میں ٹک گئی۔ وہ میرے عین سامنے صوفے پر براجمان تھے میں نے نظریں نیچی کر لی تھیں۔ مجھے میرا تمام تر کالفیڈنس جانا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”آپ پیاسے ملنے آئے ہیں؟“ آخر ہمت مجتمع کر کے میں نے پوچھ ہی لیا۔

”جی نہیں۔“ زیان نے نہایت بر جسگی سے جواب دیا۔ میں آنکھیں وا کیے حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”میں آپ سے ملنے آیا تھا۔“ زیان نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے؟“ میں نے حیرت سے گنگ ہو کر پوچھا۔

”جی ہاں، میں آپ سے ہی ملنے آیا ہوں۔ جس لڑکی کو رنگوں سے اس قدر محبت ہے۔ یہی اس کی زندگی خوابوں، خیالوں پر محیط ہوگی۔ مجھے آپ کی بارش کی نے سونے نہیں دیا۔ اس لیے میں آپ سے ملنے چلا آیا۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر نہایت نرمی سے کہا تھا۔

”آپ کو اس طرح ہرگز نہیں آنا چاہیے تھا۔ میرے چہرے میں کوئی تاریکی نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی میری وجہ سے آپ کی ٹیم کی ڈسٹرب ہو۔ کم از کم آپ کو اپنی بیوی اور بیٹی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اب آپ اس طرح مجھ سے ملنے بھی مت آئیے گا۔ برائے مہربانی آپ جاسکتے ہیں۔“ میں نے تمام لحاظ و مروت بالائے طاق رکھ کر گویا بات ختم کی۔ مجھے زیان کا یہ انداز ذرا نہ پھایا تھا۔

زیان داصف نے پہلی بار مجھ پر مسکراتی نظر ڈالی تھی۔ جیسے اسے میرے ری ایکشن کے بابت پہلے سے پتا ہو۔ اس کی مسکراہٹ اس جیسی دلکش تھی مگر اس کی اس دلکش مسکراہٹ نے میرا دل جلا دیا تھا۔ کوئی اور لہجہ ہوتا یا وہ شخص میرا نہ ہوتا تو میں اس کی اس مسکراہٹ پر مرثیٰ میں ہرگز بھی کسی کا گھر توڑنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ مجھے معلوم ہے گھر بنانے میں کتنے ارمان کتنے خواب، خواہش کو دان کرنا پڑتا ہے۔ مکان کو گھر بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک عورت بے حد مشکل سے اپنے گھر کو گھر بناتی ہے۔ اپنی محبت اپنے دن اور راتیں تیاگ کردہ اس گھر کو گھر بنے دیتی ہے۔ تو میں کیونکر کسی کا گھر تباہ کرتی۔

مجھے ایسے لوگوں سے ہمیشہ سے نفرت رہی ہے۔ جو کوئی تیسرا فریق بن کر دلوگوں کی محبت میں شریک

ہو جائیں۔ شادی کے بعد ایک عورت کے پاس اس کے شوہر کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے۔ عورت کا تو کوئی گھر ہوتا ہی نہیں۔ میکہ چھوٹ جاتا ہے وہاں کے لوگوں کو بہت خوش ہوں کہہ کر لڑکی کو ہر وقت مطمئن رکھنا ہوتا ہے۔ اگر عورت کے شوہر پر بھی ڈاکہ ڈال لیا جائے تو اس عورت کہ پاس کیا باقی بچے گا؟ ہمیں کوئی حق نہیں دوسروں کی ہنستی بستی زندگی اجاڑ دیں دوسروں کے ارمانوں کے شیش محل میں آگ لگا دیں اور محبت کے اس مقبرے میں بڑے استحقاق سے براہمان ہو جائیں۔ یہ تمام اسباب تھے جو زیان و اصف کو مکمل طور پر میں نظر انداز کر رہی تھی۔

”بے حد اچھی سوچ کی حامل ہیں آپ، آپ کا دل بھی بے تحاشہ خوب صورت ہے۔ میرے نزدیک میرے لیے آپ کی پسندیدگی کچھ خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ بہت سی لڑکیاں آج بھی میری منتظر ہیں مگر آپ مجھے ان سب سے زیادہ مختلف لگی تھیں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رکھ گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں گہرا رنج ہلکورے لے رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے اپنے لب واکے۔ ”میں آج بھی فارعہ سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں۔ جتنی پانچ سال قبل کیا کرتا تھا۔ اس کا اور میرا ساتھ نہایت مختصر رہا۔ ہماری بیٹی انشراح زیان کے پیدائش کے کچھ ماہ بعد ہی فارعہ کی ڈیڑھ ہو گئی تھی۔ وہ تو بے تحاشہ خوش تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی ہمراہی میں بے حد مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ پھر پتا نہیں اس کا زورس بریک ڈاؤن کیوں ہو گیا تھا۔ مجھے آج تک وجہ سمجھ نہیں آئی۔ فارعہ کو یوں کھودینے کا دکھ مجھے آج بھی بے چین کیے رکھتا ہے۔ انشراح کی پرورش میں نے خود کی۔ میری فیملی کے نام پر صرف ایک عدد بیٹی ہے۔ والدین کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ قدم قدم پر محرومیوں نے میرا استقبال کیا۔ اب میں خود میں اتنا حوصلہ نہیں پاتا کہ کسی اپنے کو کھودوں۔ میں اپنی بیٹی کو اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔

آپ کی جانب سے اپنے لیے پسندیدگی دیکھ کر میں واقعی ہول گیا تھا۔ میں ہرگز آپ کو برباد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا جو خود برباد ہو وہ بھلا کیونکر کسی کو برباد کر سکتا ہے۔ آپ کا رنگ و تیلوں سے محبت کرنا اس بات کی یقین دہانی کروانے کے لیے کافی ہے کہ آپ کا دل کس قدر خوب صورت ہے۔ میرے اس دل میں فارعہ نے بسیرا کر رکھا ہے اور دوبارہ میں وہ جگہ کسی کو دے نہیں سکتا۔“ وہ جذب کہ عالم میں میری آنکھوں میں نظریں جمائے کہہ رہا تھا۔ میں یک ٹک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ میرا آئیڈیل کتنا پیارا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں اس کے تمام دکھ چھن لوں۔

”اس لیے میں آپ کو حقیقت سے آگاہ کرنے چلا آیا تا کہ ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہوں۔ اب میں چلتا ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا میرے گلابی چہرے پر اس نے الوداعی نظر ڈالی تھی۔ تمام لوازمات یوں ہی رکھے تھے میں زیان و اصف کی باتوں میں اس قدر من گھڑی کہ انہیں کافی تک کا پوچھ نہیں پائی۔

”کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے؟ فارعہ کی جگہ ہرگز بھی نہیں چاہیے۔ بس مجھے آپ کا ساتھ چاہیے۔“ انہیں جانا ہوا دیکھ کر میں نے بے ساختہ کہا تھا۔ وہ فوراً مڑے تھے۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ اتنی اچھی ہیں۔ آپ کو کوئی بھی اچھا شخص مل جائے گا میری ہمراہی میں آپ تا عمر نہی دامن رہیں گی۔ میں خود ہی داماں ہوں میں کسی کو کیسے خوش رکھ پاؤں گا۔“ وہ میری جانب متوجہ تھا۔

”کوئی بھی کیوں؟ کیا وہ اچھے شخص آپ نہیں ہو سکتے؟“ میں نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں کیونکہ میں اچھا شخص ہرگز بھی نہیں ہوں۔“ زیان واصف نے میری نیلی آنکھوں میں جھانک کر لب بھینچ کر کہا تھا۔

”جیسے بھی ہیں آپ میرے آئیڈیل ہیں اور مجھے میرا آئیڈیل مل گیا ہے۔ میں نے ہمیشہ سے اپنے آئیڈیل سے محبت کی ہے۔ اپنی تمام تر چاہتیں اسی کے لیے بجا کر رکھی ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے میں آپ کو شادی کی آفر کر رہی ہوں مگر آپ یقین جانے یہ میری مجبوری ہے اگر آپ نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں اپنی جان دے دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے میرا گلارندہ گیا تھا اور آنکھیں چٹلک رہی تھیں۔ انہوں نے بے یقینی سے میرے پاگل پن کو دیکھا تھا۔

ان کو مجھ جیسی میچور لڑکی سے اس ری ایکشن کی ہرگز بھی توقع نہ تھی۔ یہ محبت بھی ناں انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی آپ عرش سے فرش پر آ کر گرتے ہو آپ کی عزت نفس، انا کہیں کم ہو جاتی ہے۔ یا آپ اسے ٹھکڑی دے کر سلا دیتے ہو اور آپ اپنے محبوب کے رحم و کرم پر ہوتے ہو کہ وہ آپ کی جھولی میں تھوڑی سی محبت ڈال دے۔ اگر محبوب ایسا کرتا ہے تو آپ ہواؤں میں اڑنے لگتے ہو۔ محبوب کی ذرا سی نظرات التفات آپ میں زندگی بھر دیتی ہے اور محسوس ہوتا ہے اس دنیا میں آپ سے زیادہ کوئی خوش نہیں ہے۔ آپ سے زیادہ کسی کے لیے دنیا خوب صورت نہیں ہے۔ اس نے میرے پاگل پن کو ملاحظہ کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی تھی جیسے وہ ہار گیا ہو۔

”میں اس شرط پر آپ سے نکاح کروں گا آپ میرے گھر میں میری انشراح کی ممان کر آئیں گی۔ آپ مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کریں گی اوکے؟ اپنے گھر والوں کو مطلع کر دیجئے گا کہ میں کل آؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ رکائیں تھا۔ میں زیان واصف کے نام سے منسوب ہونے والی تھی اور مجھے کیا چاہیے تھا۔ میں حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بت بنی بیٹھی تھی۔

”نادانی میں انسان کیسے کیسے غلط فیصلے لمحے میں کر لیتا ہے۔ اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ مستقبل قریب میں یہ نادان فیصلے کون سا رخ دکھائیں گے اگر اسے اس بات کا ذرا بھی ادراک ہو جائے تو انسان بھی ایسے فیصلے نہ کرے۔ مجھ پر بھی ادراک کا یہ درواہ ہونے والا تھا۔“

☆.....☆

”میں جنی کشنکس کا شکار تھی۔ زیان مان تو گئے تھے۔ اب مجھے ماما، پاپا کو راضی کرنا تھا۔ ان لوگوں کو منانا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ میرا خوب یوں پورا ہو جائے گا یہ تو میرے گمان میں بھی نہ تھا۔ ماما، بھابی کے ہمراہ گھر آگئی تھیں۔ اپنے بے حد پیارے اور گول مٹول سے بھینچے کودکھ کر میں بے تحاشا خوش تھی۔ دو دو خوشیاں ساتھ سمیٹ کر میں ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔ بھابی مسکراتی نظروں سے مسلسل مجھے دیکھ رہی تھیں۔“

”کیا بات ہے آج میری گڑیا کچھ زیادہ ہی خوش ہے؟“ بھابی نے میرے ہاتھوں پر نرمی سے ہاتھ رکھے محبت سے استفسار کیا تھا۔

”جی ہاں بھابی! میں خوش نہیں بے حد، بے انتہا، بے تحاشہ خوش ہوں ایک تو پھوپھو بننے کی خوشی اور ایک اور خوشی ہے جس میں آپ کو میرا بھرپور ساتھ دینا ہوگا۔“ میں نے بھابی سے راسب (بھینچے) کو لیتے ہوئے بے حد مسرور ہو کر بتایا۔

”اچھا جی! ایسی کون سی خوشی ہے جس میں مجھے اپنی چندا کا ساتھ دینا ہوگا؟“ بھابی نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔ میں نے من عن تمام باتیں بھابی کے گوش گزار کیں اور یہ بھی کہ زبان کل آئیں گے۔

بھابی گم سم تھیں انہیں میری خوشی عزیز تو تھی مگر وہ شادی شدہ اور ایک بچی کا باپ تھا۔ ماما، پاپا اور بھیا کو راضی کرنا اتنا بھی آسان نہ تھا۔ بھابی ہنوز خاموش تھیں۔ ان کے دلکش چہرے پر سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی۔
 ”بھابی! کیا آپ خوش نہیں ہیں؟“ میں نے ان کی خاموشی سے گھبرا کے ان کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر ان سے استفسار کیا۔

”چندا! میں بہت خوش ہوں کہ تمہیں تمہارا آئیڈیل مل گیا مگر ماما، پاپا اور رضا ضرور احتجاج کریں گے۔“ انہوں نے متفکر لہجے میں کہا۔
 ”بھابی پلیز! آپ ماما کو بتادیں اگر زیان مجھے نہ ملے تو میں واقعی جان دے دوں گی۔“ میں نے زور دے کر کہا اور بھابی کو متفکر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆.....☆

رات ڈنر میں پاپا نے زیان کے متعلق مجھ سے استفسار کیا تھا۔ میں مسلسل خاموش تھی۔
 ”کیا یہی تمہارا آخری فیصلہ ہے روشنا بیٹا؟“ پاپا نے پر تفتیق لہجے میں استفسار کیا تھا۔ میری آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ بھابی نے ماما کو تمام باتیں تفصیل بتا دیں تھیں۔ ڈنر ٹیبل پر ہر ایک موجود تھا۔ بھیا خاموش تھے۔

”بیٹا! انہیں اگر تمہیں لگتا ہے تم زیان کے ساتھ خوش رہ سکتی ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ وہ ایک بے حد سلجھا ہوا شخص ہے۔ مجھے وہ بے حد پسند ہے اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر ہی مجھے تمہارا خیال آیا تھا کہ کاش یہ ایکسٹر اور ڈیزیز اور چینکس شخص میری روشنا کا ہمسفر بن جائے مگر جب مجھے علم ہوا وہ ایک عدد بچی کا باپ ہے میرا اپنا ٹوٹ گیا۔ خیر اگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں کیوں کہ زندگی تمہیں گزارنی ہے ہمیں نہیں۔ واقعی وہ ایک ایماندار انسان ہے۔“

”کیوں رضا؟“ تمام باتیں کہنے کے بعد ان کا رخ اب بھیا کی جانب تھا۔ وہ ان سے تائیدی لہجے میں استفسار کر رہے تھے۔

”جی ہاں! زیان واصل ایک بہترین اور آئیڈیل شخص ہے۔“ بھیا نے بھی مجھے محبت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

میرے دل میں ڈھیروں اطمینان اور سکون اتر آیا تھا۔ میری توقع کے برخلاف سب با آسانی مان گئے تھے۔ بھابی اور ماما نے مجھے بے ساختہ گلے لگایا میری بھابی اتنی پیاری ہیں نجانے انہوں نے کس طرح سب کو راضی کر لیا مجھے اپنی قسمت پر بے ساختہ رشک آیا تھا کہ میرے ارد گرد کس قدر چاہنے والے لوگ موجود ہیں۔ پوری رات جاگتے گزرتے مجھے زیان واصل کا بے صبری سے انتظار تھا۔

☆.....☆

وہ مقررہ وقت پر ڈھیروں مہمانوں کے ہمراہ پہنچے تھے۔ ماما، پاپا، بھیا سب ہی ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ میں بھابی کے پاس بیٹھی راسب کو تھامے ہوئی تھی۔ تب ہی ماما، زیان کے ہمراہ بھابی کے روم میں آئی تھیں۔ ماما، بھابی کے سامنے انہوں نے مجھے ڈائمنڈ رنگ پہنائی تھی۔ ماما اور بھابی نے باری باری مجھے گلے لگایا تھا۔ زیان میری جانب دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اپنائیت کا احساس جاگا تھا۔

”شادی اس مہینے کے آخر میں قرار پائی تھی۔ بری سے تمام تر جوڑے زیان نے مجھے میری پسند سے ڈلوائے

تھے۔ اسی دوران انشراح کے توسط سے پایا تھا۔ اس لیے وہ مجھے اور زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔

اس دوران میں فارغہ کی محی اور بھائی سے بھی ملی تھی۔ وہ لوگ بھی بے حد اچھے تھے۔ ہماری شادی میں بھی انہوں نے شرکت کی تھی۔ میں روشنا ملک سے روشنا زیان بن گئی تھی۔ یہاں تک کہ سفر تو نہایت آسان تھا مگر روشنا زیان سے حقیقت کا سفر بے حد کٹھن رہا۔ میں زیان و اصف کی زیست کا حصہ تو بن گئی اس کی بچی کی ماں بھی بن گئی مگر بیوی نہ بن سکی۔ زیان میرا بہت دھیان رکھتے ہیں مگر ان کے دل میں ابھی تک فارغہ ہے۔ میں کہیں بھی نہیں ہوں۔

روشنا کہ لہجے میں کرب پنہاں تھا۔ تمام تر حقیقتیں آشکار کر کے وہ اپنی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔ مسئلہ بالکل سہل تھا۔

”بہت دیر ہو گئی ہے اب چلنا چاہیے۔“ دونوں کے درمیان جامد خاموشی کو روشنا نے ہی توڑا تھا۔

”تم میرے گھر چلو ناں؟“ مسئلہ نے آفر دی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ روشنا کی روشن آنکھوں کی ویرانی اسے دہلا رہی تھی۔

”پھر کبھی نہیں مسئلہ! انی الحال تو میں یہیں ہوں۔ تمہارے گھر انشاء اللہ ضرور آؤں گی۔“ فون نمبر اچھنچ کیے دونوں کافی شاپ کے باہر نکل آئیں۔

جب ہی بلیک سوک اس سے ذرا فاصلے پر رکھی تھی۔ زیان و اصف کی گاڑی کو رکتا دیکھ کر روشنا بھی وہیں رک گئی۔ جب کہ مسئلہ کی نظریں اسی جانب تھیں۔

گاڑی سے اترتے شخص کو مسئلہ نے بغور دیکھا تھا۔ وہ واقعی روشنا کے تصوراتی بندے سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ مسئلہ کو اسے دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اپنی دوست کے لیے اس کے دل سے ڈھیروں دعا نکلتی تھی۔

”روشنا! آپ یہاں؟“ زیان نے تعجب سے استفسار کیا۔

”جی گھر میں بورہور ہی تھی تو واک پر نکل آئی۔ وہیں میری فرینڈ مسئلہ مل گئی۔ میٹ مائی فرینڈ مسئلہ شہروز۔“

روشنا نے زیان سے مسئلہ شہروز کا تعارف کروایا۔

”السلام وعلیکم!“ مسئلہ نے سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام!“ زیان نے نرمی سے جواب دیا۔

”کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ زیان نے مسئلہ سے پوچھا تھا۔

”اللہ کا کرم ہے ٹھیک ہوں۔“ مسئلہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ مسئلہ نے دونوں کو اپنے گھر چلنے کے لیے بھی کہا تھا۔

Next time کا کہہ کر زیان نے معذرت کر لی تھی۔ زیان نے مسئلہ کو گھر ڈراپ کرنے کی آفر بھی کی مگر مسئلہ نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ شہروز لینے آئیں گے۔ دونوں اسے الوداع کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

☆.....☆

”یہ آپ کی کون سی فرینڈ تھی؟“ کارٹن کرتے زیان کا انداز استفہامیہ تھا۔

”میری ایک ہی تو فرینڈ ہے مسئلہ شہروز تصویریں تو آپ نے دیکھ رکھی ہیں۔“ روشنا نے جواب دیا۔

”یہ وہ تصویریں والی لڑکی ہے۔ کاپی بدل نہیں گئی؟“ زیان کے ذہن میں وہی پتلی، سانولی سی لڑکی گھوم گئی۔ جس کے ساتھ روشنا کی بے شمار تصویریں تھیں مگر اب تو گوری، دکتی رنگت، ہری بھری متناسب جسامت کے ساتھ وہ بالکل الگ ہی لگتی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ بجسٹ [137] دسمبر 2016ء

”ہاں واقعی بدل تو گئی ہے۔ توجہ اور محبت اچھے اچھے اچھوں کو بدل دیا کرتی ہے۔“ روشنا نے یہ کہہ کر نظریں منوڑ لی تھیں۔ زیان واصف نے بے ساختہ اسے دیکھا تھا۔ ان دلکش نینوں میں چلتے مڑگان دہلیز عبور کر کے ان آنکھوں کے پہرے دار بن گئے تھے۔ زیان اسے مین گیٹ پر ہی چھوڑ کر کارزن سے بھگالے گیا۔ روشنا تھکے قدموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی۔

☆.....☆

شام ڈھلے جب وہ گھر آیا۔ روشنا کو لیپ ٹاپ پر مصروف پایا۔ وہ روزانہ رات کے وقت ہی گھر آیا کرتا تھا۔ آج کچھ Documents گھر میں رہ گئے تھے۔ وہی لینے کے لیے بے وقت گھر آیا تھا۔ روشنا کو لیپ ٹاپ پر انشو کے ساتھ مصروف پا کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ روشنا کو زیان کو دیکھ کر یوں لگا کہ جیسے اسے کسی نے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔

”می! کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہو گئیں؟“ Imo یہ انشو نے روشنا کی عدم توجہ پا کر استفسار کیا تھا۔ لیپ ٹاپ کا رخ دروازے کی جانب نہ تھا جب ہی انشو زیان کی آمد سے بے خبر تھی۔ زیان نے بھی روشنا کو مخاطب نہیں کیا تھا۔

”کچھ نہیں جانو۔“ روشنا نے نا سمجھی کے انداز میں کہا۔

”مس یومی! آپ کو پتا ہے ڈیڈی مجھے بالکل بھی یاد نہیں کرتے جب کہ آپ مجھ سے روزانہ بات کرتی ہیں۔“ انشو نے منہ بسورتے ہوئے کہا تھا۔

”جیٹا! ڈیڈی مصروف ہوتے ہیں ناں اس لیے۔“ روشنا نے بغور زیان کو دیکھا تھا۔

”اتنے بھی مصروف نہیں ہوتے۔ ڈیڈی وہ مجھے مس ہی نہیں کرتے۔“ انشو کے لہجے میں حسرت تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے آج آپ کے ڈیڈی آپ کو کال کریں گے۔“ روشنا نے گول مول جواب دیا کہ زیان واصف نے چھٹی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”او کے می! گرینی مجھے بلارہی ہیں۔ کل اسی وقت آن لائن ہو جائیے گا۔ لو یومی بائے۔“

”لو یو ٹو بیٹا۔ اپنا خیال رکھنا۔“ کہہ کر روشنا نے لائن منقطع کر دی تھی۔ لیپ ٹاپ آف کیے روشنا کا رخ اب زیان کی جانب تھا۔ زیان کام میں مصروف تھا۔

”آپ کو کچھ چاہیے؟ چائے وغیرہ؟“ بالوں کو کچر میں مقید کرتی روشنا کا انداز سوالیہ تھا۔

”جی نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ زیان کا انداز برا لگا تھا۔ روشنا نے بغور اسے دیکھا تھا۔

”بائی داوے میری بیٹی کب سے imo پر آن لائن ہونے لگی اور مجھے مطلع کرنا بھی ضروری خیال نہیں کیا آپ نے؟“ زیان نے فائل بند کرتے غضبناک ہو کر پوچھا تھا۔

”روزانہ اس وقت ہماری بات ہوتی ہے۔ آپ کو فرصت کب ہے؟ صبح کے گئے آپ کی واپسی رات کو ہوتی ہے۔ آپ کو خود سے دور بیٹی کا ذرا بھی احساس اور پرواہ ہے؟“ روشنا نے تمام لحاظ بالائے طاق رکھ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے آئینہ دکھایا تھا۔

”میں مصروف رہتا ہوں کم از کم آپ مجھے باخبر ہی کر دیتیں۔“ زیان نے اس بار لہجے کو نرم کرتے کہا تھا۔

”آپ مجھے فارغ ملیں تب میں آپ سے کچھ کہوں ناں۔ آپ کو کالز میسنگز اور بزنس ڈنر سے فرصت نہیں ہوتی۔“ روشنا یہ کہہ کر رکی نہیں تھی بلو آچل کندھے پر ڈالے وہ کمرے سے نکلی تھی۔ زیان نے اس کے تپور کو بغور

ملاحظہ کیا تھا۔ غلطی اس کی تھی اپنی غلطی پر شرمسار ہوتے اس نے فارغہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ یہ ہی نمبر تھا جس سے بات ہوا کرتی تھی نمبر ڈائل کرتے تاریک سایہ اس کے چہرے سے گزرا تھا۔ فارغہ بے ساختہ یاد آئی تھی۔ اس کی یادوں سے نظریں چراتے انشراح سے چند یاتیں کر کے وہ روشنا کو یکسر نظر انداز کیے بزنس میننگ کے لیے نکلا تھا۔ روشنا کی اس کی زندگی میں حیثیت ہی کیا تھی۔ اس کے ہونے نہ ہونے سے زیان و اصف کو کچھ خاص فرق کب پڑتا تھا۔

☆.....☆

کچھ دیر قبل ہی زیان کی واپسی ہوئی تھی۔ وہ اسٹڈی میں موجود تھا۔ تمام وقت اس کا اسٹڈی روم میں ہی گزرتا تھا۔ روشنا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال سنوار رہی تھی۔ جب اس کی سوچ میں مسئلہ شامل ہو گئی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسئلہ سے اپنا موازنہ کرنے لگی۔

یونیورسٹی میں اسے بیوٹی کون کا ٹائٹل ملا کرتا تھا۔ مسئلہ، روشنا کے مقابلے میں قدرے کم تھی مسئلہ کا متوسط طبقے سے تعلق تھا۔ اس کے پاس اتنی آسائشیں بھی نہ تھیں مگر اب تو مسئلہ کی جھپ ہی نرالی تھی۔ محبت نے یہ دنیا بدل دیا ہے اسے اس کے چہرے پر کس قدر الوہی کی جھک تھی۔ اس کی سب انولی رنگت دودھ کی مانند دمک رہی تھی۔ روشنا نے بے ساختہ آئینے سے نظریں چرائی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، گوری رنگت زردی مائل ہو چکی تھی۔

”مسئلہ محبت کے ہاتھوں آباد اور میں محبت کہ ہاتھوں برباد ہوئی۔“ اس کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی تھی۔ جب ہی ماضی کی یادیں جھلکنے لگیں۔

☆.....☆

مسئلہ کے گھر والوں نے اس کا رشتہ شہروز سے طے کر دیا تھا۔ جو بے حد معمولی شکل و صورت کا نو جوان تھا۔ وہ تو مسئلہ کے پاسنگ بھی نہ تھا۔ بہت گہرا رنگ وہ ذرا بھی ہینڈ سم نہ تھا۔ مسئلہ کا بھی ایک آئیڈیل تھا جو روشنا سے کچھ حد تک مماثل تھا مگر اس کے باوجود بھی مسئلہ نے شہروز کے لیے حامی بھر دی تھی۔ وہ C.A کرنے کے بعد آسٹریلیا، اسکاٹ لینڈ و دیگر ممالک سے ڈگریز لے کے لوٹا تھا۔ وہ بے حد ذہین نو جوان تھا۔ ان دنوں وہ اسلام آباد میں سیشنل تھا۔ مسئلہ کا راضی ہونا روشنا کے لیے باعث حیرت تھا۔ جب ہی غصے سے بھری وہ روشنا کے گھر پہنچی تھی۔

”تم نے شہروز بھائی کے لیے ہامی کیسے بھری مسئلہ؟ وہ تمہارے آئیڈیل سے کسی طرح میچ نہیں کرتے۔ وہ تو تمہارے پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ مانا کہ وہ بے حد ذہین ہیں مگر وہ اس جیسے ہرگز بھی نہیں ہیں جسے تم نے چاہا تھا۔“ روشنا ہنوز غصے میں تھی۔

”وہ خواب تھا بکھر گیا، خیال تھا ملا نہیں

دل کو میرے کیا ہوا، یہ کیوں بجھا پتا نہیں“

”میں کیا کروں روشنا! میرے ماما، پاپا نے بے حد مان سے میرے لیے شہروز کو منتخب کیا ہے۔ میں ہرگز بھی انکار نہیں کر سکتی میرے والدین کی تمام تر امیدیں مجھ سے ہی تو وابستہ ہیں۔ یقین کرو میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مجھے اپنے آئیڈیل سے کب محبت ہوئی مجھے اس کا علم نہیں۔ شہروز کے ساتھ پوری زندگی گزارنا میرے لیے دشوار ضرور ہو گا مگر ناممکن ہرگز نہیں مگر انشاء اللہ میں ان کے ساتھ ایڈ جسٹ ہونے کی اپنی بھرپور کوشش کروں گی

اپنے والدین کا مان میں ہرگز نہیں توڑوں گی۔“ امثلہ نے بھیکے لہجے میں کہا تھا۔ اداسیوں نے اس کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔ اس کے لہجے میں صدیوں کی تسکین تھی۔

”امثلہ! میں انکل، آنٹی کو منالوں گی۔ وہ شہروز بھائی اور ان کی فیملی کو منع کر دیں گے۔“ روشنا نے ایک بار پھر سمجھانے کی سعی کی تھی۔

”نہیں روشی! شہروز نے کسی کے دباؤ میں آکر نہیں بلکہ اپنی پسندیدگی سے میرے لیے رشتہ بھیجا ہے۔ ماما، پاپا کے مطابق شہروز میرے لیے پرفیکٹ ہیں۔ وہ مجھے بے عمر خوش رکھیں گے۔ تم میرے لیے دعا کرو میں ہمیشہ خوش اور مطمئن رہوں اور اپنے والدین کا مان بھی نہ توڑوں۔“

”جس کے خواب سجائے تھے وہ ملا نہیں

قسمت کا فیصلہ جان لیا اب، ہمیں کسی سے گلہ نہیں“

امثلہ نے تمام تر باتیں بے بسی سے اس کے گوش گزار کی تھیں۔

”تم میری سمجھ سے بالا رہو امثلہ! مجھے اس سے تم پر بے انتہا غصہ آرہا ہے۔ خیر یہ تمہاری خود کی زندگی ہے میں صلاح دے سکتی ہوں۔ عمل کرنا تمہارا خود کا کام ہے اگر مجھے میرا آئیڈیل نہ ملا تو میں مرنا قبول کروں گی مگر کسی ان چاہے شخص کا ساتھ قبول کرنا نہیں۔ مجھے اپنے آئیڈیل سے محبت نہیں عشق ہے۔ تم اپنے آئیڈیل سے اتنی جلدی و ستبر دار ہو جاؤ گی اس بات کا مجھے گمان تک نہ تھا۔“ روشنا نے نہایت تنفر سے کہا تھا۔

”روشنا! چھوڑو یہ آئیڈیل کی باتیں یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ اس آئیڈیل کی وجہ سے تمہیں تہی دامن کی سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔ مجھے واقعی سبق مل چکا ہے۔ جو میرا کبھی تھا ہی نہیں اس کے پھڑ جانے کا ملال کیا کرنا۔ جو صرف میرا اپنا ہے مجھے اس کے لیے جینا ہے۔“ امثلہ نے روشنا کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اپنے فیصلے پر قائم و دائم تھی۔

”یہ سب حقیقت ہے امثلہ! کوئی کتابی باتیں نہیں۔ تم ایک دن مجھے میرے آئیڈیل کے ساتھ دیکھو گی۔ اس وقت میرے چہرے اور ہر اک انداز میں دلکشی پنہاں ہوگی اور تمہیں مجھے دیکھ کر ضرور رشک ہوگا۔ شہروز کے لیے اگر منع کر دیتی تو یقیناً میرا آئیڈیل بھی میرے ہمراہ ہوتا۔“ روشنا نے ایک جذب کے عالم میں یہ سب کچھ کہا تھا اور رکی نہیں تھی۔ امثلہ نے بے یقینی سے روشنا کی جانب دیکھا تھا۔ جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا ہو۔ روشنا آئیڈیل بناتے بناتے امثلہ سے بہت آگے نکل چکی تھی اور اپنی عزیز از جان سہیلی کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے ان زخموں کو کیرید رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اسے چیلنج کر رہی تھی۔

”ضرور، روشنا اس دن کا مجھے بے خبری سے انتظار ہوگا۔ جب میں تمہیں تمہارے آئیڈیل کے ہمراہ دیکھوں اور تمہاری قسمت پر مجھے رشک ہو۔“ امثلہ نے آنسوؤں سے بھیکے لہجے میں بے ساختہ کہا تھا۔

جسے سن کر روشنا کے پیروہیں جم گئے تھے۔ وہ امثلہ تک آئی تھی اور دونوں سہیلیاں ایک دوسرے کو خود میں بھینچے تا دیر روتی رہیں۔ امثلہ اپنا سپنا ٹوٹ جانے پر ماتم کناں تھی اور روشنا، امثلہ کے دکھ میں دکھی ہو کر نیر بہا رہی تھی۔

☆.....☆

”امثلہ مجھے میرا آئیڈیل تو مل گیا مگر میرے انداز میں کوئی دلکشی نہیں ہے۔ دلکشی تو تمہارے اک اک

انداز میں پنہاں ہے۔ اپنی داستان میں گم ہو کر میں تمہاری لائف کے بابت تو پوچھنا ہی بھول گئی مگر تمہیں دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ میری امثلہ بے حد مطمئن ہے۔ اللہ تمہیں بے حد خوش رکھے امثلہ۔

”مجھے میرا آئیڈیل تو مل گیا مگر رشک مجھے تمہاری قسمت پر ہو رہا ہے۔“ آئینے میں خود کو دیکھتے روشنائے خود کلائی کی تھی۔ وال کلاک کے الارم سے اس کا سحر ٹوٹا تھا۔ گھڑی رات کے تین بج رہی تھی۔ زیان واصف دیر تک جاگنے کا عادی تھا۔ روشنائے اکثر آدھی رات کو چائے، کافی کا پوچھ لیا کرتی تھی۔ اسی غرض سے اس نے کمرے سے منسلک اسٹڈی کا دروازہ ناک کیا تھا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اسٹڈی روم مکمل طور پر گھپ اندھیرے میں گم تھا۔ اس نے ٹول کر سوچ بورڈ تلاشا۔ ٹین دباتے ہی کمرہ پوری طرح روشنی سے منور ہو گیا۔ زیان صوفے پر آڑا تر چھالینا تھا۔ اس کے سینے پر فارصہ کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔

جسے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا رکھا تھا۔ لیوں پر دھیمی سی مسکان تھی۔ جسے دیکھ کر روشنائے کو یہ جاننے میں لمحہ بھی نہ لگا کہ وہ خوابوں میں فارصہ کے ساتھ کمن ہے۔ اس نے نہایت کرب سے یہ منظر دیکھا اور دروازہ کھلا چھوڑ کر بیڈ کے سائیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

”سمجھے تھے دوسروں سے بہت مختلف تھے

کیا مان لیں کہ تو بھی ہمارا نہیں رہا

تم اعتبار اس کے لیے کیوں اواس ہو

اک شخص جو کبھی بھی تمہارا نہیں رہا“

آنسو تو اترے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ پوری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔

”زیان واصف! میں تم سے شکوہ بھی نہیں کر سکتی کہ تم مجھ سے زیادہ فارصہ کو کیونکر اہمیت دیتے ہو۔ جواب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ میں تو جیتا جاگتا وجود ہوں جسے صرف تمہاری محبت اور تھوڑی سی توجہ درکار ہے مگر یہ خاردار راہ میری خود کی منتخب کردہ ہے۔ تم نے مجھے پہلے ہی یہ باور کروادیا تھا کہ تمہارے دل میں صرف فارصہ ہے۔ میں نے تو صرف اور صرف تمہارا ساتھ مانگا تھا۔ جو بخوبی تم نے مجھے دیا اب معاہدے سے یہ دل کیوں مکر رہا ہے۔

اس کے گولڈن براؤن بالوں سے پورا چہرہ ڈھکا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر وہ زیان کی تصویر تھا۔ ارگرد سے بے نیاز زاہد قطار رو رہی تھی۔ جب ہی زیان اسٹڈی روم سے نکل کر روشنائے آیا تھا۔ فارصہ کی تصویر جواب بھی اس کے ہاتھوں میں تھی۔ زیان نے پہلے اپنا پھر روشنائے کا ہاتھ دیکھا۔

”روشنائے! آپ رو کیوں رہی ہیں؟“ پانی گلاس میں اٹھیلے اس نے استفسار کیا تھا۔ اپنی تصویر اس کے ہاتھوں میں دیکھ کر اس نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔ اسے وجہ جاننے میں فقط کچھ بل ہی لگے تھے۔

”براخوب دیکھ لیا تھا۔“ ایک ہی گھونٹ میں پانی کا گلاس خالی کر کے روشنائے جواب دیا۔

”کبھی تو نے خود بھی سوچا کہ یہ پیاس ہے تو کیوں ہے

تجھے یا کہ بھی میرا دل اواس ہے تو کیوں ہے

آنکھوں کی سرخی رت جگے اور مسلسل رونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ ”براخوب“ کے کہہ رہی تھی۔ زیان بخوبی اس سے واقف تھا۔

”اب آپ سکون سے سو جائیں میں یہیں ہوں۔“ بیڈ کے دوسری جانب بیٹھتے ہوئے زیان نے ملائمت

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

سے کہا۔ کبیل گردن تک تان کر روشنائے سختی سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ زیان واصف نے نہایت کرب سے اس پاگل لڑکی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھوں سے اپنی مسکراتی تصویر لیتے ہوئے تاریک سایہ اس کے چہرے پر لہرایا تھا۔ یہ وہی تصویر تھی جو فرسٹ ویڈیو ایڈیٹری میں فارغہ نے چھپی تھی۔ وہ دونوں تصاویر تھامے گم صم بیٹھا تھا۔ نگاہیں روشنائے حزن زدہ چہرے پر مرکوز تھیں۔ جہاں سب کچھ پا کر کھودینے کا گہرا رنج موجود تھا۔ زیان واصف نے نظریں چرا کر رنج دوسری جانب موڑ لیا۔

☆.....☆

صبح معمول کے مطابق وہ سویرے ہی جاگی تھی۔ زیان کو جگا کر اس نے کچن کا رخ کیا۔ گھر میں ملازمین موجود تھے مگر کوکنگ وہ خود ہی کیا کرتی تھی۔ آلیٹ بناتے ہوئے اس کے سیل فون نے رنگ کرنا شروع کر دی۔ اس نے Yes کا بٹن پریس کر کے سیل فون کانوں سے لگا لیا۔

”السلام علیکم! جی کون؟“ آلیٹ کا آمیزہ فرانگ بین میں ڈالتے ہوئے روشنائے استفسار کیا تھا۔ ”جی کون کی بچی میں امثلہ تمہاری اکلوتی عزیز از جان دوست۔ محترمہ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ امثلہ نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

”میرے مزاج تو بخیر ہیں تم بناؤ۔“ روشنائے مصنوعی بشتا سے کہا۔ رات بھر رونے کے باعث اس کی آواز ٹھیک طرح سے نکل نہیں رہی تھی۔

”اگر کسی نے پوچھ لیا اداسیوں کا سبب تو موسموں کا گلہ کر کہ ٹال دیں گے ہم“

”مجھے تو تم ہرگز بھی خیریت سے نہیں لگ رہی ہو روشنائے کم از کم مجھ سے جھوٹ کہنے سے گریز کیا کرو۔ خیر آج ڈنر پر تم زیان بھائی اور انشراح انوائٹڈ ہو۔ شہروز بھی میری پیاری سہیلی سے ملنا چاہتے ہیں۔“ امثلہ نے کلکھلاتے ہوئے کہا۔ شہروز کا نام لینے سے اس کا لہجہ ہی الگ تھا۔

”پہلے زیان سے تو پوچھ لوں۔ نہیں وہ مصروف نہ ہوں اور ڈنیر انشراح میری جان تو اپنی نانی کے گھر لاہور گئی ہوئی ہے۔“ روشنائے معذرت ہوتے کہا۔

”انشو آجائے تو پھر اسے نیکسٹ ٹائم ساتھ لانا۔“ امثلہ نے کہا۔ ”ہاں ضرور میں زیان سے پوچھ کر تمہیں کنفرم کر دوں گی۔“ روشنائے کہتے ہوئے کچن سے منسلک ڈائننگ پر لوازمات سجائے۔

”کیا کر رہی ہو تم؟“ امثلہ نے پوچھا تھا۔

”ابھی تو میں زیان کے لیے ناشتا لگا رہی ہوں۔ تم بھی ناشتا کر لو۔“ روشنائے محبت سے کہا۔

”جانو! میں ناشتا کر چکی۔ شہروز آفس اور ارمغان اسکول جا چکے۔ اب عثمان کو ناشتا کروا رہی ہوں۔“

امثلہ نے جواب دیا۔

”ویری گڈ کالی بزی روٹین ہے تمہاری۔“ روشنائے کہا۔

”بچوں کی وجہ سے مصروفیت بڑھ جاتی ہے۔ حالانکہ شہروز تو مجھے یہ سب کرنے سے منع کرتے ہیں۔ پر

تمہیں پتا ہے ہم سے فارغ رہا نہیں جاتا۔“

”ہاں یہ تو ہے میرا بھی کچھ یہی حال ہے۔“ روشنائے جواب دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ انجسٹ [142] دسمبر 2016ء

”تم مجھے زیان بھائی سے کنفرم کر کے جلدی بنا دو اپنا دھیان رکھنا اللہ حافظ۔“ کہہ کر امثلہ نے لائن منقطع کر دی تھی۔ روشنا اس کے آواز کے سحر میں کھوس گئی اس کی ہنسی اس قدر مترنم تھی۔ لگا ماحول میں جلت رنگ سے بج اٹھے ہیں۔

”کیا ہوا آپ اس طرح کیوں کھڑی ہیں؟“ زیان واصف نے بلیک رسٹ وائچ کلانی میں باندھتے ماتھے پر بل ڈالے بت بنی روشنا سے استفسار کیا۔

”کک..... کک..... کچھ نہیں امثلہ کی کال آئی تھی۔ اس نے ہمیں آج ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔“ روشنا نے گنگنا کر جواب دیا۔ زیان واصف نے بغور سے دیکھا۔ وہ ڈانٹنگ کی کرسی گھسیٹتے مستفل اسے دیکھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر چلیں گے ہم۔“ زیان نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”کیا واقعی؟“ اس نے سرور ہوتے بے یقینی سے استفسار کیا۔ زیان واصف نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے پانی کا گھونٹ بھرا۔

”اتنی چھوٹی سی بات پر خوش ہو جاتی ہے۔“ اس کی بے معنی سی خوشی میں اس کا انداز قابل دید تھا۔ آج اس چھوٹی سی خوشی کو یا کر اس کا انداز ہی الگ تھا۔ زیان واصف نے بریک فاسٹ کرتے اور آفس جانے تک اس کے پر سر ت انداز کو بغور ملاحظہ کیا تھا۔

☆.....☆

وہ پین اور ڈائری تھاے رائٹنگ ٹیبل پر جھکی ہوئی تھی۔ اسی وقت زیان واصف ٹائی کی ٹائٹ ڈھیلی کرتے کمرے میں داخل ہوا۔

”پلیز ایک کپ کافی بنادیں۔“ ٹائی بیڈ پر اچھا لتے زیان نے کہا۔ زیان نے پہلی مرتبہ خود کافی کی فرمائش کی تھی۔

”جی ابھی لائی۔“ وہ بے یقینی وحیرت کے ملے جلے تاثرات کے ہمراہ پین، پیڈ، رائٹنگ ٹیبل پر چھوڑے کافی بنانے چل دی۔

زیان واصف جو شاور لینے کے ارادے سے واش روم کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پیڈ پر درج عنوان ”خواہش“ پر ٹھٹھکا تھا اور اس کی لکھی گئی نظم کو بغور پڑھنے لگا۔

”خواہش“

”تم کبھی تو مجھ سے پیار جتاتے
تجہاں راہوں میں ہمیشہ ساتھ نبھاتے
تمہیں شوخ رنگ مجھ پر بھاتے
ارد گرد تم میرے اکثر منڈلاتے
اپنی چاہتوں کا احساس بار بار دلاتے
اپنی شدتوں کا برملا اظہار کر جاتے
بڑے چاہو اور ارمان سے مجھے اپنا بناتے
تم کبھی بھی نہ مجھ کو ستاتے
روٹھ جانے پر اکثر تم مجھے مناتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

رواڈ انجسٹ [143] دسمبر 2016ء

کسی غلطی پر بھی نہ تم مجھے رلاتے
کافی کی فرمائش کرنے اکثر آتے

میرے دکھ و روتھ نہ پاتے
میری بے تکی باتوں پر انہماک سے تم سر ہلاتے
کانوں میں دھڑکن نغمہ گنگناتے
کاش تم میرے سپنوں جیسے ہوتے تو
ون یونہی گزرتے ہنستے مسکراتے

”روشنا تم نے مجھ سے عشق میں اپنے جذبات کاغذوں کے نذر کرو دیے۔ تم اور کروگی بھی کیا۔ میں خود تہی
واماں ہوں بھلا تمہارے دامن میں خوشیاں کیسے بھروں۔“ زیان نے خود کھائی کی تھی۔

☆.....☆

وہ لوگ مقررہ وقت پر ڈنر میں پہنچے تھے۔ امثلہ اور شہروز نے ان کا پرتپاک استقبال کیا تھا۔ شہروز بھتی نے
زیان و اصف سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ روز و لا قابل دید اور انیسویں ڈیزائننگ قابل دید تھا۔ چھوٹا مگر خوب
صورت سالان گریزی سے بھر پور تھا۔ لان کے درو دیوار بوگن ویلیا کی بیلوں سے آراستہ تھے۔ پورے لان
میں رات کی رانی کی مسکور کن مہک چھائی ہوئی تھی۔ لان کے آوے حصے میں شیڈ ڈالا ہوا تھا جو کہ امریکن اسٹائل
کا تھا۔ اس جانب بچوں کا پلے ایریا تھا۔ اس کی دوسری جانب مصنوعی تالاب بنا ہوا تھا۔ جس میں رنگ برنگی
ڈھیروں مچھلیاں موجو تھیں۔ سامنے ہی وڈیروڈن ماربل ہاؤس تھا۔ جس کے ماتھے پر ”روز و لا“ درج تھا۔ مین
گیٹ کے اطراف میں ریڈ، اورنج، یلو، پنک روزیز کے امتزاج کے پودے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے جو
روز و لا کی دلکش کو چار چاند لگانے کے لیے کافی تھے۔ گلاب کے پودوں نے روز و لا کو خوب صورتی سے ہمکنار کر
رکھا تھا۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی زیان اور روشنا گھر کے باذوق مکینوں کو سراپے بنا نہیں رہ سکے تھے۔

تمام درو دیوار مہنگی لکڑی سے بنائے گئے تھے۔ زیان کے گھر کو دیکھ کر روشنا بے حد متاثر ہوئی تھی اور اب
امثلہ کا گھر دیکھ کر وہ انسا پڑ ہوئے بنا نہیں رہ سکی۔ امثلہ کے انداز سے ہر گز بھی عمارت کا غرور نہیں چھلکا تھا۔
ماحول کی دلکشی کو اپنی آنکھوں میں جذب کرتے زیان و اصف نے بے ساختہ سراہا تھا۔

”شکر یہ ہماری پیاری سی وائف کو گھر سنوارنے کا بے انتہا شوق ہے۔ میرے مکان کو انہوں نے ہی تو گھر
بنایا ہے۔“ شہروز نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے شرارت سے امثلہ کو دیکھتے ہوئے کہا جو سرخ جوڑے میں خود بھی
سرخ ہو گئی تھی۔

زیان و اصف نے بغور اس لوگ کپل کو دیکھا تھا۔ پھر اس کی نگاہ روشنا تک گئی تھی۔ جس کے چہرے پر اس
خوشی کا شائبہ تک نہ تھا جو اسے امثلہ کے چہرے میں دکھا تھا۔

☆.....☆

”آسیب زوہ گھر کا میں وہ ور ہوں محسن
ویمک کی طرح کھا گئی جیسے وستک کی تمنا
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں یہ عجیب عجیب چھپا ہے
میں جس شخص کو چھو لوں وہ میرا نہیں رہتا“

روشنا پراچنتی نگاہ ڈال کر وہ شہروز کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ جو کے بلیک بیٹی، بلیک صوفہ سیٹ سے آراستہ تھا۔ اسکاٹی بلیو قالین، پردے، ڈیکوریشن پینر تک اسکاٹی بلیو تھے۔ ڈرائنگ روم بلیک اینڈ اسکاٹی بلیو کنٹراس کا بہترین امتزاج تھا۔ سامنے ہی ایکوریم میں مٹی مچھلیاں ادھر ادھر پھر رہی تھیں مختصر ان کی یہ چھوٹی سی جنت ان کے لیے بے انتہا چاہت و محبت کی غماز تھی۔

امثلہ اور روشنا بھی ڈرائنگ روم میں براجمان تھیں اور اپنی ہی باتوں میں مگن تھیں۔
 ”زیان! یہ دونوں خواتین ہمیں ہرگز بھی بات کرنے کا موقع فراہم نہیں کریں گی۔ چلو ہم ہی لان میں چلتے ہیں۔“ شہروز تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔ زیان نے بھی جوس کا گلاس خالی کرتے اس کی تقلید کی تھی۔ دونوں سہیلیاں فقط مسکرا کر رہ گئیں اور دوبارہ سے اپنے بیٹے دنوں کے قصے یاد کرنے لگیں۔

”زیان! آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟“ لان میں زیان کے ساتھ چلتے ہوئے شہروز نے استفسار کیا تھا۔
 ”میری کوئی خاص مصروفیات تو نہیں ہیں۔ MBA اور MCOM کرنے کے بعد کراچی میں اپنی ایک فرم چلا رہا ہوں۔ فی الحال اسلام آباد میں بھی اپنا دوسرا بزنس سیٹ کر رہا ہوں۔ ارادہ تو کب سے تھا مگر مصروفیات کچھ زیادہ تھیں۔ اب وہاں سے تھوڑا ریلیکس ہوا تو فوراً اسلام آباد آنے کا ارادہ کر لیا۔ میں اکیلے ہی آنے کا سوچ رہا تھا مگر یہاں کام زیادہ تھا اسی لیے روشنا کو ساتھ لے آیا۔ تھوڑی مصروفیات کم ہوں تو اسے شمالی علاقہ جات دکھانے لے جاؤں گا۔“ زیان واصف نے تفصیلاً جواب دیا۔

”ہوں ویری گڈ! ایسے ٹورز تو لازمی ہونے چاہیے۔“ شہروز نے سراہا تھا۔
 ”تمہاری کیا مصروفیات ہیں؟“ زیان واصف نے بھی شہروز کی تقلید کرتے تمام لحاظ بالائے طاق رکھ دیئے تھے۔

”یہ ہوئی ناں یاروں والی بات۔“ شہروز نے زیان کا ہاتھ گرجوشی سے دبایا تھا۔
 زیان واصف کو یہ صاف گوانسان بے حد اچھا لگا تھا۔ رنگت کالی تھی تو کیا ہوا دل تو آئینے کی طرح صاف و شفاف تھا۔ بلیک چینٹ، لیمن شرٹ اور بلیک ٹائی لگائے شہروز کافی اچھا لگ رہا تھا۔
 ”میری مصروفیات تو بے تحاشہ ہیں یار! CA کرنے کے بعد ایڑاؤں سے دیگر کورسز کیے۔ وہاں جاب بھی کی، مائز بھی کھول رکھے ہیں۔ جن کی وجہ سے وقت بے حد کم ملتا ہے۔ اس لیے سال میں دو ٹورز اپنی وائف اور بچوں کے لیے رکھتا ہوں۔ ابھی سنڈے کو ہی ہم آسٹریلیا سے آئے ہیں۔ امثلہ کو سنڈی دیکھنے کا بے حد شوق تھا تو ہم نے وہاں 15 دن گزارے۔ اب انشاء اللہ حج کا ارادہ ہے۔“ شہروز نے بتایا۔

”Shopping city میرے پسندیدہ مائز میں سے ہے۔ تمہارا کلیکشن بے حد اچھا ہے۔ خوشی ہوئی کے میرے پسندیدہ مال کے مالک تم ہو۔ تمہارے خیالات بھی بہت اچھے ہیں یار انشاء اللہ حج ٹور میں، میں اور روشنا بھی تم لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔“ زیان واصف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”Realy are you serious?“ شہروز نے بے یقینی سے استفسار کیا۔

”Yes i am serious“ زیان نے یہ کہتے ہوئے شہروز کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”ویری گڈ پھر ہماری اچھی گزرے گی پارٹنر۔“ شہروز نے پرمسرت انداز میں کہا۔

”چلو چل کر دیکھتے ہیں ان خواتین کے مذاکرے ختم ہوئے کہ نہیں۔“ بہت سادہ سا ایک ساتھ گزارنے کے

بعد شہر وزیہ کہہ کر آگے بڑھا تھا۔

”اسی وقت اس کے سیل فون نے رنگ کرنا شروع کر دیا۔

”زیان جگر! تم ڈرائنگ روم میں بیٹھو میں اس سے جان چھڑا کے آتا ہوں۔ میرے میٹر سے میری خوشی برداشت نہیں ہوتی۔“ شہر وزیہ جتنی نے سیل فون کو گھورتے بے چارگی سے کہا تھا۔ زیان واصف نے مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ زیان واصف نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔ جب کہ شہر وزیہ لان کی جانب بڑھ گیا۔

دروازے میں ایسا وہ دبیز پردے ہٹا کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو ہی رہا تھا۔ جب اپنا نام سن کر چونکے بنا نہیں رہ سکا۔ یہ غیر اخلاقی حرکت تھی مگر وہ ناچاہتے ہوئے بھی ان کے مابین گفتگو سننے لگا۔

”زیان بہت اچھے ہیں مسئلہ! مگر انہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میں نے صرف ان کا ساتھ مانگا تھا جو خوشی انہوں نے مجھے دیا۔ انہوں نے پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ وہ فارہ کی جگہ مجھے نہیں دے پائیں گے۔ مجھے اس وقت تو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مجھے میرا آئیڈیل مل رہا تھا مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ انہوں نے اسٹڈی روم کو اپنا بیڈ روم بنا رکھا ہے۔

تمہیں کیسے بتاؤں لوگوں کی ٹوٹتی نظریں مجھے کس قدر شرمندہ کرتی ہیں کہ شادی کے پانچ سال بعد بھی میری گود خالی ہے۔ ہر کوئی مجھے میڈیکل چیک کپ کی ترغیب دیتے نہیں تھکتا۔ اب تو مما اور بھالی بھی میرے لیے پریشان رہنے لگی ہیں۔ ایسی چھوٹش میں میرا مر جانے کا دل کرتا ہے۔ مسئلہ میں نے یہ باتیں کسی سے سیر نہیں کیں مگر ان تمام باتوں کو دل میں دفن کر کے مجھے لگتا ہے میرا دل ایک دن بند ہو جائے گا۔ اب میں لڑ جھگڑ کر محبت کی بھیک تو نہیں مانگ سکتی نا۔ کیوں کہ یہ خاں دار راہ میری خود کی منتخب کردہ ہے اس میں زیان کا تو کوئی دوش نہیں۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا مسئلہ کہ تمہیں مجھے دیکھ کر ایک دن رشک ہوگا کہ مجھے میرا آئیڈیل مل گیا۔ میرے چہرے اور ہر اک انداز میں دلکشی جھلکے گی مگر مجھے تمہیں دیکھ کر رشک ہوتا ہے۔ تمہارے چہرے اور ہر انداز میں دلکشی پنہاں ہے۔ شکر ہے تم نے میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی اپنا آئیڈیل ذہن سے نکال کر شہر وزیہ بھالی کا ہاتھ تھام لیا۔ سراب کے پیچھے بھاگنے والوں کا انجام عمر بھر کی آبلہ پانی ہے۔ تم نے پہلے ہی مجھے یہ باور کروا دیا تھا۔ آئیڈیلزم آپ کو کہیں کا نہیں چھوڑتا تم مجھے ہی دیکھ لو۔ محبت نے مجھے برباد اور تمہیں آباد کیا۔“ وہ یہ کہہ کر رکی تھی پانی کا گلاس لبوں سے لگائے اس نے لمبے لمبے سانس لیے تھے۔ مسئلہ کا روم روم سماعت بنا روشنا کون رہا تھا۔

”میں نے زیان اور انشراح کے لیے اپنی زیست وقف کر دی۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں بنا کہے ہر ضرورت پوری کرتے ہیں۔ جب دلوں میں محبت کا کہیں گزر رہا نہ ہو تو ہر شے بے معنی نظر آتی ہے۔ جبر اور محبت میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔“ روشنا نے نہایت کرب سے کہا تھا۔

”روشنی کسی کا بے حد دھیان رکھنا بھی تو محبت ہی ہے نا۔ زیان بھالی واقعی تم سے محبت کرنے لگے ہیں مگر وہ خود اس حقیقت سے انجان ہیں اور تم خود بھی اس حقیقت سے بے خبر ہو۔ فارہ تو ان کی پہلی محبت ہیں وہ انہیں کبھی بھی نہیں بھولیں گے مگر تمہارے بنا وہ رہ بھی نہیں پائیں گے۔“ مسئلہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا فائدہ ایسی محبت کا جس کو پانے کے لیے میں ہر بل ترستی رہی ہوں۔ میرے کتنے ہی اہم ماہ و سال بیت گئے۔ کاش میں آئیڈیل نہ بناتی یا اگر بناتی بھی تو کسی عام شکل و صورت والے شخص سے شادی کر لیتی تو کم از کم وہ مجھ سے محبت تو کرتا۔ روٹھ جانے پر مجھے منانا۔ اسے میری خوشیوں اور غموں سے غرض تو ہوتی اور مجھے

میرے اتنے اہم ماہ و سال گزر جانے کا لال تو نہ ہوتا عشق سراب ہے ہرگز بھی حسین خواب نہیں ہے۔ اس عشق کے پیچھے بھاگ بھاگ کر میرا وجود اور دل لہو لہان ہو چکا ہے۔“ روشنا کا گلارندہ گیا تھا۔

”روشنی! چپ کر جاؤ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ امثلہ نے اسے گلے لگایا تھا۔ عزیز از جان سہیلی کے آنسو سے تکلیف میں مبتلا کر رہے تھے۔

”سوری یار! منیجر جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔ مال میں کچھ ایشوز آگئے ہیں چھوٹی چھوٹی چیزیں خود منیج کرنے کے بجائے مجھے فون کھڑکا دیتا ہے۔“ شہروز نے بیزار سے کہا۔ زیان خاموش کھڑا تھا۔

”تم اب تک یہاں کیوں کھڑے ہو؟ حد ہوگئی ان خواتین کی گفتگو کی محفل اب تک برخاست نہیں ہوئی۔ انہیں احساس ہی نہیں کہ زیان بے چارہ کب سے کھڑا کشمکش میں مبتلا ہے کے اندر جائے یا نہیں۔“ تیز تیز بولتے شہروز نے دبیز پردے ہٹائے تھے۔

”کب سے“ سن کر امثلہ اور روشنا پریشان ہو گئی تھیں۔ یعنی ان کی تمام گفتگو زیان و اصف نے بغور سنی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی زیان نے روشنا کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ اس کے انداز سے ہرگز بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سب کچھ سن چکا ہے۔ یاد وہ ایسا پوز کر رہا تھا۔ روشنا اور امثلہ سمجھ نہیں پائی تھیں۔

زیان کے ملازم نے ڈنر سروس کر دیئے جانے کی اطلاع دی۔ ان چاروں نے ڈاننگ کارخ کیا تھا۔ امثلہ سوچ رہی تھی کہ اگر زیان نے گفتگو سن بھی لی ہے تو اسے مثبت انداز میں لے اور اپنی کوتاہیوں کو ختم کر لے۔ جب کے روشنا بالکل خاموش تھی۔ زیان نے بے تکلفی سے ڈنر کیا تھا۔ وہ باری باری لوازمات چکھ کر امثلہ کو سراہتا نہیں بھول رہا تھا۔

تمام چیزیں امثلہ نے خود بنائی تھیں۔ شہروز بھی مسلسل مسکراتی نظر امثلہ پر ڈال رہا تھا۔ روشنا زیان و اصف کے اس طرح ہنسنے بولنے پر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو چکی تھی۔ شاندار ڈنر کروانے پر زیان نے امثلہ کے سر پر ہاتھ رکھے اسے کئی نیلے نوٹ تھمائے۔ جسے شکریہ کے ساتھ امثلہ نے فوراً قبول بھی کر لیا۔

”آرام سے بھی بے فکر ہو، میں ہرگز بھی واپس والٹ میں رکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔“ زیان کا انداز شرارتی تھا۔ امثلہ جھینپ گئی۔

”آج سے ہماری پیاری وائف کی بیسٹ فرینڈ ہماری چھوٹی بہن ہیں۔“ زیان نے روشنا کے چہرے پر رنگوں کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”لفظ پیاری وائف۔“ بروہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ پانی کا گھونٹ حلق میں اٹک گیا تھا جس کے باعث اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ امثلہ نے روشنا کا ہاتھ گرجوشی سے دبایا تھا۔ اسے یہ یقین ہو چلا تھا کہ روشنا کی زندگی میں جلد ہی خوشیاں لوٹنے والی ہیں۔ ڈھیروں دعاؤں کے ہمراہ شہروز اور امثلہ نے ان دونوں کو رخصت کیا تھا۔ روشنا بے ساختہ امثلہ کے گلے لگی تھی اس کے دل کا بوجھ اسے جاتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

☆.....☆

امثلہ کے گھر سے آنے کے بعد زیان و اصف نے اسٹڈی روم کا رخ کیا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں براجمان ہو گیا۔ وہ مسلسل خود احتسابی میں مبتلا تھا۔

”میں کیوں اسے اذیت سے دوچار کر رہا ہوں۔ اس معصوم کا کیا تصور ہے۔ وہ تو میری چاہت اور محبت میں یکسر بدل چکی ہے۔ میری بچی کو کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہوئی مگر میں فارغ کی محبت میں اس قدر گرم ہوں کہ مجھے

میری بچی کے ساتھ ساتھ اس کے شب و روز کی بھی خبر نہیں مگر اس نے کبھی کوئی شکوہ بھی نہیں کیا۔ اس کے لب ہمیشہ خاموش رہتے ہیں۔ اسے میری وجہ سے کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ سب چیزیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ وہ اپنی کنپٹی کو انگلیوں سے دباتے ہوئے مستقل خود اذیتی کا شکار تھا۔

”ہمیں بھی عرض تمنا کا ڈھب نہیں آتا مزاج یار بھی سادہ ہے کیا کیا جائے“

”وہ رات رات بھر جگا کرتی ہے۔ اسے میرے شب و روز کی کس قدر پرواہ ہے مگر مجھے اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔“ مستقل سوچتے ہوئے اس نے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ روشنا ہنوز خاموشی سے لیٹے خلا میں گھور رہی تھی۔ زیان واصف نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا۔

”کتنا ملتا ہے ہمارا دکھ یہ بھی تمہی داماں ہے اور میں بھی یہ میری وجہ سے اذیت کا شکار ہے اور میں فارغ کی وجہ سے۔ کس قدر مہاشیت ہے ہمارے دکھوں میں۔“ کرب سے سوچ کر زیان واصف نے روشنا کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔

”روشنا آپ اب تک سوئی نہیں؟“ زیان واصف نے اس کے عین سامنے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

”بس سونے ہی لگی تھی۔ ماما کی کال آگئی تھی۔“ اپنے خیالوں میں گم روشنا نے قدرے چونک کر لیٹے سے اٹھ بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا کہہ رہی تھیں ماما؟“ زیان واصف نے متوجہ ہو کر پوچھا۔ وہ لفظ ماما پر بے ساختہ ٹھٹھکی تھی۔ آج زیان اسے حیران کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ روشنا کی ماما کو آنٹی ہی کہتا تھا۔

”جی وہ سفینہ کی شادی ہے ناں میری پھپھو کی بیٹی کی۔ وہ لوگ ہمیں انوائٹ تو کر کے گئے تھے۔ ماما، بھابی اور راسب بھی اسلام آباد آئے ہوئے ہیں۔ تمام گزرنے بہت اصرار سے مجھے رکنے بلایا ہے۔“ روشنا نے یاد دہانی کروانے کے بعد قدرے حیران ہو کر تمام باتیں اس کے گوش گزار کیں۔ زیان واصف نے کبھی بھی اس کی ذات کی گرہیں کھولنے کی کوشش نہیں کی تھیں اور نہ ہی ان کے بابت کبھی اتنا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔

”ہوں ٹھیک ہے پھر میں کل آپ کو ڈراپ کر آؤں گا شام میں تیار رہیے گا۔“ وہ اپنی ٹون بدلتے ہوئے کہہ کر کانپیں تھا۔ روشنا نے بیکلی آنکھوں سے اس دھوپ چھاؤں سا مزاج رکھنے والے شخص کو بخور دیکھا تھا۔

”میرے وہاں رکنے پر انہیں کونسا فرق پڑے گا۔ میری ان کی زندگی میں کوئی اہمیت اور جگہ نہیں اور میرے بغیر ان کی زیست مکمل ہے۔“ روشنا نے بے بسی سے سوچ کر آنکھیں میچ لی تھیں۔

☆.....☆

آفس سے آنے کے بعد زیان واصف نے اسے اس کی پھپھو کے گھر ڈراپ کر دیا تھا۔

”کتنی ویرانی تھی اس کے دلکش نینوں میں کتنا کرب تھا اس کے لفظوں میں۔ میں نے اسے روکنے کی سعی ہی نہیں کی۔ وہ یقیناً سوچ رہی ہوگی کہ اس کے میری زندگی میں رہنے اور نہ رہنے سے میری ذات اور زیست کو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔“ مستقل سوچتے ہوئے وہ انجان راستوں پر محو سفر تھا۔ جیسے اس کی منزل کہیں کھو گئی ہو۔ وہ اپنی منزل کو تلاش کرنے میں مگن تھا۔ جب ہی سیل فون کی بپ پر اس کا سیر ٹوٹا تھا۔ کار سائیڈ پر روکتے اس نے اسکرین پر موجود نمبر دیکھا تھا۔ نمبر فارغ کی ماما کا تھا اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رواٹا مجسٹ [149] دسمبر 2016ء

”السلام علیکم۔“ زبانِ واصف نے تاک کرتے ہوئے سلام کیا۔
 ”وعلیکم السلام ڈیڈی! میں آپ اور می کو بہت مس کر رہی ہوں۔ ابھی می کو فون کیا تھا اس کے بعد آپ کو کیا ہے۔“

”ڈیڈی می مجھے بہت یاد آ رہی ہیں۔“ انشراح نے چھوٹے ہی اپنا مدعا نہایت معصومیت سے بیان کیا۔
 ”تو بیٹا! آ جاؤ نا ہم بھی آپ کو بہت مس کر رہے ہیں۔“ زبانِ واصف نے خود کو کمپوز ڈ کرتے ہوئے کہا۔
 ”ڈیڈی! میں نیکسٹ سنڈے آ جاؤں گی می کو میری طرف سے پیار کہیے گا میں نے ان کو کہہ دیا ہے۔ آپ بھی ان کو کہہ دینا آپ کو پتا ہے ڈیڈی میری می دنیا کی بیسٹ می ہیں۔“ انشراح نے محبت سے گندے لہجے میں کہا تھا۔

”اچھا صرف می اچھی ہیں ڈیڈی نہیں ہیں اچھے؟“ زبانِ واصف نے مسکرا کر استفسار کیا۔
 ”آپ بھی اچھے ہیں برمی آپ سے بھی زیادہ اچھی ہیں وہ ہر وقت میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ آپ کو تو میں یاد ہی نہیں آتی۔“ انشراح نے کھلکھلاتے ہوئے شکوہ کیا۔ ماں کی محبت اس کے ذہن، دل میں بسی ہوئی تھی۔
 ”بیٹا! اب آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔“ زبانِ واصف نے دل میں اعتراف کرتے ہوئے کہا۔
 ”او کے ڈیڈی! اللہ حافظ۔“ انشراح نے لائن منقطع کر دی۔

”سو تلی ماں کا تصور ہی کتنا ہولناک ہوتا ہے مگر روشنا نے تو اسے اپنی جان سے زیادہ چاہا تھا۔ شاید افارہ کی محبت میں خود سے جڑی لڑکی کے ساتھ ساتھ انشراح کو بھی فراموش کیے ہوا ہوں۔ انشوبھی مجھ سے زیادہ روشنا سے محبت کرتی ہے۔ کس قدر اہم ہے روشنا میرے لیے اور انشراح کے لیے۔ اس کے بغیر ہم بالکل ادھورے ہیں۔ میری بچی کو اس نے ماں کا پیار دیا ہے اور میں نے اسے دکھ، تکلیف اور آنسو دیے ہیں۔“ وہ مسلسل ذہنی اذیت سے دوچار تھا۔

☆.....☆

آفس جانے کے لیے وہ معمول سے آدھے گھنٹے کی تاخیر سے جا گا تھا۔ روشنا کے ایک دن گھر میں نہ ہونے سے اس کی زیست میں کتنا فرق پڑا تھا۔ ملازم نے ناشتا لگا دیا تھا۔ چائے کالگ بے دلی سے خالی کرتے وہ آفس جانے کے لیے کھڑا ہوا۔ اس کا دل کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ آفس میں بھی وہ بے دلی سے کام نہٹا رہا تھا۔
 ”اسے میں کتنا یاد کر رہا ہوں۔ شاید نہیں یقیناً میں اس سے محبت کرتا ہوں مگر میں خود اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پا رہا تھا۔ اشلہ نے ٹھیک کہا تھا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے اسے کتنے دکھ دیے ہیں۔ کاش وہ کبھی کوئی شکوہ ہی کر لیتی تو میرے دل میں اتنا بوجھ نہ ہوتا۔ وہ کبھی اس طرح مجھے چھوڑ کر بھی تو نہیں گئی۔ جو مجھے اس حقیقت کا اور اک ہوتا۔“ آفس ٹائم ختم ہونے سے قبل ہی وہ کوٹ کاندھے پر ڈالے اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلسل ذہنی اذیت میں مبتلا وہ پاگل ہونے کو تھا۔ نجانے وہ کونسا جذبہ تھا۔ جس کے تحت وہ انجان رستوں پر سفر کرتے کرتے روشنا کی پھپھو کے گھر کا روک چکا تھا۔

”میں اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا۔“ وہ کار لیے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ گیٹ کیپر نے اسے دیکھ کر سلام کرتے ہوئے دروازہ وا کر دیا تھا۔ ملازم نے اسے گیٹ روم میں بٹھا کے روشنا کو اس کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ اسے وہاں بیٹھے فقط کچھ پل ہی ہوئے تھے۔ جب سنگ روم میں روشنا گھبرائی ہوئی داخل ہوئی۔
 ”السلام علیکم! آپ اس وقت سب خیریت تو ہے نا؟“ روشنا نے پریشان کن لہجے میں استفسار کیا۔

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

”کچھ بھی خیریت نہیں ہے۔“ زیان واصف گویا ہوا۔ اس کا انداز مخاطب روشنا کو مسلسل ہولارہا تھا۔
 ”کیوں کیا ہوا ہے؟ انشو تو ٹھیک ہے نا؟“ روشنا مزید پریشان ہوئی۔
 ”انشو ٹھیک ہے۔ میں ٹھیک نہیں ہوں تم میرے ساتھ چلو میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ تم کل فنکشن میں آ جانا مگر فی الحال میرے ساتھ چلو۔“ زیان واصف نے سچی لہجہ میں کہا۔ روشنا اس کا انداز سمجھنے سے قاصر تھی۔

”اچھا میں ابھی آتی ہوں۔“ روشنا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ بیگ کاغذ سے پر ڈالے زیان کے سامنے تھی ماما اور پھپھو ابھی اس کے ساتھ ہی چلی آئیں۔
 ”زیان بیٹا! کیا ہوا ہے تمہیں؟ سب خیریت ہے ناں بیٹا؟“ ماما بہت فکر مند نظر آ رہی تھیں زیان کو ان کا فکر مندانہ انداز بہت اچھا لگا۔

”جی ماما! سب خیریت ہے۔ میں اور روشنا تمام فنکشن انشاء اللہ اٹینڈ کریں گے۔ ابھی ہمیں اجازت دے دیں۔“ زیان واصف نے مودبانہ لہجہ میں جواب دیا۔ وہ بھی فقط ”ماما“ یہ ٹھکے بنانہ رہ سکیں۔
 ”ٹھیک ہے بیٹا! اللہ تم دونوں کو اپنی امان میں رکھے۔“ دعا کے ساتھ ماما اور پھپھو نے ان دونوں کو رخصت کیا تھا۔

☆.....☆

شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے وہ ارد گرد سے بے نیاز کار کی فرنٹ سیٹ پر زیان واصف کے ہمراہ براجمان تھی۔ زیان واصف کا یہ انداز اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں مگن تھی۔ وٹو سے باہر جھانکتے ہوئے وہ زیان واصف سے یکسر بے نیاز تھی۔ زیان واصف نے اس کے گریز کو ملاحظہ کرتے ہوئے سی ڈی پلیئر آن کر دیا تھا۔

”بھئی بھئی سڑکوں پہ میں تیرا انتظار کروں
 ہولے ہولے دل کی زمیں کو تیرے ہی نام کروں
 صنم رے، صنم رے تو میرا صنم ہوا رے“

روشنا ہنوز خاموش تھی۔ اور نظریں بدستور باہر مرکوز تھیں۔ زیان واصف نے اب تک اک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ اس کے بولنے کی منتظر تھی۔ جب ہی مسلسل اک ہی راستے پر سفر کرتے کرتے وہ تھک سی گئی۔ پھپھو کے گھر سے ان کے گھر کا راستہ اتنا بھی طویل نہ تھا۔ انہیں وہاں سے نکلے کافی وقت گزر چکا تھا۔ مستقل ایک ہی راستے میں گاڑی دوڑاتے زیان کے لب ساکت تھے۔

”یہ ہمارے گھر کا راستہ تو نہیں ہے؟“ انجان سڑکوں پر سفر کرتے روشنا نے آخر پوچھ ہی لیا۔
 ”روٹی جی میں نے کب کہا کہ یہ راستہ ہمارے گھر کا ہے۔ یہ راستے تو پیار، محبت، عشق کے ہیں۔ کیا ان راستوں پر تم میری ہمسفر بنو گی؟“ زیان واصف نے اس کی حیرت سے حظ اٹھاتے ہوئے مسکرا کر استفسار کیا۔
 ”جی.....“ روشنا حیران تھی۔

”کچھ نہیں تمام مطلب بعد میں سمجھاؤں گا۔ پہلے اس کافی شاپ میں چلتے ہیں۔ مجھے یہاں کی کافی بہت پسند ہے۔“ کار کو پارک کرتے ہوئے زیان واصف نے روشنا کی جانب کا دروازہ دیا تھا۔
 روشنا نے ناچھی کے انداز میں اس کی تقلید کی تھی۔ میز منتخب کر کے زیان واصف اس کے عین سامنے

براجمان تھا۔ گلدان سر سے گلاب کی اذہ کھلی نکلی ان کے درمیان حائل تھی کافی شاپ نہایت پرسکون گوشے میں قائم تھا۔

وال ٹو وال گلاس کے تھے اسے وہاں کا ماحول کافی اچھا لگا مگر زیان و اصف کی بولتی نظروں سے وہ کنفیوژ ہو رہی تھی۔ وہ مسلسل اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”میں چاہتا ہوں۔ اب کوئی بھی شے ہمارے درمیان حائل نہ ہو۔“ اس نے گلدان سائیڈ پر کرتے ہوئے سرخ گلاب اسے تھمایا تھا۔ روشنانے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔

”میری زندگی ایسے تو نہ دیکھو۔“ زیان نے شرارت سے کہا۔ روشنانے نظریں جھکالی تھیں۔ میں گزرے ہوئے ماہ و سال تمہیں واپس تو نہیں کر سکتا روشنی مگر جو آنے والے ماہ و سال ہیں انہیں ضرور پر مسرت بنا سکتا ہوں۔“ زیان و اصف نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ روشنانے بے ساختہ نظریں اٹھائی تھیں۔ محبت تو مجھے تم سے اس وقت سے ہے جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تھا۔ اس وقت تم مجھے موم کی تراشیدہ کوئی صورت لگی تھیں۔ جو ماحول کے حسن میں اس قدر گم تھی کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ محبت سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ مجھے فارغہ کے ساتھ عشق ہے۔ جب ہی تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میں خود کون سا سکون میں رہا ہوں۔ تمہیں بڑپا کر سکون مجھے بھی نہیں ملا۔ تمہیں رلا کر قرار مجھے بھی نہیں آیا۔ مسئلہ درست کہتی ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے جس کا علم مجھے خود بھی نہیں تھا مگر اب مجھے علم ہو گیا ہے۔ میں اپنی تمام تر کوتاہیوں کی معافی مانگتا ہوں۔ تم خوش رہو کی تو میں بھی خوش رہوں گا۔“ اس نے روشنانے کے نرم و نازک ہاتھ کو تھام کر کہا تھا۔ پلیز یہ ڈل اور بورنگ کلرز زپ تن کرنا چھوڑو۔“ زیان نے اس کے زرد ڈریس کو دیکھ کر کہا جس میں وہ مرجھایا ہوا سرسوں کا پھول لگ رہی تھی۔

اس نے کہا کہ تجھ کو دلانی ہیں چوڑیاں
میں نے کہا گئے اب وہ موسم گزر گیا
میں نے کہا کہ نیند کا موسم گزر گیا
”مجھے یہ خوشی کتنے اہم ماہ و سال گزر جانے کے بعد ملی۔ جس پر میں خوش بھی نہیں ہو پا رہی۔ آئیڈیلزم واقعی کتابوں میں اچھا لگتا ہے۔ حقیقت میں یہ کتنا دکھی کرتا ہے کوئی مجھ سے پوچھے۔ یہ ٹین اٹیج کا پاگل پن ہے۔ جس کا شکار میں خود بھی ہوئی ہوں۔“ وہ نجانے اور کیا کیا سوچ رہی تھی۔
”کہاں کھو گئی؟“ زیان نے اس کے دلکش نینوں کے آگے ہاتھ لہرائے تھے۔

”کہیں نہیں بس یونہی۔“ روشنانے اتنا ہی کہا۔
”تمہیں بہت ملال ہے نا؟ اپنے ماہ و سال کے بیت جانے کا؟“ زیان و اصف نے محبت سے مخمور لہجے میں کہا تھا۔ روشنانے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔

”مجھے معاف نہیں کرو گی؟“ زیان کا انداز سوالیہ تھا۔
”آپ کی جب کوئی غلطی نہیں تو معافی کیسی؟“ روشنانے نرمی سے جواب دیا۔

”غلطی نہیں جاناں! میری جانب سے غلطیاں ہوئی ہیں۔“ جو انسان اس دنیا میں نہیں اس کے ساتھ انصاف کرتے کرتے، جیتے جاگتے وجود کے ساتھ نا انصافی کر بیٹھا۔ میں فارغہ کی محبت میں یہ فراموش کیے ہوئے تھا کہ تمہیں کن کن مشکلات کا سامنا ہے۔ روشنانے مجھے معاف کر دو۔ میں سمجھتا تھا فارغہ کے بعد میں کسی سے محبت

کر ہی نہیں سکتا۔ تو میری یہ منطق کھوٹا سکے ثابت ہوئی۔ ہر محبت کا اپنا الگ انداز اور اپنا الگ مقام ہوتا ہے۔“
ویٹر کو کافی کا آرڈر دینے کے بعد زیان واصف نے تفصیلاً جواب دیا تھا۔
”میں نے آپ کو معاف کیا۔“ روشنا نے اس کی یونہی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”بہت شکریہ روشنی! میں تم سے بے تحاشہ محبت کرنے لگا ہوں۔ تم نے تو میری زندگی روشنیوں سے بھر دی ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں اپنی روشنی کو کبھی بھی مدھم ہونے بھی نہیں دوں گا۔“ زیان واصف نے اسے یقین دلایا تھا۔

”اور اک بات میری جان! عشق سراب نہیں اک بہت حسین خواب ہے محبت انسان کو سرتا پابدل دیتی ہے۔ تمہاری محبت نے یکسر بدل دیا ہے مجھے اس کا بارہا اعتراف ہے۔“ زیان کے اقرار پر روشنا کے دل میں ڈھیروں اطمینان اور سکون اتر آیا تھا۔

”روشنا! تاحیات تم میرا ساتھ دو گی ناں؟“ زیان نے آنکھوں میں محبتوں کا جہاں آباد کیے بے حد اس سے پوچھا تھا۔

”جی ہاں میں ہر قدم پر آپ کا ساتھ دوں گی۔“ روشنا نے اس کے آنکھوں میں جلتے محبت کے شمعوں کو بغور دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

میرے تصور کا جہاں آباد ہے تیرے خیال سے
کتنا ملتا ہے تیرا حال میرے حال سے
ہمارے تعلق کے بارے میں ذرا فرصت سے غور کرنا
الجھا پڑا ہے یہ مسئلہ کتنے سال سے
اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتے زیان نے کہا۔

”کیا آپ ہر قدم پر میرا ساتھ دیں گے؟“ روشنا نے اپنے محبوب شوہر سے استفسار کیا تھا۔

”میں ہر قدم، ہر راہ، ہر منزل، ہر جگہ، ہر پہر، ہر لمحے تمہارا ساتھ دوں گا۔ کیونکہ مجھے تم سے بے حد، بے انتہا، بے تحاشہ محبت جو ہے۔“ زیان نے رواں لگی سے کہا تھا۔

اس کی رواں لگی پر روشنا کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ اس کی کلکھلاہٹ سے ارد گرد جلت رنگ سے بچ اٹھے تھے جسے زیان واصف نے بغور سنا تھا۔ اس کی ہنسی اس جیسی شفاف اور مترنم تھی۔ زیان واصف نے چہرے پر ہاتھ رکھے محویت سے اسے دیکھا تھا۔

”محبت اور چاہت اتنے اچھے اچھوں کو بدل دیا کرتی ہے۔“ اسے روشنا کا یہ جملہ بے ساختہ یاد آیا تھا۔ وہ روشنا کو تاحیات خوش رکھنے کا عہد کیے اپنی شریک زندگی کا ہاتھ تھامے واپسی کے راستے پر محو سفر تھا۔

چاند ستاروں کے ہمراہ ان کے من سے شرما کر بادلوں کے اوٹ میں جا چھپا تھا۔ چاند چھپنے اور نکلنے کا منظر بغور دیکھتے ہوئے روشنا نے سی ڈی پلیئر آن کرتے ہوئے اپنا سر زیان واصف کے کندھے پر رکھ دیا تھا۔

زیان واصف نے مسکراتی نگاہوں سے اس تنگی ماندی لڑکی کو بغور دیکھا تھا۔ جو بہت سی مسافت بس اس کے لیے ہی طے کر کے آئی تھی۔ زیان واصف نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھے اسے خود سے مزید قریب کیا تھا۔

☆.....

WWW.PAKSOCIETY.COM

ردا ڈائجسٹ [153] دسمبر 2016ء

رونگی محبت

اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے وہ اپنی بھیلی پلکوں کو اپنے ہاتھ سے مسلسل مسل رہا تھا۔ ایک درد سا تھا جو اس کے چار سو بکھرا ہوا تھا عجیب ہی لڑکی تھی وہ۔ پانچ برس ہو گئے اسے پچھڑے مگر ایسے لگتا ہے جیسے وہ یہیں کہیں سے میرے آس پاس اس کی مسکراتی ہوئی بھوری آنکھیں اور ان میں چمکتی شرارت آہ..... وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر چلتا ہوا بیڈ پر آن بیٹھا تھا اس کے ذہن کے پردے پر گزشتہ نکل کی فلم چلنے لگی تھی۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر سید علی رحمن کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے تھا اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ذہین اور سمجھدار اس کے والد رحمن شاہ بخاری کو بہت شوق تھا کہ ان کا بیٹا ڈاکٹر بن کر لوگوں کی خدمت کرے علی رحمن نے اپنے باپ کی خواہش کو عملی جامہ پہنایا محنت اور لگن سے اپنا گورنمنٹ میڈیکل کالج اس نے کہیں جاب کرنے کے بجائے اپنا ذاتی کلینک کھولنے کا فیصلہ کیا تھا سو مختصر سے عرصے ہی میں اس نے اپنے ہی محلے میں ایک چھوٹا سا کلینک کھول لیا وہ چاہتا تو اپنے گاؤں سے ملحقہ شہر میں وہ کلینک کھول کر خوب میسے کما سکتا تھا مگر اس کا مکتبہ نظر صرف دولت نہیں تھی وہ صرف سچے دل سے لوگوں کا اصل مسیحا بننے کی خواہش رکھتا تھا ایسا مسیحا جو لوگوں کو زندگی بخشتا ہو اس کی اک پھونک مریضوں میں زندگی کی لہر دوڑا دے اس کی

نیت صاف تھی اس کے دل میں خلوص تھا خدا نے اس کے ہاتھوں میں ایسی شفاء رکھی کہ چند ہی دنوں میں اس کا شہرہ اپنے گاؤں سے نکل کر آس پاس کے علاقوں میں جا پھیلا لوگ دور دور سے اس کے پاس علاج کی غرض سے آنے لگے کلینک پہ مریضوں کا تانتا بندھا رہتا وہ ماتھے پہ شکن لائے بنا ان کے مسائل حل کرتا رہتا اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ اک نرم سی مسکراہٹ رہتی سید علی رحمن..... خوبرونو جوان تھا اور اب خیر سے برس روزگار بھی اماں کو اس کے سر پر سہرا سجانے کی فکر لاحق ہو گئی انہوں نے جھٹ پٹ لڑکی ڈھونڈی اور اس کی نسبت طے کر دی علی نے فرمانبردار بچوں کی طرح سر تسلیم خم کر دیا اور اماں جان مطمئن ہو گئیں ٹھیک چھ ماہ بعد ”فاطمہ شاہ“ مسز علی شاہ بن کر ان کے آنگن میں جلوہ افروز ہو گئی زندگی نہایت پرسکون انداز میں آگے بڑھنے لگی اس پرسکون جھیل میں بے چینی کا پہلا پتھر نہایت خاموشی سے پھینکا گیا تھا وہ ”انجانی دیوانی سی لڑکی“ ان کی زندگی میں مداخلت کرنے چلی آئی تھی۔

☆☆☆☆

”تو آئے گا تو مل کو سنواریں گے اسے ہم دونوں اپنی تقدیر میں نے اس لئے الجھا رکھی ہے“ علی نے حیرت سے انجانے نمبر سے آنے والے اس ٹیکسٹ کو پڑھا تھا۔

”پتہ نہیں کون ہے پاگل“۔ اس نے بڑبڑاتے



Downloaded From
paksocietyty.com

SOCIETY

جیل الزم

ہوئے ٹیکسٹ کو ڈیلیٹ کر کے موبائل ٹیبل پر رکھ دیا تھا اسے پچھلے چند روز سے اس قسم کے کئی ٹیکسٹ پڑھنے کو مل رہے تھے جنہیں وہ پڑھ کر آرام سے ڈیلیٹ کر دیتا تھا اس نے کبھی بھی جاننے کی کوشش نہ کی تھی کہ یہ کون ہے؟ جو اسے اوٹ پٹائیگ قسم کے ٹیکسٹ بھیج رہا ہے یا یہی ہے شاید یہی وجہ تھی کہ چند روز کے بعد یہ پیغامات خود بخود آئے بند ہو گئے تھے۔

☆☆☆☆

اس روز کسی مریض کو دیکھنے کے لئے دوسرے گاؤں گیا ہوا تھا جب واپس آیا تو ایک دلچسپ منظر سامنے تھا ایک نقاب پوش نازک اندام کرسی پر بہت مزے سے بیٹھی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں بخار چیک کرنے والا آلہ تھا جو اس نے اپنے سامنے بیٹھے بچے کی بغل سے نکالا تھا۔

”ارے تمہیں تو بہت تیز بخار ہے چلو میں تمہیں انجکشن لگا دیتی ہوں“۔ اس کی خوبصورت آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی جبکہ بچے کی نظر مجھ پر پڑ چکی تھی اس نے ہنستے ہوئے میری طرف اشارہ کیا تھا۔

”اوہو بدتمیز کیا مسئلہ ہے؟“ وہ جھنجھلا کر میری طرف بلیٹی تھی دوسرے ہی لمحے وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

”آ..... آ..... آپ..... وہ میں تو.....“ وہ جلدی سے کرسی چھوڑ کر بیچ پر جا بیٹھی تھی میری بے اختیار ہنسی نکل گئی تھی میں نے ہنستے ہوئے اس بچے کے گال کو کھینچا تھا۔

”بہت تیز ہوتم“۔ ساتھ ہی شرارت سے اسے دیکھا تھا وہ بری طرح جھینپ کر سر جھکا گئی تھی جی تو چاہ رہا تھا زور سے قہقہہ لگاؤں پر اپنے ہیلپر ز اور کلینک میں اپنی پوزیشن کا احساس کر کے سنجیدہ ہو گیا۔

”آپ نے اس بچے کو چیک کروانا ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے سوال کیا تھا اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر.....؟“ میں نے سوالیہ انداز میں اس کو دیکھا اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی کوئی اندر

داخل ہوا تھا۔

”السلام علیکم شاہ جی!“ ساتھ ہی اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے تھے۔

یہ حاشر شاہ تھے ساتھ والے گاؤں سے آئے تھے۔

”وعلیکم السلام..... کیا حال ہے جناب!“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

”اللہ کا کرم ہے آپ سنائیے۔“

”الحمد للہ میں بھی ٹھیک ہوں آئیے تشریف رکھیے ناں“۔ میں نے بیچ کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی اپنی نشست پر آن بیٹھا۔

”کہئے کیسے آنا ہوا؟“

”یہ میری ہمشیرہ ہے اسے بہت دنوں سے بخار اور کان میں بہت شدید درد ہے اسے چیک کر لیجئے۔“ حاشر نے کہا تو میں نے چونک کر اس نقاب پوش کی جانب دیکھا تھا۔

”اچھا تو یہ حاشر کی ہمشیرہ ہے؟“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

”جی ضرور آئیے۔“ میں نے اسے نرم لہجے میں پکارا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے سامنے پڑے اسٹول پر بیٹھ گئی نقاب میں سے جھانکتی آنکھوں میں شریر سی چمک ابھری تھی میں نے اس کا بلڈ پریشر اور بخار چیک کیا تھا بخار تو واقعی بہت تیز ہو رہا تھا بلڈ پریشر نارمل ہی تھا اب کان چیک کرنے کا مسئلہ تھا وہ نقاب میں تھی میں نے جھجک کر اسے نقاب اتارنے کو کہا تھا اس نے تذبذب سے بھائی کی طرف دیکھا تھا۔

”اتار دو کوئی بات نہیں بیٹا!“ اس نے بھائی کے کہنے پر نقاب کھول دیا وہ جھینپی جھینپی گھبرائی سی عام شکل و صورت والی لڑکی تھی یا پھر میں نے ہی اسے غور سے نہیں دیکھا بہر حال جو بھی تھا یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی اس کے بعد وہ اکثر میرے کلینک آنے لگی اپنی بڑی بھابی حاشر کی بیوی کے ساتھ انہیں ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کا مسئلہ تھا وہ باہانہ چیک اپ کے لئے

کرنا تھا جبکہ دل چیخ چیخ کر شور مچاتا کہ یہ وہی ہے جس کے نام سے بھی میں واقف نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆☆

”جب سے دیکھا ہے تجھے ہوش کھونے لگے ہم تیری آنکھوں کے بے سے یارید ہوش ہونے لگے ہم“ کمرے میں داخل ہوتی اہمل کو دیکھ کر وہ شرارت سے گنگنائی تھی، اہمل نے ہنس کر ”دیا“ کے ہاتھوں سے موبائل کھینچ لیا۔

”یہ گانا خالصتا میرے لئے ہے یا پھر ”ان“ کے لئے“ دیا کھلکھلائی۔

”ارے جناب ہم نے تو آپ کو دیکھ کر گنگنایا ہے آپ جو مرضی سمجھیں سوچ ہے آپ کی“۔ وہ شریر سے انداز میں کہہ کر اہمل کو دیکھنے لگی۔

”ہونہہ..... اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مجھے سامنے رکھ کر گایا ان موصوف کے لیے جارہا تھا ہے ناں“۔ اہمل نے اسے تیز نگاہوں سے کھورتے ہوئے کہا تھا، دیا نے معصومیت سے سر ہلا کر گویا اس کی بات کی تصدیق کی تھی۔

”دیا کی بچی زکوٰۃ ابھی بتاتی ہوں تمہیں“۔ وہ جو اہمل کے قریب آن بیٹھی تھی اس کے خطرناک تیور دیکھ کر گھبرانے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

”ارے ناں..... ناں..... ناں“۔ جبکہ اہمل نے بیڈ پہ پڑا تکیا سے کھینچ مارا تھا۔

”پائے میں مرگئی اماں بچاؤ“۔ دیا کی ایکٹنگ عروج پر تھی۔

”ارے بھئی مجھے تم میں اپنے وہ نظر آتے ہیں تو اس میں میرا کیا تصور ہے؟“ اس کے چہرے پر ہلا کی معصومیت اور بھولا پن تھا اہمل کی بے اختیار ہنسی نکل گئی اس نے موبائل فون سے ایک تصویر لی اور ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔

”دیا! بہت محبت کرنے لگی ہو اس سے“۔

”ہاں..... بہت.....“ اس نے مسکرا کر موبائل لے لیا۔

میرے کلینک آئی تھیں حاشر اور اس کی بیوی کے ساتھ میں اچھا خاصا بے تکلف ہو گیا تھا جب مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ بھی سادات گہرانے سے تعلق رکھتے ہیں تو مجھے حقیقتاً دلی خوشی ہوئی تھی یہ خون ہی کی کشش تھی کہ بے اختیار ان سے انسیت سی ہو گئی تھی میں نے کبھی بھی اس کو مخاطب نہ کیا تھا وہ جب چاپ ہماری گفتگو سنتی رہتی اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں ہر وقت میرا حصار کئے رکھتیں میں جتنا اس سے بچنے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی قریب ہو جاتی، میں گھبرا جاتا، مجھے اپنی عزت بہت پیاری تھی میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے میرے کردار کی طرف انگلی اٹھے میں نے خود کو ایک خول میں مقید کر لیا، بھول کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتا، اس کے گھر والے میرے ساتھ نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے ایک دو بار ان کے گھر جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا وہ چھوٹا سا مگر پختہ سا گھر تھا، اس گھر کے مکین نہایت ملنسار اور بااخلاق تھے میرے دل میں خود بخود ان کی محبت اور احترام پیدا ہوتا گیا، پر میں جب اس لڑکی کے بارے میں سوچتا تو خود سے ہی شرمندہ ہو جاتا، جانے وہ مجھ سے کیسی توقعات لگائے بیٹھی تھی جو کبھی پوری نہ ہوتی تھیں اور نہ ہی میں پورا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

☆☆☆☆

آج پھر بہت دلوں کے بعد اس نمبر سے ٹیکسٹ موصول ہوا تھا، میں جھنجھلا کر رہ گیا تھا، میں کال کرتا تو کال کاٹ دی جاتی، میں نے غصے میں سیل فون آف کر کے رکھ دیا۔

”بھاڑ میں جاؤ..... دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے میرا“۔ میں نے دل ہی دل میں اس انجانے نمبر کو خوب سنائی تھیں کبھی کبھار مجھے لگتا کہ یہ وہی ہے لیکن پھر اپنی سوچ کر خود ہی جھٹک دیتا، میں نے آج تک اس کے ہاتھ میں سیل فون نہیں دیکھا تھا، دوسرا ان کا ماحول اور رکھ رکھاؤ دیکھ کر دماغ یہ بات تسلیم نہ

”کتنی؟“ اشمیل نے پوچھا تو دیا نے بدستور مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر کے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگالی۔
”بتاؤ ناں۔“

”یار! ابھی محبت کو ماننے والا آلہ ایجاد نہیں ہوا، بہر حال تمہاری تسلی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اس سے خود سے بھی زیادہ محبت کرنے لگی ہوں اگر وہ نہیں تو کوئی نہیں میری زندگی میں صرف اسی کے لئے جگہ ہے بس۔“
”اگر وہ نہ ملا تو.....“ اشمیل نے بغور اس کی صورت دیکھی تھی۔

”تو سمجھ لیا دیا اسی روز مر جائے گی۔“
”اللہ نہ کرے کیسی باتیں کرتی ہو۔“ اشمیل نے گھبرا کر اس کے سر پر چپٹ لگائی تھی جبکہ دیا کے چہرے پر بے حد سکون تھا محبت کی الوہی چمک۔

☆☆☆☆

چاند کی خوابناک
چاندنی میں
تمہارے سینے پہ
سر رکھ کر

ساری عمر بتا دوں.....!!!

رات کے بارہ بجے آنے والے اس ٹیکسٹ نے جہاں میرا دماغ خراب کیا تھا وہیں فاطمہ کو بھی بدگمان کر گیا تھا۔

”یہ کون ہے علی اور کس کا نمبر ہے یہ؟“ وہ خفگی بھرے انداز میں پوچھ رہی تھی میں کچھ دیر پہلے ہی کلینک بند کر کے گھر آیا تھا، سیل فون اس کے ہاتھ میں دیکھ کر میں چونکا تھا۔

”میں نہیں جانتا یہ کون ہے اس رائگ نمبر یار۔“
میں نے لا پرواہی سے کہتے ہوئے سیل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”آپ نے کبھی کوشش بھی نہیں کی اس کے متعلق جاننے کی؟“ وہ ابھی بھی مجھے مشکوک نظروں سے گھور رہی تھی۔

”اوہ نہیں یار! تمہاری قسم ایسا کچھ بھی نہیں ہے

میری زندگی میں بس تم ہو بس تم۔“ میں نے یہ کہہ کر فاطمہ کو اپنے بازوؤں میں قید کر لیا تھا وہ کسمپاشی تھی۔
”چھوڑیے مجھے۔“

”ارے ناں چھوڑنے کے لئے تھوڑی اپنایا ہے میری اکلوتی بیوی ہو اور پھر اب میرے ننھے منے کی ہونے والی اماں بھی تو ہو بس اب بدگمانی چھوڑو اور مجھے پیار کرنا۔“ میں شرارت سے بولتا ہوا اس کی طرف جھکا تو وہ شرما کر میرے سینے میں چہرہ چھپا گئی تھی۔

☆☆☆☆

رات کا وقت تھا دونوں چھت پر کھڑی چاند کو دیکھ رہی تھیں چاند اپنے جو بن پر تھا اس کی ٹھنڈی اور میٹھی چاندنی نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اس کے آس پاس ٹمٹماتے تاروں کی لوند ہم پڑ گئی تھی۔

”واہ..... کتنا دلکش منظر ہوتا ہے ناں چاندنی رات کا۔“ اشمیل نے کھوئی کھوئی سی دیا کو دیکھا تھا۔
”آں..... ہاں.....“ وہ چونکی تھی۔

”ہوتا ہوگا۔“ دیا نے بے نیازی سے کہہ کر چاند پر نظریں جمادی تھیں۔

”یعنی تمہیں اس چاندنی رات کی خوبصورتی متاثر نہیں کر رہی؟“ اشمیل نے حیرت سے اس کو گھورا تھا دیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”کرتی تھی۔ اشمیل! پر اب نہیں جب سے اسے دیکھا ہے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تم نے شاید اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا وہ اس چاند سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت ہے اس کے ہونٹ اس کی بڑی بڑی غلائی آنکھیں اس کی کشادہ روشن پیشانی، خوبصورت ناک اور اس کے گال پر چمکتا سیاہ تل، مجھے کہیں اور دیکھنے ہی نہیں دیتا۔“
دیا اس کے تذکرے میں گم تھی اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں میں عجیب روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔

”چند بھی ذات پاڑیاں نہ پریں سیں
تو اچھو منجھ رات رات منجھو بجن

سدا میں سو جھرو“

WWW.PAKSOCIETY.COM

158 دسمبر 2016ء

وہ خاموش ہوئی تو اشمیل نے نا سمجھ آنے والے انداز میں اسے الجھ کر دیکھا تھا۔

”یہ کون سی زبان تھی محترمہ! میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔“ دیا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”چلو تمہارے لئے اس کی ٹرانسلیشن بھی کر دیتی ہوں۔“ وہ اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

”دیانے پھر سے چاند پر نظریں ٹکاتے ہوئے کہا۔“ اے چاند تم چاہے کتنے ہی حسین ہو مگر میرے

محبوب جیسے نہیں بن سکتے اس کا اور تمہارا کوئی مقابلہ نہیں کہ تم صرف رات کو چمکتے روشن لگتے ہو مگر میرا

محبوب تو ہمیشہ روشن رہتا ہے۔“

”زبردست یار..... کیا تم نے خود لکھا ہے؟“

”نہیں تو پر جس نے بھی لکھا ہے خوب لکھا ہے۔“ دیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”سنو! ادھر سے رسپانس ملا کوئی کہ نہیں؟“

اشمیل نے سرگوشیاں انداز میں سوال کیا تھا۔

”نہیں ابھی تک تو نہیں۔“ دیا ایک دم بچھسی گئی تھی۔

”آخر کب یہ سلسلہ ختم ہوگا ہونہہ..... تم اسے صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتیں۔“ وہ جھنجھلائی تھی۔

”بتا دوں گی وقت آنے پر۔“ دیا نے اپنی آنکھوں میں نمی اترتی محسوس کی تھی اشمیل نے تاسف سے اسے دیکھا تھا۔ دیا اس کی رشتے میں نندگی پر

اب نند سے زیادہ عزیز تر سہیلی بن چکی تھی اشمیل اس کے بچھلے بھیا کی بیوی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆

فاطمہ کی بدگمانی دور ہونے پر میں نے شکر ادا کیا تھا پر اپنے دل میں کھلبلی سی مچ چکی تھی جانے کیسی چیخن سی تھی جو کسی پل سکون نہ لینے دے رہی تھی۔

کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا تھا مارے بندھے ہی اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا تھا کافی روز ہو گئے تھے وہ کلینک نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی اس کے گھر کا کوئی فرد آیا تھا میں بے ارادہ ہی اس کا منتظر رہنے لگا سیل فون

بار بار چیک کرتا شاید کوئی پیغام آیا ہو، نظریں بے اختیار باہر کی جانب لگی رہتیں میں خود اپنی بے قراری کو سمجھ نہیں پا رہا تھا جب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا تو

پھر مجھے اس کا انتظار کیوں رہتا ہے؟ میں اکثر یہ سوال اپنے آپ سے کرتا پر جواب نہ دار۔ شاید مجھے بھی یہ بے

نام سائبند تھن اچھا لگنے لگا تھا کچھ نہ کہہ کر بھی جیسے بہت کچھ کہہ دینے والا اس کی بے تحاشا بولتی آنکھوں کی بولی

دلچسپ لگنے لگی تھی میرا دل بہت بوجھل سا رہنے لگا تھا۔

”اگر وہ بھی تو کھل کر سامنے کیوں نہیں آ جاتی“ کیا وجہ ہے کہ جو وہ چھپ رہی ہے مجھ سے آپ شاید

سمجھ رہے ہوں کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے؟ ہے نا جناب ایسی کوئی بات نہیں مجھے اس سے محبت نہیں

ہے میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہے کیوں کر رہی ہے وہ میرے

ساتھ ایسا میری پرسکون زندگی میں ہچل مچا دی ہے اس نے بس یہی جاننا چاہتا ہوں آپ لوگ اپنے

دل سے اس غلط فہمی کو ذرا دور کر لیں میری زندگی میری بیوی فاطمہ سے شروع ہوتی ہے اور اسی پر ختم

خیر سے اب باب بننے والا ہوں میں بہت خوش ہوں بہت خوش۔“ یہ تو آنکھوں میں ایسے ہی کمی سی اتر آئی ہے شاید کچھ پڑ گیا ہے آنکھ میں۔

☆ ☆ ☆ ☆

”مبارک ہو علی میاں بیٹا ہوا ہے۔“ بڑے جاں گسل لحوں کے بعد دائی نے کمرے سے باہر آ کر

مجھے خوشخبری سنائی تھی۔

”خیر مبارک اماں! دونوں ٹھیک تو ہیں ناں؟“

میں نے بے قراری سے پوچھا تھا۔

”ارے ہاں ہاں اللہ کا شکر ہے زچہ و بچہ دونوں تندرست ہیں۔“ دائی ماں نے کہا تو ایک اطمینان سا

میرے رگ دپے میں اتر گیا۔

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے یہ لو دائی ماں میری طرف سے منھائی کے پیسے مزید بعد میں۔“ میں نے

اشمل نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا تھا۔

☆☆☆☆

”میرے ہونٹوں پر اکثر یہ سوال رہا کرتا تھا کہ یہ درد کیا ہوتا ہے؟ یہ محبت کے کہتے ہیں؟ پر اب جب سے چوٹ کھائی ہے تو جانتا ہے یہ درد کے کہتے ہیں؟ محبت کیا ہوتی ہے؟ بہت اذیت ہے بہت درد۔ وہ اشمل کے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی تھی، اشمل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے پھر سے وہی ہنسی لاوے اس کی خوشی لوٹا دے پر وہ بھی بے بس تھی۔

”سمجھایا تھا ناں میں نے تمہیں محبت سوائے اذیت کے کچھ نہیں دیتی خاص طور پر یہ یکطرفہ محبت یہ ایسی آگ ہے جو پورے وجود کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے میری چندا بھول جاؤ اس کو۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ تیزی سے اس سے دور ہنسی تھی۔
”کیسی دوست ہو تم، تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ میں اسے بھول جاؤں گویا سانس لینا بھول جاؤں مارنا چاہتی ہو مجھ کو۔“ دیا کی آواز میں بے درد نے اشمل کو تڑپا دیا تھا۔

”دیکھو دیا! خود کو اذیت مت دو وہ تمہارا نہیں ہو سکتا، پلیز سنبھالو خود کو رحم کرو اپنی حالت پر اپنے لئے نہ ہی گھر والوں کی خاطر سب کتنے پریشان ہیں وہ بار بار مجھ سے سوال کر رہے ہیں کیا کہوں میں ان لوگوں سے بولوں۔“ وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھی جبکہ دیا ساکت تھی۔
”ٹھیک کہتی ہو تم، مجھے اسے بھلانا ہو گا اپنے آنسو خشک کرنے ہوں گے لوگوں کی خاطر ہنسنا بھی ہو گا اپنی حسرتوں کو دل میں دفنانا پڑے گا اپنی اس مردہ محبت کی لاش پر چپکے چپکے رونا ہو گا پر سوچو ذرا اشمل کیا یہ سب اتنا آسان ہے؟ کیا مجھ سے یہ سب ہو پائے گا؟ میں جی نہیں سکوں گی اگر مر نہ پائی تو زندہ لاش ہی کہلوؤں گی تو ٹھیک ہے میں زندہ لاش سہی لو میں نے آنسو پونچھ ڈالے۔“ وہ درد بھرے انداز میں کہتی ہوئی اپنے آنسو صاف کرنے لگی جبکہ اشمل اس کے

جیب سے ہزار ہزار کے تین نوٹ نکالے اور اس کو تھما دیئے وہ خوش ہو کر مجھے دعاؤں سے نوازنے لگی تھی ایسے میں پتہ نہیں کیوں وہ دو آنکھیں جھم سے میرے تصور میں آجی تھیں لودیتی ہوئی محبت سے بھرپور آنکھیں۔

”جانے کہاں کم ہو گئی ہے؟ کوئی خبر ہی نہیں کہاں ہے؟ کیسی ہے؟“ میں بے اختیار سا ہو کر اسے سوچنے لگا تھا۔
”کیا خبر اس کی شادی ہو گئی ہو؟ وہ نہیں دور چلی گئی ہو؟“ ذہن میں خیال سا ابھرا تو دل جیسے کانپ سا گیا تھا میں نے گھبرا کر اس کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے جہاں فاطمہ ننھے مہمان کے ساتھ میری منتظر تھی۔

☆☆☆☆

وہ انکشاف نہیں ایک ایٹم بم تھا جو اس کی ذات کے پرچے اڑانے گیا تھا اس کی آنکھوں میں ویرانیاں اتر آئی تھیں وہ وحشت زدہ سی اشمل کو دیکھ رہی تھی جو خود کم صم سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”میں نے کہا تھا ناں دیا! اس اجنبی کی محبت میں اس قدر آگے مت بڑھو کہ پلٹنا مشکل ہو جائے مت شامل کرو اس کو اپنی زندگی میں بلا سوچے سمجھے۔“ اشمل دکھ سے پل رہی تھی جبکہ دیا کا ٹوٹو بدن میں لہو نہیں کی تغیر بنی کھڑی تھی اس کی سماعتوں میں ابھی تک دھماکے سے ہو رہے تھے اشمل کی آواز اس کو دور سے آتی محسوس ہوئی تھی بار بار ایک ہی جملے کی تکرار ہو رہی تھی۔

”وہ شادی شدہ ہے اس کا چند دنوں کا بیٹا بھی ہے وہ بہت خوش ہے۔“ اس نے گھبرا کر اپنی سسکیوں کا ٹکڑا گھونٹنے کے لئے ہونٹوں پر ہاتھ جمالیا تھا اس کا وجود زلزلہ ہوا تھا۔

”تنت..... تمہیں کیسے پتہ اشمل؟“ وہ بمشکل بولی تھی۔
”تمہارے بھیا گئے تھے اس کے کلینک وہیں انہیں پتہ چلا تھا بلکہ اس نے خود انہیں بتایا اور مٹھائی بھی کھلائی تھی۔“ اشمل نے بیہوشی پلکوں کے ساتھ اسے بتایا تھا۔ وہ ٹوٹ گئی اس کا مان محبت، عشق سب ریت کی مانند بکھرتا چلا گیا اس سے پہلے کہ وہ نیچے گرتی

اجڑے ارمانوں پر اٹک ریز تھی اسے حوصلہ دیتے دیتے وہ اپنا ضبط کھو بیٹھی تھی۔

☆☆☆☆

”اچھا..... پر یہ کیس تو ہارٹ اسپیشلسٹ کا ہے ان کے دل کے والٹر بے حد کمزور ہو چکے ہیں میں تو پریشان ہوں اتنی سی عمر میں یہ سب“۔ میں الجھا تھا جبکہ وہ تو ایسے بے نیاز بیٹھی تھی جیسے اس کے بارے میں نہیں کسی اور کے بارے میں بات ہو رہی ہے اسے دو دفعہ اٹیک ہو چکا تھا اور آخری اٹیک اس کے لئے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا میں نے ہاشم کو مشورہ دیا۔

”آپ اسے اسلام آباد لے جائیے وہاں ایک سے بڑھ کر ایک ڈاکٹر موجود ہے ہو سکتا ہے کچھ حل نکل ہی آئے میں آپ کو کوئی دوا نہیں دے رہا، مکمل پرہیز اور بہتر علاج ہی سے یہ مسئلہ حل ہوگا جو کہ میرے اختیار میں نہیں آپ اسے جتنی جلدی ہو سکے کسی اسپیشل اور بہتر ڈاکٹر سے چیک کروائیے“۔ میں بول رہا تھا ہاشم اور اس کی بیوی کی نظروں میں الجھن، فکر مندی اور پریشانی واضح پڑھی جاسکتی تھی۔

”پر اسے بہت درد ہو رہا ہے بھائی!“ ہاشم کی بیوی نے فکر مندی سے کہا تو میں نے دیا کو اشارے سے اپنی طرف بلا دیا وہ خاموشی سے اٹھی اور میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی اس کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھی اس کا کترایا کترایا سارو یہ میری سمجھ سے باہر تھا میں اسے چیک کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے چھوٹے چھوٹے سوال بھی کر رہا تھا جس کا جواب وہ صرف ہاں ناں میں دے رہی تھی۔

”درد کتنا ہے؟“ میں نے نرمی سے پوچھا تو اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا تھا کپا کچھ نہ تھا ان آنکھوں میں..... شکوہ اذیت ویرانی، درد میں نے گھبرا کر نظریں چرائی تھیں۔

”بہت زیادہ..... بہت درد ہے“۔ وہ آہستہ سے بولی تھی۔

میں بظاہر مریضوں کے ساتھ مصروف تھا پر دل میں جانے کیسی آگ سی جل رہی تھی من چاہ رہا تھا یہ سب چھوڑ چھاڑ کر کسی ویرانے کی طرف نکل جاؤں دل شدت سے تنہائی کا طلب گار تھا آخری مریض کو چیک کر کے میں کرسی پر گر سا گیا تھا سردرد سے بیٹھا جا رہا تھا میں نے کرسی کی پشت سے ٹپک لگا کر آنکھیں سوند لیں ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی جب ایک شناسا سی آواز کانوں سے نکل آئی۔

”السلام علیکم شاہ جی!“ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”علیکم السلام! آپ کیسے..... آئیے“۔ ہاشم کے ساتھ کھڑی شخصیت کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے جھوم گیا تھا تھوڑی دیر پہلے جو طبیعت میں بوجھل پن تھا اڑ چھو ہو چکا تھا۔

”بیٹھیں ناں“۔ وہ لوگ بیٹھ گئے تو میں بھی سنبھل کر ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”جی فرمائیے“۔ میں بظاہر ہاشم سے مخاطب تھا پر میری نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں جو اپنی بھابی کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی تھی اس نے ایک بار بھی میری طرف نہ دیکھا تھا میں دل ہی دل میں حیران ہوا تھا ہاشم نے چند رپورٹس اٹھا کر میری طرف بڑھا دیں۔

”یہ دیکھ لو علی!“ میں نے رپورٹس پکڑیں اور کھول کر دیکھنے لگا۔

”دیا شاہ..... یہ کون ہے.....؟“ میں نے بے اختیار سوال کیا تھا ہاشم نے انگلی سے اس کی جانب اشارہ کیا تھا میں چونکا اور پھر سے رپورٹس پڑھنے لگا جوں جوں رپورٹس بڑھتا جا رہا تھا میری پریشانی اور فکر بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

”آپ لوگوں نے کسی بڑے ڈاکٹر سے رابطہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



اور دیا شاید خوش قسمت بھی ہے اور سب سے بد قسمت بھی۔ محبت کو کھودینا کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔ اشمیل کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر رخسار پر آرہے تھے۔

☆☆☆☆

”دیا! تم یاگل ہو جانتی بھی ہو کیا کہہ رہی ہو۔“ اشمیل چیخ ہی تو اٹھی تھی۔

”تم..... تم اس سے محبت کی بھیک مانگو گی تم اپنی انا اپنا وقار داؤ پر لگا دو گی دیا ہوش کرو۔“

”نہیں اشمیل! محبت بھیک نہیں ہے پر اگر مانگنے سے مل جائے تو حرج ہی کیا ہے؟“

”تم دیوانی ہو گئی ہو وہ شادی شدہ ہے بچے کا باپ۔“

”تو.....؟“ دیا نے کندھے اچکائے۔

”میرے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے میری طرف سے وہ چار یا دس بچوں کا باپ بن جائے مجھے فرق نہیں پڑتا۔“

”اور اس کی بیوی.....؟“ اشمیل نے طنز کیا تھا۔

”بیوی.....“ دیا ایک لمحے کے لئے چپ سی ہو گئی تھی۔

”میں اس کی نوکرانی بن جاؤں گی اگر وہ صرف ایک بار مجھے میرا بلی دے دے سچ کہہ رہی ہوں اشمیل!

مجھے اس سے کوئی رقابت نہیں بلکہ مجھے اچھا لگتا ہے کہ کوئی تو ہے جو اس کا خیال رکھتا ہے کتنی خوش قسمت ہے ناں وہ اس کے اس قدر قریب ہے جب جی چاہے اس کو چھو سکتی ہے اسے دیکھ سکتی ہے اس کی آنکھیں اشمیل وہ اسے ان آنکھوں سے روز دیکھتی ہے اور ایک میں ہوں جو اس کی جھلک دیکھنے کے لئے مری جا رہی ہوں اس سے کس قدر دور ہوں اسے پانہیں سکتی بہت کوشش کرتی ہوں اسے بھول جاؤں پر وہ دشمن جاں بھولتا ہی نہیں ہے اس کی محبت تو وجود میں لبو بن کر دوڑنے لگتی ہے وہ تو میرے جسم میں روح کی طرح آن سما یا ہے اور اگر جسم سے روح ہی نکل جائے تو پھر پیچھے رہتا ہی کیا ہے؟“ دیا خاموش ہوئی تو

”ابھی ٹھیک ہو جائے گا میں نے جلدی سے کاغذ و قلم سنبھالا ایک ٹین کلر ٹیبلٹ کا نام لکھا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ جاتے ہوئے اسٹور سے لے لینا انشاء اللہ آرام آ جائے گا۔“ اس نے خاموشی سے وہ پرچی تھام لی پر اس کی بھیگی پلکیں مجھے بے چین کر گئی تھیں وہ لوگ چلے گئے تھے پر میری نگاہوں نے اس کا تعاقب دور تک کیا تھا اس کی چال میں عجب شگفتگی سی تھی لڑکھڑاتے ہوئے قدم بالکل کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر تہی داماں رہ گیا ہو بے اختیار دل سے اس کی صحت یابی کی دعا نکلی تھی۔

☆☆☆☆

”کہتے ہیں کہ جذبے سچے ہوں تو وہ اپنا راستہ خود بخود بنا لیتے ہیں منزلیں آسان ہوتی جاتی ہیں تو کیا میرے جذبوں میں کوئی کھوٹ ہے جو مجھے اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا کوئی راہ مجھے اس تک لے کر نہیں جاتی۔“ دیا بے بسی سے رو پڑی تھی۔

”یا خدا! میں کیا کروں انسان با اختیار ہو کر بھی

کتابے بس ہے اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں کتنی اذیت ہوتی ہے بہت تکلیف جی چاہتا ہے چیخ کر

روؤں پر کیا کروں میں رو نہیں سکتی اپنا درد کسی کو بتا نہیں سکتی درد انگیز فریادیں لبوں پر آ کر دم توڑ جاتی ہیں۔ آہیں اور سسکیاں اندر ہی اندر گھٹ جاتی ہیں اپنی آنکھوں میں آئے اس غم کے سمندر کو خشک کرنا پڑتا ہے لوگوں کی خاطر ہنسنا پڑتا ہے میں لمحہ لمحہ مر رہی ہوں یا خدا! مجھے اس اذیت سے نجات عطا کر یا پھر اس شخص کو میرا کر دے اس کا درد مجھے مار ڈالے گا مار ڈالے گا مجھے۔“ وہ سسک کر رو رہی تھی اشمیل جو اسے دوا دینے کے لئے آئی تھی دروازے میں ساکت کھڑی رہ گئی۔ وہ تو کبھی تھی کہ وہ اسے بھول چکی ہے پر۔

”محبت کی دولت کسی خوش قسمت کو ہی ملتی ہے

اشمل نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ دیا نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔
”کچھ مت کہو بس اک بار مجھے اپنی قسمت آزمانے دو اگر مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو خاموش رہو پلیز“۔ دیا کے لہجے میں جہاں بھر کا درد بھرا تھا، اشمل نے بے بسی سے اسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلا کر گویا اجازت دی تھی۔

☆☆☆☆

”علی! میں نہیں جانتی آپ میرے بارے میں کیا سوچو گے پر خدا را کچھ غلط مت سمجھنا مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا ہے آج بہت ہمت کر کے اس ٹیکسٹ کے ذریعے آپ سے مخاطب ہوں علی! آپ نے مجھ سے پوچھا تھا ناں کہاں درد ہے آپ اس درد کا مداوا نہیں کر سکتے اس درد کا علاج تو کسی کے پاس بھی نہیں ہے یہ یکطرفہ محبت کا درد ہے میں جانتی ہوں آپ میرے نہیں ہو سکتے میں نے خود کو بہت روکا بہت سمجھایا کہ اس راہ پر نہ چلوں جس کی کوئی منزل نہیں ہے جہاں صرف کانٹے ہیں پر یہ دل ہے کہ مانتا ہی نہیں علی مجھے آپ سے محبت ہے اتنی کہ شاید آپ اندازہ بھی نہ کر پائیں اگر آپ کو میری باتیں بری لگیں تو پاگل، نادان سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔“
ٹیکسٹ ختم ہو چکا تھا پر فاطمہ کے دل کی دنیا برباد ہو چکی تھی وہ انتہائی چارحانہ موڈ میں آچکی تھی علی گھر پر نہیں تھا اس کا سیل فون چار جنگ پر لگا ہوا تھا یقیناً وہ اسے ساتھ لے جانا بھول گیا تھا۔

☆☆☆☆

میں رات گئے گھر لوٹا تھا تھکن میرے چہرے سے ہی ظاہر ہو رہی تھی فاطمہ نے واش روم سے باہر نکلتے ہوئے مجھے بغور دیکھا تھا میں اس کے اس طرح دیکھنے پر چونکا ضرور تھا۔

”کیا بات ہے نیگم! یوں کیا دیکھ رہی ہو“۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو جواباً اس نے میرا سیل

فون میرے ہاتھ میں تھا دیا۔
”خود دیکھ لیں علی! اور مجھے بھی بتا دیجئے گا اپنا فیصلہ ہاں یا درکھیے گا اس لڑکی کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں جس روز وہ یہاں آئے گی میں اپنے بچے سمیت یہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں گی“۔ وہ انتہائی سرد لہجے میں کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی جبکہ میں دم بخود سا اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔
”اسے کیا ہوا ہے.....؟“ میں نے حیرت سے

سوچا پھر ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھا کندھے اچکاتے ہوئے میں نے ان بکس اوپن کیا ایک سے دوسرا ٹیکسٹ پڑھتا گیا اس نمبر سے کئے گئے کھلے اقرار نے مجھے اندر تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔

”اس کا مطلب فاطمہ نے یہ سب پڑھ لئے ہیں اوہ مائی گاڈ“۔ میں سر پکڑ کر بند پڑھ سا گیا تھا۔

☆☆☆☆

میں ساری رات سو نہیں پایا تھا عجب کشمکش میں مبتلا تھا میرے اندر جنگ کی چھڑ چکی تھی۔
”میں جانتے بوجھتے خود کو برباد نہیں کر سکتا“ میری بیوی اور میرا فیضان بیٹا مجھے ساری دنیا سے بڑھ کر عزیز ہیں میں ان کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا مجھے فاطمہ کو منالینا چاہئے میرا کیا واسطہ بھلا اس رات گھر سے۔ پر دل چل چل کر مجھے روک رہا تھا اپنی نوزائیدہ محبت کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا پر میں نے بے حس بن کر اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا اور فاطمہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”سنو مار بیوی! میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا میرا اس سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ جو بھی ہے خود سے ہی کر رہی ہے میری بات کا یقین کرو میں صرف تمہارا ہوں“۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ میرے سینے سے آگئی۔

”میں نے شرارت سے اسے دوبارہ بازوؤں میں جکڑا وہ جھنجھلائی تو میں ہنس پڑا اور اسے بازوؤں

WWW.PAKSOCIETY.COM

164 دہلا بجے 2016ء

کی قید سے آزاد کر دیا۔
 ”یقین ہے ناں تمہیں کہ میں صرف تمہارا
 ہوں اور میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔“ میں نے
 یقین چاہا تو چائے کے لئے پانی چولہے پر رکھتی
 فاطمہ میری طرف پلٹی۔

”مجھے یقین ہے علی پر..... اس پر نہیں دوسری
 عورت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے بس اک لمحہ لگتا
 ہے مرد کو پھسلنے میں میری ناراضی دور کرنا چاہتے ہو
 ناں تو آئندہ اس نمبر سے آپ کے نمبر پر کوئی
 ٹیکسٹ نہ آئے بس۔“ وہ حتیٰ لہجہ میں کہتی دوبارہ
 اپنے کام میں مصروف ہو گئی جبکہ میں بے بس سا
 اسے تکتا رہ گیا۔

☆☆☆☆

”واہ..... بہت دیوانگی ظاہر ہو رہی ہے یار
 تمہارے لئے مجھے لگتا ہے وہ کچھ مجھ سے بہت چاہتی
 ہے اف یار..... کاش کوئی مجھے بھی اس قدر پیار
 کرے۔“ اچھا خاصا دلچسپی اور اداس نظر آنے کی
 ایکٹنگ کرنے والا یہ میرا بچپن کا دوست ”حسین“
 تھا اسے میں نے کلینک میں بلایا تھا تا کہ وہ میرے
 مسئلے کا مجھے کوئی حل بتا سکے پر وہ تو خود ٹھنڈی آہیں
 بھرنے لگا تھا۔

”یار علی! چھوڑ یار بھابی کی دھمکی کو کر لے
 سینک اس سے۔“ وہ آنکھ دبا کر بولتا مجھے تاؤ
 دلا گیا تھا۔

”تم میرے ہاتھ سے قتل ہو جاؤ گے آج چل
 نکل یہاں سے۔“ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر
 باہر کا راستہ دکھایا تو وہ تہقہہ لگاتا ہوا دوبارہ کرسی پر
 پھیل کر بیٹھ گیا۔

”اچھا غصہ مت ہو مجھے اس کا نمبر دے ساری
 معلومات تمہیں شام تک مل جائیں گی کہ آخر کون ہے
 جو میرے یار کو تنگ کر رہی ہے؟ اچھا سن پتہ کر کے ٹاٹا
 کرنا ہے یا پھر۔“ وہ پھر شرارت سے بولتا جملہ ادھورا

چھوڑ گیا میں اس کی آنکھوں میں چھپی شرارت کو اچھی
 طرح سمجھ گیا تھا۔
 ”بس میں نے تمہیں کہہ دیا ہے ناں میری جان
 چھڑوا اس سے آئندہ میرے نمبر پر اس کا کوئی
 ٹیکسٹ وغیرہ نہ آئے۔“ میں نے اسے گھورتے
 ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”ٹھیک ہے جناب! اب چائے تو پلوادے کہ
 ایسے ہی ٹرخا دے گا۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے
 کہا تو میں ہنس دیا۔ اس نے مسکرا کر اپنے سیل فون
 میں نمبر سیو کر لیا تھا۔

☆☆☆☆

شام کو وہ کلینک آیا تو اچھا خاصا الجھا اور پریشان
 سا تھا، میں کلینک میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا وہ سیدھا
 میرے سامنے بڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اس کی اتری
 شکل دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔

”کیا بات ہے حسین! خیریت۔“ وہ بدستور
 سنجیدہ سا مجھے دیکھتا رہا۔

”کچھ بولو گے کہ نہیں۔“ میں نے اس کی
 آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تو وہ چونکا۔

”سن تو واقعی نہیں جانتا کہ یہ کس کا نمبر ہے؟“
 حسین نے سوال کیا تو میں نے نفی میں سر ہلادیا۔

”نہیں یار! میں واقعی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟“
 ”رہ تو تجھے بہت اچھی طرح سے جانتی ہے علی!“
 تیرے کلینک بھی آتی جاتی ہے۔“

”دیکھو پھیلیاں مت بھجواؤ“ میرے کلینک پر تو
 کئی لوگ آتے ہیں۔“

”دیا شاہ کو جانتا ہے؟“ اس نے میرے چہرے
 پر نظریں جماتے ہوئے کہا تو میں ٹھنک گیا۔

”دیا..... میرے ہونٹوں سے نکلا تھا دل میں درد
 سا اٹھتا تھا۔“

☆☆☆☆

دیا کی آنکھوں میں پھر سے وہی شوخی اتر آئی تھی

”یہ باتیں اس نے تم سے کال پر کی تھیں؟“
 ”نہیں ٹیکسٹ پیس کی تھیں۔“ دیا نے جواب دیا تو
 وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”تمہیں یقین ہے وہ علی ہی ہے اور نمبر بھی اسی کا ہے؟“
 ”نمبر تو اس کا نیا ہے اور باتوں سے تو سو فیصد علی
 ہی لگتا ہے۔“

”بے وقوف ہو تم، کسی پر اتنی جلدی اعتبار نہیں
 کرنا چاہئے۔“

”اوہو چھوڑو بھی وہ علی ہی ہے میرا دل کہتا
 ہے۔“ دیا نے لا پرواہی سے کہتے ہوئے اس کی بات
 سنی ان کی کردی تھی۔

☆☆☆☆

حسین نے دیا کا نام میرے سامنے لیا تو دل بے
 کل سا ہو گیا، جی چاہا تھا کہ ابھی اسی وقت دیا کے
 سامنے جا کر اپنی نیم مردہ محبت کا اعتراف کر لوں جو
 اس کے وصل کی گھڑیاں گن رہی ہے پر اسے ہجر کی
 سولی پر چڑھنا پڑ رہا ہے محبت کی مسافت میں وہ تنہا
 نہیں میں نے بھی یہ سفر اس کے سنگ کیا ہے میں نے
 بھی آبلہ پائی کا کرب سہا ہے میں نے بھی اس رستے
 پر اگے بول کے کانٹوں کی اذیت سہی ہے ہجر کا درد
 جھیلنا ہے راتوں کو کئی بار اٹھ کر اس کو پکارا ہے یہ پلکیں
 کئی بار بھیگی ہیں دل حکم حکم کر اس کے ساتھ کا
 تمنائی ہے یہ چل چل کر اس کی راہوں میں مجھ بچھ
 جانا ہے اور اس سے کہوں کہ یہ آنکھیں ہر لمحہ تمہیں
 دیکھنا چاہتی ہیں میرا دل تمہارے سنگ خوش رہنا
 چاہتا ہے تمہیں پا کر اک نئے جہان کی سیر کرنا چاہتا
 ہے محبت کی سنگلاخ وادیوں میں اتر کر اس کا نشہ پانا
 چاہتا ہے اس کی آغوش میں سر رکھ کر اک گہری اور
 میٹھی نیند سونا چاہتا ہے بہت جی چاہتا ہے یہ سب اس
 سے کہہ دوں مگر دنیا کے رسم و رواج راہ میں حائل
 ہو جاتے ہیں کئی مجبوریاں راستہ روک کر کھڑی
 ہو جاتی ہیں کیا معاشرہ ہماری اس محبت کو قبول کر

وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی خوشی سے دیوانی ہوئی
 جارہی تھی۔

”دعا کرو میری خوشی کو کسی کی نظر نہ لگے۔“ اشمیل
 ہنس کر آمین کہہ دیتی۔

”کچھ بتاؤ بھی تو سہی کیا کہا ہے علی نے جویوں
 باؤلی ہوئی جارہی ہو۔“ اشمیل موقع ملتے ہی اس کے
 پاس چلی آئی تھی۔

”ابھی تو کچھ نہیں کہا بس تعارف ہوا ہے۔“ وہ
 مسکراتی ہوئی بولی تو اشمیل نے اسے گھورا۔

”بس تعارف پر ہی اتنی باؤلی جارہی ہو۔“
 ”نہیں تو اور بھی باتیں ہوئی تھیں۔“ وہ کھوئے

کھوئے سے انداز میں بولی۔
 ”اچھا تو اور کیا باتیں ہوئیں؟“ اشمیل نے اسے

بازو سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے پوچھا جو اپنے ہی
 خیالوں میں مست کھڑی تھی۔

”تم نے اپنی دیوانگی کے بارے میں نہیں بتایا
 اسے۔“ اشمیل نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے

گویا اس کی عقل پر ماتم کیا تھا۔
 ”ہاں بتایا ناں۔“ دیا اس کے انداز پر ہنسی تھی۔

”کیا بتایا جلدی بولو؟“ اشمیل نے بے تابی
 سے پوچھا تھا۔

”یہی کہ یہ پاگل سی احمق نادان لڑکی آپ کی
 محبت میں دل کی مریضہ بن چکی ہے اور اپنی باقی ماندہ

زندگی آپ جیسے مسیحا کے سنگ گزارنا چاہتی ہے۔“ وہ
 شریر سے لہجے میں کہتی ہنسی تھی اس کی آنکھوں میں

آج انوکھی ہی چمک تھی زندگی سے بھرپور ہنسی اس
 کے لبوں سے جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”تو پھر اس نے کیا کہا؟“ اشمیل کی بے چینی
 بڑھ چکی تھی۔

”ابھی تو کچھ خاص نہیں، بس یہ کہا کہ آج سے
 آپ میری دوست ہو مستقبل میں کیا ہوگا یہ سوچ کر

بتاؤں گا۔“ دیا نے کہا تو اشمیل الجھ ہی گئی۔

کا بازو پکڑ لیا، مگر وہ اپنے حواسوں میں نہیں رہی تھی وہ ہوش کی دنیا سے بیگانہ ہو کر فرش پر گری گئی۔

☆☆☆☆

حسین ابھی ابھی اٹھ کر میرے پاس سے گیا ہے اس نے دیا کو جو نیکسٹ کیا تھا وہ مجھے دکھانے آیا تھا میں بظاہر مطمئن سا ہو گیا تھا پر اندر ہی اندر کوئی چیز تھی جو مجھے پریشان کر رہی تھی مجھے بہت گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے اف کیا کروں میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ابھی میسج ٹیون نے مجھے چونکا دیا میں نے نیکسٹ اوپن کیا تو وہ دیا کے نمبر سے آیا تھا۔

”اگر میں

مر جاؤں تو

میری قبر کے سر ہانے

بیٹھ کر

بس اتنا کرنا دو آنسو

ٹپکا کر آنکھوں سے

میری وفا کی

قیمت چکا دینا

اک سرد آہ میرے لبوں سے نکلی تھی۔

”کوئی کسی کے لئے نہیں مرنے دیا جب تم

میری بے وفائی کے بارے میں جانو گی اور یہ جانو گی

میں تمہارے متعلق کیا سوچتا ہوں تم میری طرف دیکھنا

بھی پسند نہیں کرو گی۔“ میں نے صفر سے سوچا تھا اور

بھول گیا تھا کہ دیا واقعی کسی ایسے صدمے کو سہا نہیں

پائے گی رات کا پچھلا پہر تھا نیند میری آنکھوں سے

گو سوں دور تھی میں بہت اداس اور پریشان سا تھا

میرے پہلو میں فاطمہ اور فیضان محو خواب تھے تب پھر

میسج ٹیون بجی تھی میں نے جلدی سے سیل فون اٹھا کر

ان بکس اوپن کیا تھا دیا کا نام دیکھ کر میں چونک گیا

نیکسٹ پڑھنے لگا تو دل جیسے دھڑکنے لگا بھول گیا تھا۔

”علی مجھے بچاؤ بہت تکلیف ہے، علی آ جاؤ۔“

کتنی درد بھری پکار تھی میں تڑپ گیا تھا۔ میں نے

پائے گا؟ یہ زمانے واسلے ہمیں جینے نہیں دیں گے غیر تو غیر اپنے طعنے دے دے کر لہو لہان کر ڈالیں گے اتنی کڑی فیصلوں کو پاٹنا ہمارے بس میں نہیں ہے دیا میں تمہیں کبھی خوشیوں بھری زندگی نہ دے پاؤں گا آج میں اعتراف کرتا ہوں میں ایک کمزور انسان ہوں جو اپنے ناتواں کندھوں پر اس محبت کا بوجھ نہیں لاد سکتا، میری دعا ہے کہ تم جہاں رہو خوش اور آباد رہو۔“ علی کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر گرے تھے اور حسین سوچ رہا تھا یہ کیسی محبت ہے؟ زندہ درگور کر دینے والی اس کے دل سے آواز آئی تھی۔

☆☆☆☆

دیا کا وجود زلزلوں کی زد میں تھا تقدیر نے اس کے ساتھ بہت بھیا تک مذاق کیا تھا وہ جو تقدیر کو آزمانے نکلی تھی بری طرح شکست کھا چکی تھی اس کا پورا وجود لہو لہان تھا اس کی روح پر ایسے گھاؤ لگے تھے کہ جو کبھی بھر نہ پائیں اس کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں بظاہر خشک تھی پر دل میں اذیت کا لاوا سا ابل رہا تھا اس نے لرزتے ہاتھوں سے ایک ٹیکسٹ ٹائپ کیا اور علی کو سینڈ کر دیا۔

☆☆☆☆

”میں جو حقیقت آپ کو بتانے جا رہا ہوں یقیناً آپ کے لئے بہت تکلیف دہ ہوگی پر میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتا، میں علی نہیں ہوں میں اس کا دوست حسین ہوں میں نے یہ سب صرف علی کی وجہ سے کیا، بہر حال میں نے یہ سب اسے بتایا تو وہ حیران ہوا اس نے مجھے کہا کہ وہ کسی دیا کو نہیں جانتا ہو سکے تو میری اس سے جان چھڑوا دو اور آئندہ اس کا ٹیکسٹ میرے نمبر پر نہ آئے، میں آپ کا دل سے احترام کرتا ہوں اور آپ کو مشورہ دوں گا کہ علی کو بھول جائے اس کا خیال دل سے نکال دیں۔“ نیکسٹ ختم ہوا تو احممل نے صدمے سے گم صم کھڑی دیا کو دیکھا تھا اس کی رنگت ہلدی کی مانند زرد ہو رہی تھی اس نے گھبرا کر اس

گئی۔ میں سسکتا ہوا تھا خود حسین ساکت تھا۔
”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ میں نے مختصر سے لفظوں
میں اسے ساری بات بتائی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ!“ اس کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔
ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے نظریں چرائے
کھڑے تھے۔

☆☆☆☆

آج 26 نومبر کو اس کی پانچویں برسی ہے میں
خود کہاں زندہ ہوں؟ مر چکا ہوں اور اپنی حسرتوں کی
قبر میں دفن ہوں اور جانے کب تک رہوں گاہے آتی
جانی سانس ہی مجھے اپنے ہونے کا احساس دلاتی
ہیں یا پھر وہ لمحے جب میں اس کی قبر پر جا کر دعا کرتا
ہوں اور رورور کر اس سے معافی مانگتا ہوں مگر وہ مجھ
سے بولتی ہی نہیں وہ سچ سچ میری جان چھوڑ گئی ہے پر
جاتے جاتے میرا سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی ہے
میں اپنی زندگی کا اک اک لمحہ اس کی یاد میں بسر کرتا
ہوں فاطمہ نے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیا ہے وہ
بھی شاید سمجھ چکی ہے کہ میرے پاس اب کچھ نہیں رہا
اس کے لئے۔

☆☆☆☆

”5 سال بیت گئے ہیں دیا تمہیں ہم سے
پچھڑنے یہ لمحے کیسے گزرے ان کا درد کوئی نہیں
جان سکتا اور ہاں تمہارا درد بھی تو کوئی نہ سمجھ سکا جس
کے لئے قسمت کو آزمانے چلی تھیں وہ آتا ہے اور
وہ بھی کتب جب تم ہمیشہ کے لئے خاک اوڑھ کر
سوچ چکی ہو میں نے اسے دیکھا تھا بہت ٹوٹا ہوا
اور شرمندہ ہے پر کیا فائدہ دیا؟ کاش..... وہ
تمہاری زندگی میں کبھی نہ آیا ہوتا۔“ اشل دیا کی
قبر کے پاس بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی اشک
اس کی آنکھوں سے موتیوں کی لڑی مانند ٹوٹ
ٹوٹ کر زمین پہ گر رہے تھے۔

☆☆.....☆☆.....☆☆

جلدی جلدی دیا کے نمبر پر کال ملائی تھی مسلسل بیل
جاری تھی مگر کوئی بھی ریسیو نہیں کر رہا تھا آخر تیسری
دفعہ ملانے پر کال ریسیو ہوئی گئی۔

”السلام علیکم“ فون ریسیو ہوتے ہی میں نے کہا۔
”وعلیکم السلام! کس لئے فون کیا ہے آپ
نے۔“ دوسری طرف سے روٹی روٹی آواز ابھری تھی
یہ کوئی اور خاتون تھی دیا تو نہیں میں گھبرا گیا تھا۔
”جی مجھے دیا سے بات کرنی ہے۔“

”سوری دیا آپ سے بات نہیں کر سکتی کیونکہ
آپ نے اسے بات کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا
وہ مر گئی ہے۔“ دوسری طرف سے دی گئی اطلاع نے
جیسے میری روح کھینچ لی تھی۔

”نہیں ابھی کچھ دیر پہلے۔“ میں نے کچھ کہنا چاہا
تھا پر لائن کاٹ دی گئی تھی میں صدمے سے ساکت
بیٹھا رہ گیا تھا مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنے ہوش کھو
بیٹھوں گا۔

”مم..... مم..... مجھے جانا چاہئے۔“ میں جلدی
سے اٹھا اور باہر پیدل ہی نکل آیا تھا آدھی رات کا
وقت تھا اور میں تنہا کچھ دیر سوچ کر حسین کو کال
ملانے لگا نیند میں ڈوبی آواز تھی۔

”حسین! میں علی بول رہا ہوں جلدی سے
بائیک لے کر باہر گلی میں آؤ ایمر جیسی ہے۔“

”کیا..... کک کیا ہوا ہے؟“ وہ گھبرا گیا تھا۔
”آؤ پھر بتاتا ہوں۔“ میں نے بڑی مشکل سے
خود پر ضبط کے بندھ باندھے تھے۔ کچھ ہی دیر میں
حسین بائیک پر میرے پاس آن پہنچا میری حالت
دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

”اوائے کیا ہوا.....؟“ وہ حد سے زیادہ پریشان
ہو گیا تھا۔

”وہ مر گئی ہے دیا۔“ میں نے جانتے بوجھے
اسے مار ڈالا جانتا تھا وہ نہیں سبہ پائے گی پھر بھی
اسے شاک دیا ایسا شاک کہ وہ زندگی سے روٹھ



”مجھے زیادہ سوال جواب پسند نہیں ہیں۔“
 ”میں تو جاؤں گی۔“ مجھے ضد چڑھ گئی۔ جب میرے
 میاں کو کوئی اعتراض نہیں تو ان کو کیا تکلیف ہے۔
 ”میں بھی دیکھتی ہوں تو کیسے جائے گی۔“ وہ
 ڈھال بن کر دروازے کے آگے کھڑی ہو گئیں۔
 اور پھر اگلے اڑھائی گھنٹے میری ان سے تو میں
 میں ہوئی۔ نہیں جانے دیا انہوں نے مجھے۔ میرا دل
 بھر آیا، ضبط اور صبر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔
 اور پھر یہ جھگڑے معمول بن گئے۔ بات بے
 بات کے جھگڑے، لڑائیاں..... تکرار..... بار ظاہر
 ہے میری ہوتی۔ نندیں طنز کے تیر چلاتیں۔
 جھٹائیاں مجھے روتا دیکھ کر خوب ٹھٹھے مارتیں، پھول نا
 بن سکی میں۔

☆.....☆

چھ سال ہو گئے میری شادی کو لیکن حیثیت وہی
 رہی سسرال میں جواول روز سے تھی۔ ساس جوتے
 کی نوک پر رکھتیں۔ نندیں تمسخر اڑاتیں۔ آئے روز
 کے جھگڑے اور تکرار سکون غارت ہو گیا تھا۔
 ”یہ کھانا بنایا ہے؟ مجھے تو یہی نہیں پتا چل رہا کہ
 کو بھی پکی ہوئی ہے یا کر پلے؟“ ساس کے تیر۔
 ”اماں! جو مرضی سمجھ کر کھالیں۔ ذائقہ تو کسی کا
 بھی نہیں ہوگا۔“ چھوٹی نند کا چٹکلا۔

”اوئی ماں! اتنی مرجھیں، بوا سیر سے مارو گی کیا بہو؟“
 ”ہائے ہائے چلی ہوئی روٹیاں۔“
 ”کچے چاول۔“
 میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ چیخ زور سے پلیٹ
 میں پتھر کراٹھ گئی۔

”اتنے خخرے ہیں تو خود پکا لیا کریں، دس دس
 گھنٹے چوبیس کے آگے کھڑے ہو کر نوکرانیوں کی
 طرح پکاؤ پھر خخرے بھی سہو۔“

”بہو! یہ کس زبان میں بات کر رہی ہو؟“
 میرے شوہر نے بھی مجھے گھورا۔ ساس بیٹے کی

”اگر تم پھول نہیں بن سکتے تو کاشا بھی مت بنو
 اور یہاں میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں کہ اگر تم
 کاشا نہیں بنو گی تو ایک دن پھول بن ہی جاؤ گے۔“
 اور یقین چاہیے، میں نے پھول بننے کی بہت کوشش
 کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ہر دفعہ ناکام رہی، یہ بات نہیں
 کہ میں ہمت ہار گئی بلکہ حقیقتاً شاید میں تھک گئی۔
 پھول بننے کی کوشش کی ابتداء میں نے اس دن
 سے کی جب سسرال میں میرا پہلا دن تھا۔ ماشاء اللہ
 بھر اپر اسسرال تھا میرا۔ چار نندیں، دو جھٹائیاں، چار
 دیور، ساس، سر.....! میری کوشش تھی کہ میں پہلے
 دن سے ہی سب کے دلوں میں گھر کر جاؤں اور
 کوشش کی ابتدائی میں نے پہلے دن ہی اس وقت کی
 جب میری ساس کی رشتے دار سے کہہ رہی تھیں۔

”کوئی ایسا خاص امیر خاندان بھی نہیں ہے بہو کا،
 ارے اس سے زیادہ امیر تو میرے بھائی کا خاندان
 ہے۔ میرے بھائی نے اپنی بیٹی کو جہیز میں کار تک دی
 تھی۔ انہوں نے کیا دیا؟ کچھ نہیں نہیں، وہی گھسی پٹی
 چند چیزیں۔“

میرا دل جل گیا یہ سن کر لیکن میں نے صبر کیا۔
 رخصتی کے وقت بھی میری نندوں نے بتایا۔
 ”بھائی کا لہنگا اتنا شاندار نہیں جیسا میری دوست کا
 تھا۔ اڑھائی لاکھ کا تھا، یہ تو ساٹھ ستر ہزار والا ہے۔“
 میں ایک دفعہ پھر سہہ گئی۔

اور پھر ہر گزرتے دن پر سہنا میری عادت بن
 گئی۔ میں صبر کر جاتی لیکن آخر کب تک؟ برداشت کی
 بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ حد اس دن پار ہو گئی جب
 میں اپنے میکے جانے کے لیے تیار ہوئی تو میری ساس
 نے روک دیا۔

”کوئی ضرورت نہیں روز ادھر جانے کی ادھر ہی
 رہو۔“ مجھے تپ چڑھی دو گھنٹے لگا کر تیار ہوئی تھی میں۔
 ”کیوں ای جی! آج عثمان کی سالگرہ ہے۔“
 انہوں نے مجھے آنکھیں دکھائیں۔

ہمدردی پا کر پھیل گئیں۔

تھیں۔ ساس بھی اللہ بخشے بہت لڑاکا۔ میں بڑی دھان پان سی۔ وہی بیٹی تیری سسرال والا چال۔ بات بے بات طنز، مسخر، میں جب وداع ہوئی تھی تو اماں نے بس ایک بات کہی تھی۔

”بیٹی زبان نہ کھولنا، منہ نہ کھولنا، لاکھ چوٹیں آئیں، سی نہ کرنا۔ بس میں نے وہ نصیحت پلو سے باندھ لی۔ زبان نہیں کھولی۔ ایک دفعہ بھی۔ دل ہی دل میں جو کہا سو کہا۔ زبان پر ایک حرف بھی نہیں۔ اللہ پاک اجر ضرور دیتا ہے۔ نندیں بیاہی گئیں۔ ساس اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ چار بیٹے دیے اللہ نے۔ اللہ نظر بد سے بچائے، چار ہیرے جیسی بہویں میرے حلق سے آواز نکلنے سے پہلے آ جاتی ہیں۔

”دیکھ بیٹی پھول بن گئی ناں۔“ مجھے سمجھ آنے لگی تھی۔

”جو پھول نہ بن سکے وہ کانٹا بھی نہ بنے۔ تیرے سے یہی غلطی ہوئی۔ تو پھول نہیں بن پائی تو کانٹا بن گئی۔ بیٹی رانی! پھول یا کانٹا بننا ہمارا اپنا اختیار ہے۔ یہ چند چھٹانک کی زبان، یہی سے ساری بات، یہ بات قابو میں ہے تو سمجھ بن گئے پھول و گر نہ کانٹا۔ اس زبان کو قابو میں رکھنا سیکھ۔ پھول نابنی تو کانٹا بھی نہیں بنے گی۔“

اور مجھے اس دن ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ گر کی بات تو وہی تھی جو خالہ کلثوم نے کہہ دی تھی۔ زبان اگر قابو میں ہے تو آپ پھول ہیں و گر نہ کانٹا۔ میں نے تو اپنا محاسبہ کر لیا اور سسرال واپس آ کر کانٹا نہ بننے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔

اب باقی آپ کا کام ہے۔
دیکھ لیں اور اپنا محاسبہ کر لیں۔
آپ پھول ہیں

یا
کانٹا؟

”بس یہ عزت رہ گئی ہے میری اس گھر میں بیٹے۔“
”عالیہ تمہیں تمیز نہیں ہے؟“ میرے شوہر نے گھر کا۔
”معافی مانگو۔“ میرا دل بھر آیا۔

سب کچھ چھوڑ چھاڑ میکے آ گئی۔ کانٹا بن گئی میں۔
ادھر میری ضد ادھر ان کی انا۔

”گئی خود ہے تو آئے گی بھی خود، ہم میں سے کوئی بھی لینے نہیں آئے گا۔“ میری ساس نے ای کو کھری کھری سنائی۔

”میں نہیں جاؤں گی اس دوزخ میں دوبارہ۔“
میں دن میں سینکڑوں دفعہ چلائی۔

چھ سال ہو گئے تھے مجھے ایک ایک کی برداشت کرتے، ضبط کرتے، صبر کرتے لیکن اب میری بس ہو گئی تھی۔ مجھے چار ماہ گزر گئے ای کے گھر رہتے رہتے، نندا دھر سے کوئی لینے آیا نہ ادھر سے میں گئی۔

اس دن میں خالہ کلثوم سے ملنے ان کے گھر گئی تھی۔ خالہ کلثوم ویسے تو میری ای کی خالہ تھیں لیکن میں بھی ان کو خالہ ہی کہتی تھی۔ وہ اچھی ہاریش بزرگ ہیں، کافی باوقار سہی، چار بیٹے ہیں ان کے، چاروں شادی شدہ اور چاروں کی بیویاں انہی کے ساتھ رہتی ہیں۔

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئیں، چائے کے دوران وہ مجھ سے سسرال کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ میں نے آنسوؤں کے ساتھ ساری بات بتا دی۔ ساری بات سن کر وہ ہلکے سے مسکرا دیں اور میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

”ارے بیٹی! بس اتنی سی بات پر اتنا زیادہ پریشان؟“

”یہ چھوٹی بات ہے خالہ؟“
”تو اور کیا.....“ میں الجھ گئی۔

”دیکھ میں تجھے بتاتی ہوں۔“ وہ ہولے ہولے بولنے لگیں۔

”میں جس گھر میں بیاہ کر گئی تھی۔ وہاں آج نہ رہیں۔“

مکمل ترقی آرزوئیں

کھبراہٹ نمایاں تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی شرم اور گھبراہٹ کو محسوس کر رہا تھا۔ نمرہ ایک سمجھدار اور سکھڑاڑ کی تھی۔ اس نے ساری زندگی خود کو سینٹ سینٹ کر رکھا تھا۔ صرف ایک شخص کے لیے اپنے سارے جذبات و احساسات سنبھال کر رکھنے والی یہ لڑکی بہت حساس تھی۔ صرف اپنے شریک سفر سے عزت اور محبت کی طلب گار۔

”نہ آپ کے لیے!“ سامنے ایک سرخ مثل کی ڈبیہ رکھی گئی تھی۔

”آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔“ یہ دوسرا جملہ صرف اس کے لیے تھا مگر..... نمرہ سرخ ڈبیہ کو دیکھ رہی تھی اس انتظار میں کہ وہ اسے خود نکال کر پہنائے گا لیکن.....

”ماں جی لے کر آئیں تمہیں مجھے تو عورتوں کی خریداری نہیں کرنی آتی آپ کو پسند آئی۔“ ڈبیہ کھول کر پھر سامنے رکھ دی گئی۔ وہ محض سر ہلا گئی اس کی اس حرکت پر۔

”مجھے پتا تھا آپ کو پسند آئے گی۔“ وہ خوش ہو کر بولا تھا۔ نمرہ نے اسے دیکھا وہ اچھا لگ رہا تھا۔ فہد اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ نظریں جھکا گئی۔

”میری ماں جی اور عالیہ آپ کو بہت پیار اور چاہ سے اس گھر میں لے کر آئی ہیں، میں چاہتا ہوں آپ ان دونوں کا بہت خیال رکھیں۔ شکایت کا موقع نہ دیں۔ ماں جی بہت حساس ہیں، بابا ہمیں جلد چھوڑ

ابھی ابھی اس کی نندا سے کمرے میں چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ خوشی اور گھبراہٹ کی ملی جلی کیفیت میں تھی۔ نئے رشتے میں بندھ جانے کی خوشی اور نئی جگہ کے لیے گھبراہٹ صاف اس کے چہرے کو نکھار بخش رہی تھی۔ ہر آہٹ پردل کی دھڑکن تیز ہو جاتی پھر کسی کونہ پا کر خود ہی شرم کر مسکرا دیتی۔

”تم اب اپنے کمرے میں جاؤ دلہن انتظار کر رہی ہو گی۔“ رات کے دو بج رہے تھے جب ماں جی نے فہد کو کہا۔ وہ فوراً اٹھ گیا۔

”اور ہاں صبح جلدی اٹھ جانا دلہن کے گھر والے ناشتہ لے کر آرہے ہیں۔ میری تو ٹانگوں میں درد ہے۔ میں نہ اٹھ پائی جلدی تو دلہن برا نہ منائے۔ اسے ذرا بتا دینا اچھے سے میری طبیعت کے بارے میں، سمجھ گئے نا بیٹا؟“ وہ مسکرا کر بولتے ہوئے فہد کو بہت کچھ سمجھا گئیں تھیں۔

”جی! ماں جی بے فکر ہو کر سو جائیں آپ۔“ وہ کہتے ہی آگے بڑھا تھا کہ پھر سے کوئی بات یاد نہ آجائے ماں جی کو۔

آہٹ پر ذرا سا سراسراٹھا تھا پھر جھکا لیا گیا۔ دھڑکن تیز ہو گئی جیسے دل کانوں میں آگیا ہو۔ چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ جم گئی۔

”السلام علیکم، کیسی ہیں آپ؟“ خوب صورت مردانہ آواز نزدیک سے ابھری تھی۔ وہ سٹ گئی۔

”وعلیکم السلام۔“ نمرہ بس اتنا کہہ سکی آواز میں



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے دو آنسو منہ تیوں کی طرح گود میں رکھے ہاتھوں پر گرے تھے۔ فہد اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ مزید سر جھکا گئی۔

”آپ تھک گئیں ہوں گی آرام کر لیں۔ ادھر ڈرائنگ روم ہے چنچ کر لیں۔“ وہ ایک نظر اسے دیکھتا ہوا اٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔ وہ سلگ کر رہ گئی۔ اس کے خواب نئی زندگی کے پہلے مرحلے پر کرجی کرچی ہو گئے۔ وہ خود پسند نہ تھی کہ اپنی چند تعریفیں سن کر خوش ہو جاتی، نہ دولت کی ہوس، نہ خود غرض اور نہ ہی شوہر کو اپنی محبت میں کرنا چاہتی تھی، بلکہ وہ سب کا خیال رکھنے والی اور سمجھدار تھی۔ اسے فہد کی باتیں بری نہیں لگی تھیں بلکہ اس موقع پر کی گئی جیسے وہ بہت خاص سمجھا کرتی تھی۔ اس طرح کی باتیں کرنے کے لیے ساری زندگی بڑی تھی مگر یہ وقت یہ موقع بار بار نہیں آتا، جن باتوں کو سننے کا دل غنچا تھا وہ اب کہاں سے سنے گی؟ خواب دیکھا تھا جو خواب ہی رہ گیا۔ خوابوں کو تعبیریں نہیں ملتی اگر مل بھی جائیں تو بہت دیر سے۔ ہر بات کا ایک وقت اور موقع ہوتا ہے اگر بات اس کے اصل موقع پر کی جائے تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کیا تھا اگر وہ کچھ پیار بھری باتیں کر لیتا مگر تعریف بھی کی تو جیسے احسان، گفٹ بھی دیا تو جیسے احسان! اسے ذرا احساس نہ ہوا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ احساس ہی تو زندگی ہے اگر احساس مرجائے تو وہ زندگی بے رنگ ہو جاتی ہے۔ وہ جان گئی تھی۔ فہد ان مردوں میں سے ہے جو صرف عورت کا حق اور ضرورت پوری کرتے ہیں مگر پیار بھری بات کرنے یا سننے کو محض ایک بے وقوفی سمجھتے ہیں لیکن محبت بھی تو ضروری ہے یہ دنیا محبت ہی کی ایک سب سے بڑی نشانی ہے۔ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ چاہا جائے مگر..... وہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔

گئے پھر ماں جی نے مشکلیں کاٹ کر ہمیں پالا۔ میں ان کو بہت خوشی اور آرام دینا چاہتا ہوں۔ تم میرا ساتھ دو گی نا؟“ نمرہ اس کی باتیں سن کر حیرت میں فوراً سر ہلا گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کیا یہ باتیں سننے کے لیے وہ اب تک اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ وہ کچھ اور بھی بول رہا تھا مگر اس کی آواز اب وہی کسی کھائی سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

”تم میری ماں جی کو خوش رکھو گی تو میں تم سے مطمئن رہوں گا۔“ اس وہی آواز کے ساتھ ایک اور واضح آواز اسے سنائی دی۔

”میں آپ کو ساری زندگی خوش رکھوں گا۔“ کھائی سے آتی آواز اب بھی وہی تھی۔

”میں آپ کی تمام ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔“ یہ آواز بلاشبہ اس کے شریک سفر فہد کی تھی جو دوسری آواز سے بے حد وہمی تھی۔

”میں آپ کی ہر خواہش پوری کروں گا۔“ آواز واضح اور صاف تھی۔

”عالیہ جھوٹی ہے۔ حالات نے اسے کچھ تلخ کر دیا ہے مگر دل کی اچھی ہے تم اسے پیار سے سمجھاؤ گی تو وہ سمجھ جائے گی۔“ فہد کہہ رہا تھا۔ نمرہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

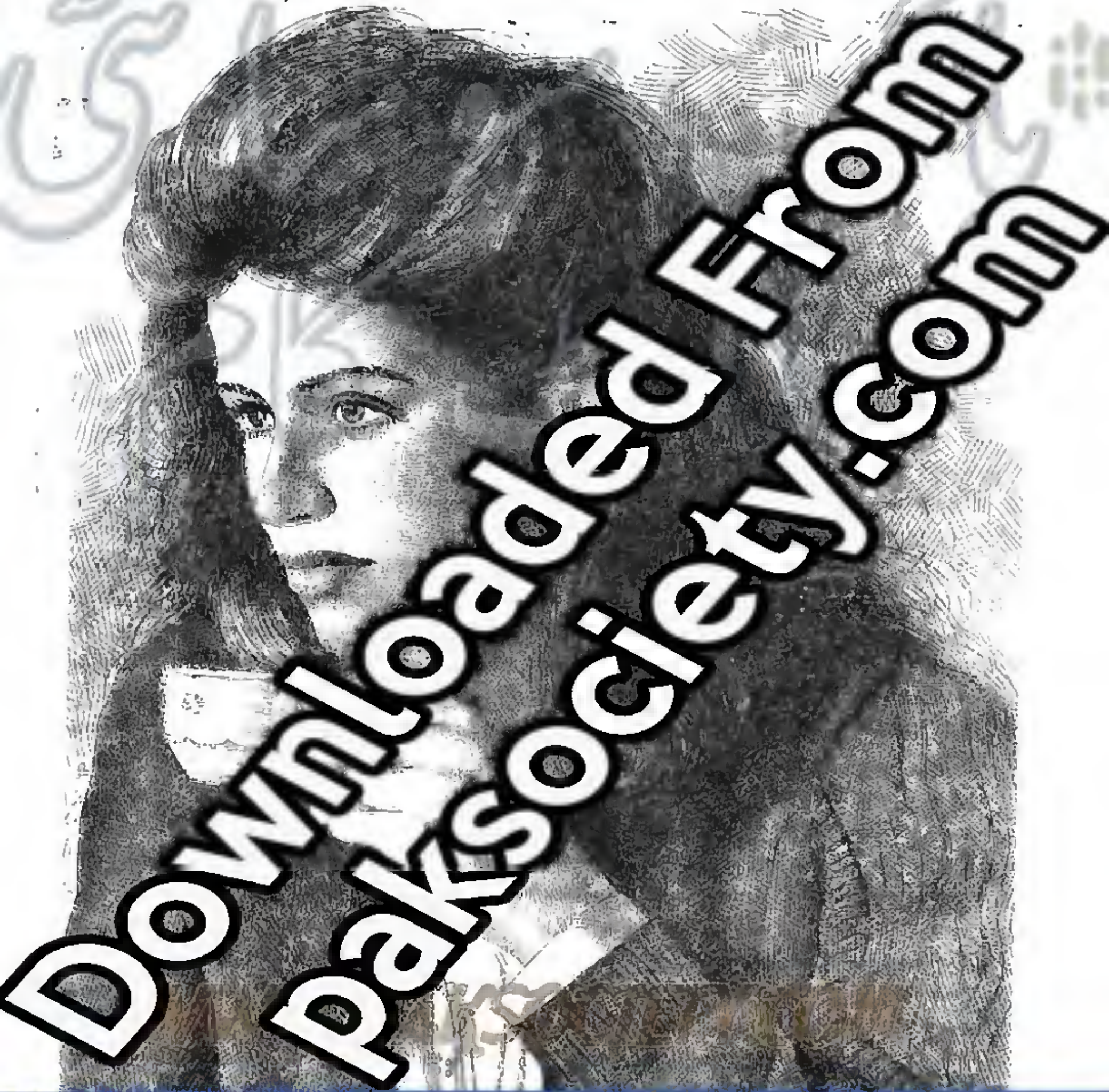
”میں آپ کو اتنا پیار دوں گا کہ آپ سارے غم بھول جائیں گی۔“ آواز کہیں دل سے آئی تھی۔ صاف واضح۔

”میں چاہتا ہوں آپ میری ماں جی کے مطابق خود کو ڈھال لیں۔ وہ آپ کو بہت پیار سے رکھیں گی۔“ آوازیں مسلسل اس کے کانوں میں شور برپا کر رہی تھیں۔

”اور آپ..... آپ کتنا پیار دیں گے مجھے؟ آپ نے تو پہلے مرحلے پر ہی مجھے میری اوقات سمجھا دی ہے۔ میں کس لیے لائی گئی ہوں یہاں؟“ دل سک اٹھا تھا۔ وہ محض سوچ کر رہ گئی۔ آنکھوں

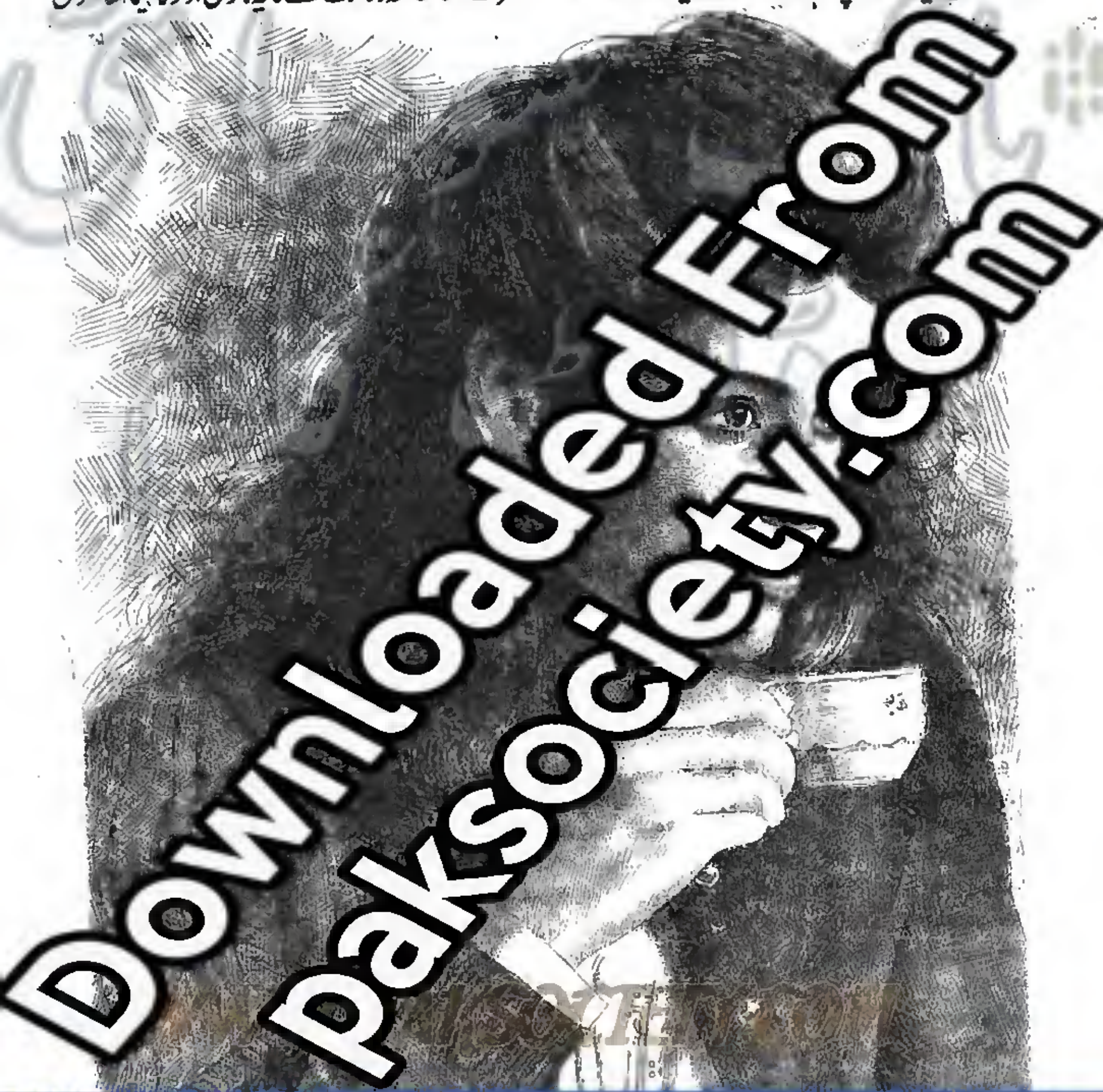
وطن کا فریضہ

”زندگی کیا ہوتی ہے؟ یہ کوئی کسی مرتے سکتے
انسان سے پوچھئے یہ زندگی جس پر ہم اتنا ناز کرتے ہیں
اپنے ابدی گھر کو بھول کر اس عارضی دنیا کی موج مستیوں
میں کھو جاتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ زندگی تو موت کی



بتاؤ کیا تم دولت سے ایک ماں کو اس کی زندگی کا واحد
سہارا ایک بیوہ کو اس کا سہاگ لونا سکتے ہو۔ رائے نے
اپنے سامنے بیٹھے گلریز سے غصے و تاسف سے پوچھا۔
گلریز کو اس کی دلی کیفیت کا اندازہ تھا وہ ایک مشہور نیوز
پیر میں نیوز رپورٹر اور بطور صحافی کے فرائض انجام دے
رہی تھی اور بہت حساس اور دردمند دل رکھتی تھی اس طرح
کی ہر خبر کی کورتج کے بعد اس کی یہی کیفیت ہوتی تھی اور
اپنے اندر کا سارا اہال وہ گلریز پر نکالتی تھی جو نہ صرف اس
کا فرسٹ کزن بلکہ اس کا عمکسار بھی تھا اس کا قصور
صرف اتنا تھا کہ وہ ملک کے مایہ نازل اور کا بیٹا تھا مگر تن

امانت ہے جو کسی بھی وقت ہم سے چھین لی جاتی ہے پھر
ہم اس زندگی جیسی ناقابل اعتبار شے پر کیوں بھروسہ
کرتے ہیں؟ میں نے گلریز خان! ایک ماں کو اپنے
جواں سالہ بیٹے کی لاش پر ماتم کرتے دیکھا ہے ایک نو
بیاتی دلہن کو اپنے بے گناہ سہاگ کی دردناک موت پر
اجڑتے دیکھا ہے ارے تمہیں کیا معلوم دکھ اور کرب کیا
چیز ہے؟ افلاس اور بھوک سے ہلکتے بچے جو کچروں کے
ڈھیر سے روٹی تلاش کرتے ہیں جواں کے لئے کسی منت
اقلیم سے کم نہیں ہوتی مگر تمہیں کیا پتہ تم جو دن رات
دولت میں کھیلتے ہو جو چاہے دولت سے خرید سکتے ہو مجھے



موصوف ناراض ہو گئے خیر کال کر کے سوری کر لیتی ہوں۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے لینڈ لائن نمبر پر کال ملائی اتفاق سے اس کی کال مای نے ریسو کی ان سے غلٹ میں سلام دعا ہوئی وہ اپنی این جی او کی کسی مینٹنگ میں شرکت کے لئے جا رہی تھیں۔

”ہونہہ..... یہ بڑے لوگوں کی سوکا لڈ مینٹنگز فارغ اوقات کا اچھا مصرف ہے۔“ رائے کے ذہن میں ایک بار پھر متنی سوچ نے سر ابھارا پھر اس نے سر جھٹکتے ہوئے گلریز سے بات کی۔

”تمہارا بیل مسلسل آف جا رہا ہے خیریت؟“
 ”ہاں بس ایسے ہی چارج ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتانا کہ اس کی باتوں سے آج دل اتنا افسردہ ہوا تھا کہ اس نے اپنا بیل ہی آف کر دیا۔“
 ”اچھا خیر وہ دراصل مجھے تم سے سوری کہنا تھا۔“
 دوسری طرف مہیب خاموشی تھی۔

”ہیلو گلریز! تم سن رہے ہونا.....؟“
 ”ہوں ہاں کہو میں سن رہا ہوں ویسے آج کہاں سے سورج نکل آیا بلکہ شام ڈھل چکی ہے تو یہ کہنا چاہئے کہ آج کدھر کا چاند نکلا کہ آنسہ رائے مجھے جیسے ناچیز سے معافی مانگ رہی ہیں۔“

”اچھا بس مزید شرمندہ کرنے کی ضرورت نہیں میں نے ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا ہاں تمہارے ساتھ ضرور زیادتی ہو گئی جس کے لئے سوری کہہ تو رہی ہوں۔“ گلریز کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔
 ”محترمہ سوری بھی ایسے رعب جما کر کر رہی ہو جیسے وہ میری ملکہ اور میں ان کا غلام ہوں۔“

گلریز کو اس سوچ پر ایک بار پھر ہنسی آ گئی ویسے وہ اس کے دل کی ملکہ تو کبھی ہوش سنبھالنے کے بعد رائے کی بدگمانی و بے رخی کے باوجود اس کے دل کے ایوان پر پوری تمکنت کے ساتھ رائے ہی براجمان تھی اسے بس مناسب وقت کا انتظار تھا جب رائے کا دل بھی اس کے لئے وہی محسوس کرتا جو وہ اس کے لئے کرتا تھا پھر ادھر

پراپورٹڈ پرائیڈ لباس کے باوجود اس کا من بہت ہی سادہ اور ہر قسم کی بناوٹ سے پاک تھا مگر رائے اس کا شمار بھی دوسرے بے فکرے اور لالباہی امیرزاروں میں کرتی تھی ابھی بھی گلریز نے اس کو موجودہ ذہنی کیفیت سے نکالنے کے لئے مذاقا کوئی بات کہی تھی ہمیشہ کی طرح رائے اس پر اپنا سارا غبار نکال چکی تھی جسے خاموشی سے گلریز خان سن رہا تھا وہ اس حساس کول می لڑکی کی ولی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا مگر آج آخری جملہ اسے کسی تازیانی کی طرح لگا تھا وہ اسے اتنا بے حس اور لاپرواہ سمجھتی تھی اسے آج پہلی مرتبہ دکھ و افسوس ہوا۔

”اوہ کم آن رائے! میں بھی ایک انسان ہوں جس کے سینے میں ایک نرم حساس دل موجود ہے تم مجھے ہمیشہ ایسے ہی ڈی گریڈ کرتی ہو اگر میں دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں تو بتاؤ اس میں میرا کیا تصور ملک میں جو یہ ٹارگٹ کلنگ اور دہشت گردی کے واقعات ہو رہے ہیں اس میں میں کہاں سے مجرم ٹھہرا مگر تمہیں یہ سمجھ نہیں آئے گی کیونکہ تم نے بدگمانی کی عینک پہن رکھی ہے جب یہ اترے گی تو تمہیں میرا خلوص اور بے لوث محبت کا جذبہ نظر آئے گا۔“ یہ کہہ کر گلریز وہاں سے اپنی گاڑی کی چابی اور والٹ اٹھا کر نکلا چلا گیا رائے اس کے ردیے پر حیران تھی ہمیشہ اس نے گلریز کو پرسکون اور مطمئن دیکھا تھا مگر آج.....

”خیر مجھے کیا؟ سچ اور حقیقت کے آئینے میں ہر کسی کو اپنا اصل چہرہ دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی اور آج تم نے بھی یہ ثابت کر دیا ہونہہ.....“ یہ سب سوچتے وہ اپنے جلتے بجھتے دماغ کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے شاور لینے چلی گئی شام میں جب وہ سو کر اٹھی تو از سر نو دوپہر کی تمام گفتگو یاد کرنے پر اسے تھوڑی سی شرمندگی ہوئی شاید یہ گلریز کے رد عمل کا نتیجہ تھا ورنہ رائے کو اس سے پہلے کبھی گلریز کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

”اوہ! میں کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی جب ہی آج

ادھر کی چند باتوں کے بعد راتمہ نے فون بند کر دیا اب وہ اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی اتنے میں اس کی چھوٹی بہن نامہ اسے کھانے کے لئے بلائے آگئی اسے یاد آیا کہ دوپہر میں بھی اس نے آج کی نیوز کی ٹینشن کی وجہ سے کچھ نہیں کھایا تھا، دسترخوان پر بابا اور ماما اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”اوہ آگیا ہمارا شیر پتر! اور کیسے جا رہی ہے تمہاری جا ب؟“ بابا نے پیار سے پوچھا۔

”ہوں! اے دن بابا! مگر بے گناہوں کے بے موت مرنے پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔“ اس نے دکھ سے جواب دیا۔

”ہاں بیٹے دل تو ہمارا بھی دکھتا ہے بس اللہ پاک ہمارے وطن کے لوگوں پر رحم کرے اور اسے دشمن کی بد نظری سے بچائے۔“ راتمہ کے ساتھ نامہ اور ماما نے بھی آمین کہا۔

”ویسے راتمہ بیٹے آگے کا کیا ارادہ ہے؟“ ماما کے استفسار پر اس نے بریانی کی طرف بڑھتا ہاتھ روک کرنا بھیجی سے ان کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب شادی ہے اب تو تمہاری تعلیم بھی مکمل ہو گئی ہے اپنی خواہش کے مطابق جا ب بھی کر لی اب ہم بھی اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔“

”اوہو ماما! اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ ابھی تو میرے کیریئر کا آغاز ہوا ہے بابا آپ ہی ماما کو سمجھائیں نا۔“ راتمہ نے ماما کے تئو روٹکھتے ہوئے بابا سے مدد مانگی۔

”ارے ٹھیک ہی تو کہتی ہے ہماری بیٹی ابھی سال دو سال رہنے دو۔“ بابا نے ہمیشہ کی طرح اس کی سائیڈ لی جس پر ماما کا پارہ ہانی ہو گیا۔

”کیا.....؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شیخ صاحب خاندان کی اس کی ہم عمر تمام لڑکیاں بیانی جا چکی ہیں کیا ان سب نے تعلیم حاصل نہیں کی مگر آپ کے بے جالاؤ پیار نے ہی اسے شتر بے مہار بنا دیا ہے اس کے ہاتھ پیلے ہوں تو چھوٹی والی کے لئے بھی سوچوں وہ بھی اس

کیا تھا؟“ نامہ جو مزے سے کباب کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے راتمہ کی شادی کی بابت گفتگوں رہی تھی اپنا نام لینے پر بدگ گئی۔

”کیا، کیا اٹ از ناٹ فیئر ماما! بھلا یہاں میری شادی کا کیا ذکر پہلے آپ کی شادی ہوگی ویسے آپ سوچو شادی والے دن بھی تم گلے میں کیمرہ اور ہاتھ میں مائیک لئے ہوئے اپنی شادی کی نیوز سناتے کیسے لگو گی؟“ نامہ نے تصور کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے کہا سب اس کی بات پر مسکرانے لگے۔ راتمہ نے اس کو ایک دھپ لگائی۔

”اف اوہ آپ کی تم نیوز رپورٹر کم جلاؤ زیادہ لگتی ہو قسم سے اتنی زور کا مارا ہے۔“

”چلو جا کر اپنی اسٹڈی مکمل کرو فائنل پیپرز ہونے والے ہیں۔“

”اوہ اوہ تم بھی ناں خیر تیاری تو مجھے واقعی ٹیسٹ کی کرنی ہے لہذا سب کو شب بخیر۔“ یہ کہہ کر نامہ نے اپنے اور راتمہ کے مشترکہ کمرے کی طرف رخ کیا، شیخ صاحب ایک پرائیویٹ بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ساری زندگی ایمانداری کے اصول کے تحت گزاری، یہی درس اپنی دونوں بیٹیوں کو بھی دیا، ان کی شریک حیات بھی ان کی طرح صابر و تابع تھی جبکہ راتمہ کا خیال کافی امیر تھا، خاص طور پر اس کے ماموں جمشید صاحب کا شمار شہر کے مل اوزر میں ہوتا تھا، اپنی مغرورانہ طبیعت کی وجہ سے وہ انہیں کچھ خاص پسند نہیں تھے جبکہ ان کا اکلوتا سپوت گلزار خان ان کے برعکس تھا مگر جمشید صاحب کے رویے کی وجہ سے بعض اوقات وہ اس کے ساتھ زیادتی کر جاتی تھی، مگر راتمہ نے اس سال CSS کا امتحان پاس کیا تھا، فی الحال وہ اپنے والد کا بزنس سنبھال رہا تھا۔

☆☆☆☆

اس وقت بھی وہ نیوز سننے کے ساتھ ساتھ کسی اہم نیوز کی فائنل رپورٹ تیار کر رہی تھی جو صبح اسے پریس کے حوالے کرنا تھا، اسی وقت گلزار خان کی انٹری ہوئی۔

رواۃ المجتہد [181] دسمبر 2016ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

RSPK.PAKSOCIETY.COM

”ہیلو تک جڑی کزن! کیا ہو رہا ہے۔“ اسے گلریز کی بے وقت مداخلت اور طرز مخاطب پر غصہ آیا۔
 ”وہ نیک سلام! شاید مسلمانوں پر سلام کرنا فرض ہے اور تمہاری آنکھیں صحیح سلامت ہیں تو نظر آ رہی رہا ہوگا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔“ نائمہ جو پاس ہی بیٹھی موبائل میں کوئی گیم کھیل رہی تھی گلریز کی درگت بنتے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

”ارے ارے محترمہ ابھی کل ہی آپ نے مجھ سے سوری کی ہے اور آج پھر مجھے چبا رہی ہو ویسے یار نائمہ تمہاری آپلی کو کھانے میں صرف مرچیں ہی کیوں پسند ہیں۔“ اب اس کا رخ نائمہ کی طرف تھا۔

”بس کیا کریں گلریز بھائی آپ کا تو کبھی کبھی واسطہ پڑتا ہے مجھ غریب کو دیکھیں ہر روز ان کے عتاب کا نشانہ بنتی ہوں۔“ نائمہ نے معصومیت سے آنکھیں پٹیٹائیں اب تو رائمہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا مگر اس سے پہلے رائمہ کوئی کرارہ سا جواب دیتی وہ چائے بنانے کے بہانے باہر جانے کے لئے پرتو لے لگی۔

”چائے رہنے دو نائمہ آج میں تم دونوں کو آنسکریم کھلانے لے کر جا رہا ہوں۔“

”اوہ واؤ! یہ ہوئی نا بات میں ماما کو بتا کر آتی ہوں۔“ نائمہ نے خوشی سے باہر کا رخ کیا۔

”اور محترمہ آپ بھی ذرا اپنا حلیہ درست کر لیں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ گلریز خان کی کزن اور اتنی ڈل اور آدم بیزار۔“ اس نے رائمہ کی من موٹی مگر کچھ کچھ روکھی صورت پر پیار بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا اس وقت بلوٹراؤزر کے ساتھ پنک کرتی میں بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنائے اپنے کام میں منہمک اس رف حلقے میں بھی وہ سیدھا دل میں اتر رہی تھی۔

”میں کہیں نہیں جا رہی مسٹر گلریز خان! مجھے یہ رپورٹ آج ہی مکمل کرنی ہے آپ کی طرح میں فارغ نہیں ہوں کہ جب چاہا اپنے پاپا کا آفس چھوڑ کر ادھر ادھر موج مستی کرنے چل پڑے مجھے میرا

کیرئیر زیادہ عزیز ہے آپ نائمہ کو لے جائیں۔“ گلریز کے دلی جذبات سے بے خبر وہ ایک بار پھر اس کا دل توڑ گئی تھی گلریز نے تاسف سے اسے دیکھا وہ ہمیشہ اس کے دل کے ساتھ ایسا ہی کرتی تھی مگر دل کسی ضدی بچے کی طرح ہر بار اس کی بے رخی و بے اعتنائی پر اس کی طرف لپکتا تھا پھر موڑ نہ ہونے کے باوجود وہ صرف نائمہ کی خاطر اسے آنسکریم کھلانے یا رزلے گیا نائمہ اسے چھوٹی بہنوں کی طرح عزیز تھی زندگی کی گاڑی غم اور خوشی کے پیہے کے ساتھ آگے کی طرف رواں دواں تھی کہ ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے رائمہ کی زندگی اور سوچ کا انداز ہی بدل کر رکھ دیا۔

☆☆☆☆

کافی دنوں سے گلریز نہیں آیا تھا ماما کئی بار اس کا پوچھ چکی تھیں خود اتنی بے رخی کے باوجود رائمہ کو اس کی عادت سی ہو گئی تھی اب ایک ہفتے کی غیر حاضری اسے بھی کھل رہی تھی اس نے کچھ سوچتے ہوئے گلریز کو کال کی۔
 ”خیریت اتنے دنوں سے تم آئے نہیں ماما بھی پوچھ رہی تھیں۔“

”اوہ! تو پھپھو کے پوچھنے پر فون کیا ہے میں بھی کہوں کہ تمہیں میری پرواہ کب سے ہونے لگی؟“ آج گلریز کا لہجہ کچھ بجھا بجھا سا تھا وہ شوخی و زعہ دلی جو اس کی ذات کا حصہ تھی آج اس کے لہجے میں مفقود تھی۔
 ”گلریز آریو او کے تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔“
 گلریز کا دل اس کی اتنی توجہ پر ہی کھل اٹھا۔

”ہاں سب خیریت ہے اصل میں میں نے آرمی جوائن کر لی ہے کوشش تو کافی عرصے سے کر رہا تھا آج کل ٹریننگ کے سلسلے میں کا کول آیا ہوا ہوں کبھی اتنی دورا کیلے رہا نہیں تو سب کو بہت مس کر رہا ہوں خاص طور پر تمہیں۔“ آخری بات اس نے اپنے دل میں کہی۔

”ارے..... اتنی بڑی بریکنگ نیوز تم مجھے ایسے ہی سنار ہے ہو واہ کزن تم تو چھپے رستم نکلے میں ابھی ماما بابا کو بتاتی ہوں اللہ پاک تمہیں کامیاب کرے گلریز۔“

”اس مٹی کا ہم پر بہت قرض ہے مجھے بہت خوشی ہوئی تم نے آرمی جوائن کر کے اس مٹی کا حق ادا کر دیا ہے آئی ایم ریٹلی پراؤڈ آف یو۔“ رائے کی پر جوش آواز گلریز کے کانوں میں برس گھول رہی تھی اسے رائے کی آرمی سے دلی وجہ بانی والی تسلی کا اندازہ تھا۔

”ہوں..... مجھے خود بھی یہ فیئلہ پسند تھی تم کیا سمجھتی ہو؟“ صرف تمہارے پاس ہی حساس دل ہے کیا تمہیں ہی اپنے وطن کے لوگوں سے محبت ہے کیا میرا دل اپنے ملک کی بد حالی و بد امنی پر نہیں کڑھتا؟ مگر تم نے ہمیشہ میرے اخلاص کا مذاق اڑایا۔“ گلریز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”گلریز! میں تم سے اپنے پچھلے رویے کی معافی مانگتی ہوں بس ملک کے حالات اور ہمارے ملک کے بڑے بڑے دولت مند سنگدلی کی وجہ سے میری سوچ متنی ہو گئی تھی مگر اب میرا دل بالکل صاف ہے۔“ رائے نے شرمندگی و ندامت کے ملے جلے جذبات سے کہا گلریز نے اسے مزید شرمندہ کرنا بہتر نہیں سمجھا اس کے لئے یہی کافی تھا کہ اب اس کا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا تھا۔

”ایک بات پوچھوں رائے! ناراض تو نہیں ہوگی؟“ گلریز نے گھمبیر مگر سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ”ارے اب تم مجھے مزید شرمندہ مت کرو کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“ تھوڑی دیر دونوں کے درمیان ایک نامعلوم خاموشی چھائی رہی پھر گلریز کی جذبات سے بوجھل آواز زیرِ پس کے اس پار رائے کو گنگ کر گئی۔ ”آئی لو یو رائے! میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے صرف تمہارا خواب دیکھا ہے یونو زندگی کی اس شاہراہ پر چلو گی میرے ہمقدم۔“ رائے اس کی بات پر ہنوز خاموش تھی۔

”کچھ تو بولو رائے! کیا ناراض ہو گئیں؟ کوئی تو امید کا جگنو تھا جس کی آس میں میں اس دیا ر غیر میں اپنا وقت بیتا سکوں۔“

”گلریز! کزن کی حیثیت سے تم مجھے ہمیشہ پسند تھے تمہاری اچھی عادات اور اخلاق سے انکار نہیں کیا جاسکتا بس ماموں کے رویے کی وجہ سے میں تم سے بھی بدگمان ہو گئی تھی مگر اب تمہاری اچھی سوچ اور حب الوطنی کے جذبے نے میرا دل جیت لیا ہے میں تم سے وعدہ کرتی ہوں آج سے رائے کی ہر سانس تمہاری امانت ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ”اوہو سو میٹ ہارٹ! آج تو گلریز کو تم نے مالا مال کر دیا! اف جلدی سے ٹریننگ مکمل ہو تو گھر جا کر ماما سے اپنی شادی کی بات کرتا ہوں بابا کو تھوڑا اعتراض تو ہو گا مگر رائے ان کا خون ان کی سگی بھانجی ہے میری خوشی کے لئے وہ بھی مان جائیں گے۔“ یہی سب سوچتے وہ نیند کی وادی میں چلا گیا۔

☆☆☆☆

”اف..... میں گلریز کو کتنا غلط سمجھتی تھی مگر وہ تو ماموں سے بالکل مختلف نکلا میری ہر زیادتی و بد تمیزی کے باوجود بھی مجھے چاہتا رہا کیا میں اتنی خوش نصیب ہوں کہ کوئی مجھے اتنی شدت سے چاہے اور اب اس نے آرمی جوائن کر لی بے شک یہ اس کی خواہش تھی مگر وہ جانتا تھا کہ مجھے آرمی پسند ہے تو اس نے میرے خواب کی تعبیر دی اے اللہ پاک مجھے معاف کر دینا اور اس اچھے انسان کی حفاظت کرنا جس نے وطن کی حرمت و حفاظت کی خاطر اپنے تن پر محافظ کا لباس زیب تن کیا ہے آمین۔“ جب اس نے ماما بابا اور رائے کو یہ خبر سنائی تو وہ سب بھی بہت خوش ہوئے اور اس کی کامیابی کے لئے دعا گو تھے رائے نے تو اس وقت فون کر کے ٹریٹ کا پکا وعدہ لیا چھ ماہ بعد گلریز کی ٹریننگ مکمل ہو گئی تھی اسے دو ماہ کی چھٹی مل گئی تھی اس کے بعد جونیئر کیپٹن کے طور پر پشاور میں اسے باقاعدہ جوائن کرنا تھا۔

☆☆☆☆

”دیکھنا رانی گیٹ پر کون ہے؟“ سز جمشید جوتی دی دیکھ رہی تھیں وہیں سے آواز دی کچھ لمحے بعد

ایکدم ان کی آنکھوں پر کسی نے ہاتھ رکھا تو وہ چونکیں۔
 ”گلریز..... او مائی سن..... تم واپس آ گئے اللہ
 میرے بیٹے کو نظر بد سے بچائے آری کے یونین فارم میں
 کتنے ہینڈ سم لگ رہے ہو۔“ مسز جمشید نے اس کے ماتھے
 پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

”اوہ تو ماما! آپ کو ہمیشہ ہی میری آمد کا پتہ چل
 جاتا ہے آج بھی میرا سر پرانز خراب کر دیا۔“ گلریز
 نے بچوں کی طرح منہ بسورتے ہوئے کہا مسز جمشید
 مسکراتے لگیں۔

”ماؤں کو اپنے بچوں کے وجود کی خوشبوان کا لمس
 محسوس ہو جاتا ہے۔“

”اچھا مائی سویٹ مام! بابا کہاں ہیں؟“
 ”ہوں گے اپنی کسی مینٹنگ میں بڑی انہیں تو
 تمہارے آری جوائن کرنے پر اعتراض تھا ابھی بھی
 کچھ کچھ ناراض ہیں۔“

”ارے چوڑی ماما! میں منالوں گا ان کو میں نے
 بزنس جوائن تو کیا تھا مگر میرا کوئی انٹرسٹ ہی نہیں تھا
 راتوں رات بیورو کریٹ بننے میں اچھا چلیں آپ یہ
 بتائیں کہ کھانے میں کیا بنا ہے بڑی زوروں کی بھوک
 لگ رہی ہے وہاں میں کا کھانا کھا کر آپ کے
 ہاتھ کاذا لقمہ یاد آنے لگا ہے۔“

”نوٹی بوائے آری جوائن کر لی مگر شہادت کرنے
 کی عادت نہیں گئی بس میں ابھی کھانا لگائی ہوں جب
 تک تم ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ پھر مسز جمشید کھانا
 لگوانے چلی گئیں اور یہ سوچ کر مسکراتے لگا کہ جب وہ
 رائے کے پاس جائے گا تو وہ اسے آری کے یونین فارم
 میں دیکھ کر کیسا محسوس کرے گی۔“ ان چھ ماہ میں رائے
 کے دل میں بھی اس کے لئے محبت کی کوئیل پھوٹ پڑی
 تھی اور ان کی فون اور اسکا پ پر بات ہوتی تھی آخر کار
 رائے کو اس کے خلوص اور سچے جذباتوں پر یقین آ گیا تھا
 اب زندگی کے سفر میں وہ اس کے ہم قدم ہونا چاہتی تھی
 اسے وہ دن یاد آ گیا جب رائے نے اس سے فون پر

بات کرتے ہوئے انوکھی فرمائش کر دی۔
 ”گلریز خان! باتیں تو بڑی بڑی کرنی آتی ہیں
 کیا تم ابھی اتنی سخت سردی میں میرے کہنے پر ٹھنڈا
 پانی کا جگ اٹل کر پوری رات میں کے ٹھنڈے
 فرش پر کھڑے رہ سکتے ہو۔“ تو اس کی بات پر گلریز نے
 اعتماد سے کہا تھا۔

”ارے ماما! یہ تو کچھ بھی نہیں ہم آری کے لوگ
 تو اس سے بھی زیادہ سخت جان ہوتے ہیں۔“

”او کے بائے! پھر میں تو سونے جا رہی ہوں تم
 پوری رات کھڑے رہو اگر بچ جاؤ تو صبح مجھے اپنی خیریت
 کی اطلاع دے دینا۔“ اور اس نے واقعی ایسا ہی کیا تھا
 پورا ٹھنڈا پانی کا جگ اٹل کر اپنے روم کے سامنے
 کھڑا تھا اس پر جنون سوار تھا کہ اس نے رائے کو اس بات
 کا یقین دلانا ہے کہ وہ اس کی محبت میں سب کچھ کر سکتا
 ہے مگر بھلا ہو لیبر راشد کا جو اس طرف آنکھ اور
 انہوں نے جو اس کی حالت دیکھی تو حیران ہوئے بناء
 رہ سکے انہیں اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا ٹھنڈے پانی
 سے بھیگتا کھپکھپاتا وجود اپنے کمرے کے باہر کھلے آسمان
 کے نیچے کھڑا آنکھیں بند کئے جس کے ہونٹ ہر دی کی
 زیادتی سے نیلے پڑ گئے تھے مگر جیسے اس کو پروا نہ تھی اور
 ان کے سختی سے پوچھنے پر جب اس نے اپنی حماقت کا
 اعتراف کیا تو انہوں نے اس کی میس کے کھلے ٹھنڈے
 فرش پر بیک رول اپ کی جو مشق کروائی اس نے گلریز
 کے چودہ طبق روشن کر دیئے اس سے بھی زیادہ شرمندگی
 اس وقت ہوئی جب اس کے تمام ساتھی اپنے اپنے روم
 کی کھڑکی سے اس کی درگت بننے دیکھ رہے تھے بیچنا صبح
 وہ بخارا اور فلو میں مبتلا تھا اس نے رائے کو سوسوں کرتے
 سرخ ناک و چہرے کے ساتھ ساری بات بتائی تو اس کا
 ہنس نہس کر برا حال ہو گیا۔

”ہاؤ فنی گلریز خان! مستقبل کے جونیئر کیپٹن اور
 یہ حماقت ہائے کاش میں وہاں ہوتی تو تمہاری
 Pics لے کر زبردستی ہی نیوز بناتی فیس بک پر اپ

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

دلی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے اسے ازلی اعتماد سے جواب دیا۔

”بس ڈیز سر پرانز دینا چاہتا تھا ایسا نہ کرتا تو تمہارے چہرے پر کھلے محبت کے قوس قزح کے رنگ کیسے دیکھ سکتا تھا؟“ گلریز نے جذبات سے مغلوب لہجے میں جواب دیا۔

”رائہ کا دل یکبارگی دھڑکا کبخت یہ دل بھی آج بغاوت پر اتر آیا ہے“ رائہ نے سوچا۔

”ہونہہ..... خوش فہمی ہے جناب مابدلت کے رو برد بھی ملک کی عظیم اور مایہ ناز نیوز رپورٹر کھڑی ہیں جن کے پاس فضول باتوں کے لئے ٹائم نہیں۔“ رائہ نے فرضی کالر کھڑے کرتے ہوئے دوبارہ جواب دیا۔

”ہاہا چلو خوش فہمی ہی سہی مگر مادام! اتنا تو یقین ہے کہ اب آپ کو بھی ہماری کمی محسوس ہوتی ہے آپ کے دل کی دھڑکن اب صرف ہمارے نام کی مالا جیسی ہے کچھ دیر پہلے آپ کے چہرے کے رنگوں نے سب کچھ عیاں کر دیا ہے۔“ گلریز نے اسے چھیڑتے ہوئے اس کی ناک دبائی گلابی وسیاہ کڑھائی سے حیرن شلوار کرتے میں بالوں کی ڈھیل سی چوٹی باندھے وہ اسے عام دنوں سے ہٹ کر لگی رائہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے لئے اس کی طرف دیکھا مگر لہجے کے برعکس اس کی آنکھوں میں موجزن اپنے لئے محبت کے خوبصورت رنگ اور چمک دیکھ کر وہ نظریں جھکا گئی گلریز اس کی اس ادا پر مسکرا کر رہ گیا یہ احساس ہی خوش کن تھا جسے دل میں بسانے کی شدید خواہش تھی آج وہ بھی اس سے آشنا تھی اس دقت نامہ شور مچاتے ہوئے آئی جس سے ماحول میں موجود گھمبیر خاموشی میں ارتعاش پیدا ہوا۔

”گلریز بھائی! جوئیر کیپٹن صاحب آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے ناں؟ قسم سے آج تو ماما نے کھڑے مسور کی دال بنائی سے چلیں فائٹ ہمیں ٹریٹ دینے میکڈونلڈ لے کر چلیں میں نے ماما کو بتا دیا ہے۔“ رائہ نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

لوٹ کرتی ہاہا۔“

”نہں لو طالم حسینہ تم تو ہو ہی کھور تمہیں کیا معلوم ایک دیوانے کی محبت بھرے دل کا حال۔“ پھر اس نے ناراض ہو کر فون بند کر دیا مگر خود بھی ہنسنے لگا اسی وقت رائہ کا فکر مندی سے بھر پور ٹیکسٹ آ گیا تھا جس میں اسے میڈیسن لینے اور دوبارہ اس طرح کی حماقت سے باز رہنے کی نصیحت کی گئی تھی ابھی بھی وہ لمحات یاد کر کے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

☆☆☆☆

”ارے آئی بابا لگتا ہے دروازے پر کسی فوجی اہلکار نے دھاوا بول دیا ہے۔“ رائہ نے مسلسل دروازے پر دی جانے والی دستک پر غصے سے بڑبڑاتے ہوئے کہا دروازہ کھولتے ہی خوشی سے اس کی چیخ نکل گئی دروازے پر واقعی گلریز خان فوجی یونیفارم اور سر پر کیپ لگائے مسکراتے چہرے کے ساتھ جلوہ گر تھا۔

”اوہو گلریز بھائی! اف کتنے ڈشنگ لگ رہے ہیں! ماما بابا دیکھیں ہمارے گھر واقعی ایک فوجی آیا ہے۔“ پھر ماما بابا بھی گلریز سے مل کر بہت خوش ہوئے پھپھونے تو باقاعدہ اس کی نظر اتاری شور کی آواز پر اپنے کمرے سے آتی رائہ بھی اسے دیکھ کر چونک گئی آری کے فل یونیفارم میں اپنی پوری وجاہت کے ساتھ رائہ سے گپ شب لگاتے وہ اس کے دل کی دھڑکن کو ایک انوکھے جذبے سے روشناس کرا گیا تھا۔ اسے گلریز خان کی محبت پر فخر محسوس ہوا گلریز اسے دیکھ چکا تھا فوراً اس کے پاس آیا۔

”ہیلو گزن! کیا ہوا؟ لگتا ہے لوگ ہمارے حسن و وجاہت کی تاب نہ لا کر جان سے گئے کیوں بھی ٹھیک کہا ناں؟“ گلریز نے اپنا کیپ رائہ کو پہناتے ہوئے کہا۔

”کیا جی نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں بس یوں اچانک سامنے دیکھ کر چونکنا تو فطری بات ہے تم نے اپنے آنے کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔“ رائہ نے اپنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

”ادھو اتنی امیر جنسی بھی کیا ہے 20 دن بعد بھی تو جواننگ ہو سکتی ہے؟“ رائے نے کچھ اداسی سے کہا۔
 ”کم آن رائے! یہ تم جیسی حب الوطن فرض شناس لڑکی کہہ رہی ہے؟ یا تم تو بہت بہادر اور پریکٹیکل اپروچ رکھتی ہو تمہیں دیکھ کر ہی تو میرے اندر حوصلہ اور آگے بڑھنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اگر تم اس طرح جذباتی ہوگی تو کیسے میں اپنا فرض نبھاسکوں گا؟ جو مجھے پکار رہا ہے۔“ گلریز جو خود بھی اس کی جدائی پر افسردہ تھا مگر اپنے جذبات پر قابو پا رہے ہوئے اسے سمجھانے لگا۔

”ہوں..... بس ایسے ہی دل بھر آیا ابھی تو دل نے تمہاری سنگت کی چاہ کی تھی ابھی تو آنکھوں نے تمہاری ہمارے ہی میں ساتھ چلنے کے خواب دیکھے تھے اور اتنی جلدی جدائی کی بات گلریز خان میں اعتراف کرتی ہوں کہ تم نے میرے دل کو اپنی بے لوث محبت سے اسیر کر لیا ہے اپنا خیال رکھنا گلریز ہم ہر قدم پر مجھے اپنا مقدمہ پاؤ گے اینڈ آئی لو یو آ لوٹ۔“ اللہ حافظ یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔
 گلریز اس کی اتنی چاہت و محبت پر خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگا پھر اگلا دن گلریز کا بہت مصروف گزرا مگر جانے سے پہلے اس کے گھر اور زندگی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی مامی اور ماموں باقاعدہ اس کا رشتہ لے کر آئے تھے مامی کے پر شفیق انداز پر وہ اپنی پچھلی سوچ پر شرمندہ تھی ابھی پچھلے مہینے اس نے ایک مشہور اور واقعی انسانیت کی خدمت کے لئے کوشاں ایک مشہور ویمن ویلفیئر انسٹی ٹیوٹ کے حوالے سے نیوز کی کوریج کی تھی جہاں اس کی ملاقات اس آرگنائزیشن کی پریزیڈنٹ سے ہوئی جو کوئی اور نہیں بلکہ گلریز کی والدہ یعنی مسز جمشید تھیں جہاں وہ دور دراز کے پسماندہ علاقوں کی ہنرمند عورتوں کے بنائے ہوئے ڈسٹرکٹ سوسائٹی کے والی آمدنی ان میں محبت و خلوص سے تقسیم کر رہی تھیں اور ان کے محنت اور ہنر کی تعریف کر کے ان کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں ساتھ ساتھ وہ نادار اور غریب عورتوں کے مسائل بھی سن رہی تھیں رائے کو یہ سب دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی مامی نے بھی اس کو

”ارے ارے لڑکی تھوڑا دم تو لو کس یاد ہے گڑیا! اسی لئے میں آیا ہوں چلو فافٹ تم دونوں باہر آؤ میں گاڑی میں دیٹ کر رہا ہوں۔“ پھر اس دن انہوں نے ایک دوسرے کی سنگت میں خوب انجوائے کیا واپسی پر اس نے رائے کے منع کرنے کے باوجود رائے اور رائے کو مشہور بوتیک سے خوبصورت ڈریسز دلوائے۔
 ”ادھو رائے! اب میں چلتا ہوں انشاء اللہ اب کل ملاقات ہوگی اپنا خیال رکھنا میرے لئے۔“ اس نے محبت سے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔ رائے اس کی اتنی محبت و چاہت کی بارش میں خود کو بھیگتا محسوس کرنے لگی۔
 ”یا اللہ! ایسے اچھے اور شتاپا محبت میں ڈوبے انسان کے سارے خواب پورے کرنا وطن عزیز کے لئے جو اس کا دل محبت سے سرشار ہے اور میرے لئے اس کی زندگی میں جو خوبصورت رنگ ہیں ان کو اسی طرح آباد رکھنا آمین۔“

☆☆☆☆

”ہیلو رائے! کیسی ہو؟“ گلریز نے خوشی سے بھرپور آواز میں پوچھا۔
 ”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں پھر آج تم گھر پہ آرہے ہو نا؟“ ماما بھی تمہارا پوچھ رہی تھیں ایک ہفتے سے تم نے چکر ہی نہیں لگایا۔“
 ”ادھو ملک کی مایہ ناز معروف ترین رپورٹر نے ہماری کمی محسوس کی زبردست کاش میں ابھی آسکتا۔“ گلریز نے ہمیشہ کی طرح اسے چھیڑا۔
 ”کیا مطلب کیا تم نہیں آرہے.....؟“ رائے نے کچھ مضطرب ہوتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے تم کو یہی بتانا تھا کہ میری پوسٹنگ میں ابھی 20 دن باقی تھے مگر کچھ وجوہات کی بناء پر مجھے ایک ہفتے بعد ہی پشاور میں اپنی ڈیوٹی جوائن کرنی ہے اسی سلسلے میں آج مجھے ہیڈ کوارٹر میں اطلاع دی گئی ہے انشاء اللہ جانے سے پہلے میں ضرور آؤں گا تمہارے لئے ایک سرپرائز بھی ہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

روزانہ اجلاس 186 دسمبر 2016ء

کتنے عجیب جوتے ہیں ہر کام میں ارجنٹ اور ایمر جنسی نافذ کرنے کی عادت اب بتاؤ صرف ایک دن کے شارٹ نوٹس پر بھلا کیا شاپنگ ہو سکتی ہے میرے پاس تو کوئی ڈھنگ کا جوڑا بھی نہیں ارے ہاں یاد آیا مجھے ماما کے ساتھ ابھی شاپنگ کے لئے جانا ہے اف ڈریسز جیولری ابھی بہت کچھ خریدنا ہے سو ہم تو چلے ارے آپ اس طرح بت بنی رہیں گی کیا؟" نامہ نے اپنی کہہ کر اس کی طرف توجہ دی جو یہ نیوز سن کر شا کڈ رہ گئی تھی۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو نامہ! مگر اتنی جلدی یہ سب؟" "بھئی مجھے تو ان باتوں کا نہیں پتہ بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ کل میری پیاری آپنی لہن بنیں گی ان کے ہاتھوں میں گلریز بھائی کے نام کی مہندی لگے گی سچ آپنی مجھے اس دن کاشتت سے انتظار تھا باقی ارمان میں آپ کی رخصتی پر نکالوں گی چلیں اب آپ بھی یہ صفائی کا کام نمشا کر عالیہ باجی کو فون کر دیں وہ آپ کو آکر مہندی لگا دیں گی اور کل آپ کو تیار بھی وہی کریں گی ماما ان سے بات کر چکی ہیں۔" نامہ نے اس کی بیسٹ فرینڈ کا نام لیا جو بیوٹیشن بھی تھی نامہ جواب اس شا کڈ سے باہر آ چکی تھی اور اپنے دل میں سرشاری کے جذبات محسوس کر رہی تھی پھر نامہ تو چلی گئی اور اس نے جلدی جلدی عالیہ کو کال ملائی اب صفائی میں کہاں دل لگنا تھا گلریز کے ساتھ کا سوچ کر ہی اسے حیا کے ساتھ ساتھ خوشی بھی محسوس ہو رہی تھی پھر اگلے دن نکاح کے خوبصورت بندھن میں بندھ کر کچھ وعدہ وعید کے ساتھ پشاور میں اپنا فرض ادا کرنے چلا گیا وہ روز نامہ سے فون اور اسکا سب پر بات کرتا تھا دونوں ایک دوسرے کو اپنے دن بھر کی رووا سناتے اپنے آنے والے دنوں کی پلاننگ کرتے دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں بہت خوش تھے ایک دوسرے سے دور ہونے کے باوجود ان کا دل ایک دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔

☆☆☆☆

اولیٰ سردیوں کے دن تھے دسمبر کی سہ راتیں ہمیشہ

دیکھ لیا تھا وہ بڑے پر خلوص انداز میں اس سے ملیں پھر ان عورتوں سے گفتگو کے دوران ان کی انسانی ہمدردی اور مہربان شخصیت کے مثبت پہلو عیاں ہوئے تمام عورتیں ان کے حسن اخلاق کی گرویدہ تھیں نہ صرف وہ فنڈز کے ذریعے بلکہ اپنی ذاتی اکاؤنٹ میں سے بھی ان عورتوں کی مالی امداد کیا کرتی تھیں انہوں نے اخبار میں اپنی تصویر لگانے سے بھی منع کر دیا تھا اس وقت رائمہ کو ان کے بارے میں اپنے منہ خیالات پر ڈھیروں شرمندگی ہوئی باقی رہے ماموں تو ان کی تکبرانہ عادت کو تبدیل کرنا ان کے اختیار میں نہیں تھا رائمہ کے لئے گلریز اور ماما کی محبت ہی کافی تھی۔

☆☆☆☆

رائمہ جو کافی عرصے بعد آج فراغت سے گھر پر تھی اور اپنے کمرے کی صفائی کے ساتھ ساتھ اپنا پسندیدہ سوئگ سن رہی تھی کہ اچانک نامہ کی پر جوش آواز سن کر چوکی۔

"یا اللہ خیر اب آپ کے پاس ایسی کیا اپ ڈیٹ ہے جس کو سنانے کے لئے آپ اپنی بے چین ہو رہی ہیں اور یہ تم نے کیا کیا بد تمیز لڑکی میں نے ابھی بیڈ شیٹ تبدیل کی تھی اور تم نے بیڈ کا پورا استیاس کر دیا۔" نامہ جو آتے ہی اس کے بیڈ پر گر گئی تھی جس سے ساری بیڈ شیٹ خراب ہو گئی تھی مگر رائمہ کے غصے کی پرواہ کئے بغیر اس نے بولنا شروع کر دیا۔

"ارے ارے آپنی! میرے پاس ایسی بریکنگ نیوز ہے جس کو سن کر آپ کی ساری رپورٹری دھری کی دھری رہ جائے گی۔" رائمہ جواب شلیف میں کتابوں کی سیٹنگ کر رہی تھی اس نے ہنوز مصروف انداز میں اس سے پوچھا۔

"اچھا ایسی بھی کیا خبر ہے کچھ میں بھی تو پتا چلے۔" "ہوں تو جناب دل تھام کر سینے پر سوں جمعہ المبارک والے دن آپ کا نکاح گلریز بھائی سے ہے جو ان کی خواہش پر کیا جا رہا ہے ویسے آپنی یہ آری والے بھی

سے رائے کو پسند نہیں آج بھی وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے روشن چمکتے چاند کو دیکھتے ہوئے گلریز کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی پچھلے سال دسمبر میں گلریز سے کئے جانے والا مذاق اور اس کی حماقت یاد کر کے اس کے لبوں پر ایک خوبصورت مسکان آ کر ٹھہر گئی۔

”کل 16 دسمبر یعنی گلریز کی برتھ ڈے مجھے کوئی شاندار سا گفٹ اور بو کے کوریئر کرنا چاہئے وہ یقیناً اس سر پرانز پر خوش ہو گا کل صبح اسے دس بھی کروں گی۔“

☆☆☆☆

”سر! یہ کوریئر سے آپ کے لئے پارسل آیا ہے۔“ گلریز جو ابھی سو کر اٹھا تھا اور فریش ہو کر ناشتے کے لئے جانے والا تھا صبح ہی صبح اس پارسل پر حیران ہوا کھول کر دیکھا تو حیرانگی کی جگہ مسرت نے لے لی گلاب کے خوشبو کی مہک کو اپنے سانسوں میں اتارتے اس نے ریپر کھول کر دیکھا تو اس میں ایک خوبصورت گولڈن ڈائل کی چمکتی رسٹ واچ تھی دل اس اہمیت و پذیرائی پر خوشی سے جھوم اٹھا اس نے محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر پنک لفافے میں بند کارڈ کھولا جس میں سنہری حروف میں ایک گلاب کی پتھڑی کے ساتھ دعائیہ الفاظ جگمگا رہے تھے۔

”یہ عرض پاک تجھ پہ ناز کرے“

خدا تیری عمر دراز کرے“

دعا گو صرف تمہاری رائے

اس وقت اس کا سیل فون گنگنا اٹھا گلریز کو بغیر دیکھے بھی معلوم تھا کہ یہ اس کی متاع حیات کا فون ہے۔

”پپی برتھ ڈے ٹو یو سویٹ گلریز اللہ پاک تمہاری عمر دراز کرے اور تمہیں زندگی کے ہر موڑ پر کامیابی عطا کرے آمین۔“ خوشبو میں لپٹے کاغذ میں لکھے حرف اب اس کی زبان سے پھول بن کر ادا ہو رہے تھے جس نے گلریز خان کو محتر کر دیا تھا۔

”اوہ سو سویٹ! یہ میری زندگی کی سب سے یادگار اور حسین برتھ ڈے ہے تم نے اس دن کو یاد رکھ

کر مجھے خاص بنا دیا ہے رائے! یہاں بیس بیس میں ہر وقت تمہاری یادیں میرے دل کو آنا اور کھتی ہیں میں تنہا ہوتے ہوئے بھی خود کو تمہاری مسکراہٹ اور تمہاری باتوں کی خوشبو سے مہکائے رکھتا ہوں میری صبح تمہاری خوبصورت آواز سن کر اور رات آنکھوں میں تمہارے صبح چہرے کا عکس لے کر بسر ہوتی ہے تم خوابوں کے نگر میں ہمیشہ میرے ساتھ ہوتی ہو تمہاری محبت کی بارش مجھے اندر باہر سے جل تھل کئے رہتی ہے اف رائے میں تمہیں بتا نہیں سکتا تم اللہ کی طرف سے میرے لئے خاص تحفہ ہو۔“ گلریز کی محبت لٹاتی گھمبیر آواز نے رائے کو ایک پل کے لئے بے خود کر دیا۔

”ایک بات پوچھوں رائے!“ گلریز نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔

”ہاں! کہو! گلریز میں سرتا پا صرف تمہاری ہوں تمہیں کچھ کہنے کے لئے مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔“ رائے کی بات نے اس کا مان بڑھا دیا۔

”کل رات سے میری طبیعت میں ایک بو جھل پن اور اداسی ہے مجھے خود نہیں پتہ میں اپنی اس کیفیت کو خود نہیں سمجھ پا رہا ایسا لگتا ہے کچھ انہونی ہونے والی ہے ابھی تم سے بات کر کے دل تھوڑا پرسکون ہوا ہے فرض کرو رائے! میں اپنے وطن کا قرض ادا کرتے ہوئے شہید ہو جاتا ہوں تو تم کیا میرے بغیر جی سکو گی؟“ کچھ دیر کے لئے رائے اس کی جذبات و خدشات میں ڈوبی آواز سن کر خاموش ہو گئی۔ مگر جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں وطن کی مٹی کی مہک اور حب الوطنی کا جذبہ بول رہا تھا جو ہر رشتے اور جذبے پر حاوی تھا۔

”گلریز! موت تو برحق ہے ہماری یہ زندگی خدا کا انمول تحفہ مگر اس کی امانت ہے وہ جب چاہے اپنی امانت واپس لے سکتا ہے اگر کبھی ایسا ہوا تو تم اور تمہارے ساتھ میں بھی خوش نصیب ہوں گی مجھے غازی سے شہید کی بیوہ ہونے پر زیادہ فخر محسوس ہو گا“ گلریز شہادت تو مومن کی معراج ہے جو اللہ پاک اپنے خاص بندوں کو نصیب کرتا

ہے اور یاد رکھنا اگر تم کبھی شہید ہوئے تو پیچھے مجھے بھی نہیں پاؤ گے انشاء اللہ زندگی کے اس عارضی سفر کے ساتھ ابدی سفر میں بھی میں تمہارے ساتھ ہوں گی یعنی میری دعا ہے کہ اللہ مجھے بھی شہادت کے درجے پر فائز کرے۔

گلریز اس کے ارادے اور نیت کی سچائی سے بہت متاثر ہوا یہ رائے جیسی، مسافر پر فخر محسوس ہوا یہ ان کی آخری بات تھی 7 بجے کے قریب دونوں نے ایک دوسرے کو الوداعی کلمات کہے اور پھر گلریز اپنی ڈیوٹی سنبھالنے چلا گیا صبح 8 بجے پشاور آرمی پبلک اسکول میں ننھے منے معصوم زندگی سے بھرپور بچے اسمبلی ہال میں کھڑے وطن کی سلامتی کا ترانہ پڑھ رہے تھے کہ ایک دم اسکول کی عمارت گولیوں کی آواز سے گونج اٹھی ملک کے دشمن عناصر نے پشاور آرمی پبلک اسکول میں دھاوا بول دیا تھا ہر طرف افراتفری اور خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں معصوم بچے ادھر ادھر چھپتے پھر رہے تھے مگر ظالم درندوں کو ذرا بھی رحم نہ آیا ان کی معصوم التجائیں رائیگاں گئیں ان کی اساتذہ اپنی فکر چھوڑ کر بچوں کی جانیں بچانے کی کوشش کر رہے تھیں مگر حیوانیت کا لبادہ اوڑھے وحشی درندے ان کو روند کر ان کی لاش پر سے گزر کر معصوم بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنا رہے تھے بچوں کے والدین اپنے اپنے لخت جگر کو ہر ایک معصوم چہرے میں تلاش کر رہے تھے بہت سی مائیں اپنے معصوم پھولوں کو مرجھائے دیکھ کر غش کھا رہی تھیں ان کی حالت اترتھی ایک قیامت کا منظر تھا کچھ دیر پہلے جہاں زندگی مسکرا رہی تھی معصوم ننھے فرشتوں کی آواز گنگنا رہی تھی وہاں ایک جامد سناٹا اور خوف دہرا اس کا سایہ تھا پاک آرمی نے اس نازک موقع پر ہمیشہ کی طرح وطن کی حفاظت کے لئے اپنا فرض بخوبی نبھایا پاک فوج کے جوان لبیک کہتے ہوئے کہتے دشمن سے مقابلہ کرنے ان کے سامنے سینہ سپر ہو گئے پاک فوج کو اپنی جانوں کی پرواہ نہیں تھی بہت سے دشمن عناصر جنہوں نے پاکستان کے ان معصوم مستقبل کے معجزوں کو صفحہ ہستی سے اڑا دیا تھا مگر ماتی

بچوں کو بچانے کی جدوجہد میں آرمی کے بہت سے نوجوان بھی شہید ہو گئے تھے ان شہادت کا رتبہ پانے والوں میں گلریز خان بھی شامل تھا اللہ نے اس کی آرزو پوری کر دی تھی آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس کی نظر میں اپنے تمام گھر والوں اور رائے کا چہرہ آخری بار آیا پھر کلمہ پڑھتے ہوئے ان کا عکس آنکھوں میں بسائے اس نے آنکھیں بند کر لیں ہر آنکھ ان بہادر جوانوں کی شہادت پر نمناک تھی تاریخ گواہ ہے پاک وطن کی طرف جب بھی دشمن نے میلی نظر سے دیکھا یا کوئی بھی مصیبت آئی اس میں ایئر فورس اور نیوی کے ساتھ ساتھ پاک آرمی نے بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے وطن کی عزت و حرمت کی حفاظت کی 1965ء کی جنگ سے لے کر کارگل تک عزیز بھٹی راشد منہاس سردر شہید گل شیر خان میجر طفیل شہید نے جس طرح اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور اپنے سینوں پر جرات و بہادری کا نشان حیدر سجایا وہ قابل تحسین ہے کیپٹن گلریز خان کو بھی دوسرے شہداء کے ساتھ پوری عزت و تکریم سے وطن عزیز کے پرچم سمیت لحد میں اتارا گیا تھا اس موقع پر رائے کا دل بھی خون کے آنسو رو رہا تھا ابھی تو اس نے گلریز خان کے ساتھ زندگی شروع کی تھی مگر اس نے جس ہمت و حوصلے سے کام لیا اور پشاور سانحہ پر جس بہادری و صبر کے ساتھ نیوز کی کوریج کی وہ واقعی قابل فخر تھی اس نے واقعی وطن کی عظیم بیٹی اور صابر بیوی ہونے کا ثبوت دیا تھا اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ قائد کے بے پاکستان کو کبھی مایوسی و شکست کی نظر نہیں ہونے دے گی وقت کا ساغر خوشی اور غم کی لہروں کے ساتھ آگے رواں دواں تھا رائے کے والدین نے بہت کوشش کی کہ اس کی شادی ہو جائے مگر اس نے یہ کہہ کر سب کو خاموش کر دیا کہ۔

”سہاگن بننے سے میرے لئے ایک حب الوطن بہادر شہید فوجی کی بیوہ کہلانا زیادہ خوش نصیبی اور فخر کی بات ہے یہ میرے لئے باعث اعزاز ہے۔“

گئے تھے مگر ایسے اپنی جان سے زیادہ وطن کی محبت اور حرمت عزیز تھی پاکستان جیسے سپر ایٹمی یاور رکھنے والے ملک کی جڑیں بے ایمانی، نا اتفاقی، کرپشن، دہشت گردی، ڈرون حملوں اور رشوت خوری کے پانی نے کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا جس کی آبیاری قائد اعظم اور لاکھوں مسلمانوں نے اپنے خون کے ذریعے کی تھی اور جب دشمن پشاور سانحہ کے ذریعے ملک کے معماروں میں خوف و ہراس پھیلانے میں ناکام ہوا اور ان معصوم بچوں نے اپنے سچے عزائم اور حب الوطنی کے جذبے سے انہیں شکست دے دی تو اب ان کا ٹارگٹ ملک میں امن و انصاف کا پرچار کرنے والے وکلاء تھے کوئٹہ سانحہ پاکستان کے لئے ایک اور بڑا دھچکا تھا مگر اس وقت بھی پاکستانی عوام کا جوش و خروش مائد نہیں پڑا تھا کوئٹہ سانحہ میں وکلاء کے ساتھ ساتھ مختلف چینل کے نیوز رپورٹر اپنے فرض کی ادائیگی کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے جن میں رائے کا نام سر فہرست تھا ہر چینل سے یہی بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ ”ملک کی جائز بیٹی اور اپنے پروفیشن سے جنون کی حد تک محبت کرنے والی مایہ ناز نیوز رپورٹر مسز رائے گلریز فرض نبھاتے ہوئے شہید ہو گئیں۔“ ہر کوئی اس کی بہادری و جرات مندی پر خراج تحسین پیش کر رہا تھا آخر کار اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا گلریز خان کے ساتھ ساتھ اس نے بھی اس پاک دھرتی کے لئے اپنی جان قربان کر دی تھی اس نے سچ کہا تھا کہ اس عارضی زندگی میں نہ آئی مگر اس ابدی زندگی میں ہم ایک ساتھ رہیں گے اور فخر سے کہہ سکیں گے۔

”ہم نے وطن کی مٹی کا قرض اتار دیا ہے اے آنے والی نسلوں اب تمہاری باری ہے اس وطن کی نگہبانی اور اس گلستان کی رکھوالی اب تمہارے سپرد ہے اے میرے ہم وطنو! جان تو آتی جانی شے ہے اصل چیز وطن کی عزت و حرمت کی سلامتی اور پرچم کی سر بلندی ہے۔“

☆.....☆.....☆

اس کے بعد سب نے چپ سا دھنی۔ رائے کی شادی ہو چکی تھی وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سعودی عرب میں خوشگوار زندگی گزار رہی تھی گلریز کے والد جمشید خان بھی اس کی شہادت پر ڈھے گئے تھے بہر حال وہ ان کا اکلوتا لخت جگر تھا مگر جاتے جاتے وہ انہیں زندگی کا اصل سبق دے گیا تھا کہ زندگی ایک بے اعتبار چیز ہے دولت کے پیچھے بھاگنے والے ہمیشہ تنہا رہ جاتے ہیں اب وہ اپنی آمدنی کا بہت بڑا حصہ غریبوں اور ناداروں کے فلاحی کاموں میں لگاتے تھے جس سے ان کو قلبی و روحانی سکون ملتا تھا رائے بھی ان جی او کے انتظام میں اکثر مسز جمشید کی مدد کرتی تھی ان کی زندگی کا محور اب انسانیت کی خدمت تھا۔

گلریز کی شہادت اس کی خواہش رائے کے لئے باعث فخر تھا مگر ابھی بھی سر دیوں کی ویران سردراتوں میں وہ محبت کا پیکر شدت سے یاد آتا تھا اس کی شرارتیں رائے کے لئے اس کی محبت میں شدت، وطن کے لئے قربانی کا جذبہ کچھ بھی قابل فراموش نہیں تھا گلریز کی پہلی اور آخری محبت کی نشانی گولڈ کا بریسلٹ جو نکاح کے بعد بڑے پیار سے اس کی کلائی میں پہنایا تھا اس پر گلریز کی محبت کا لمس آج بھی محسوس کر کے رائے کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

☆☆☆☆☆

رائے جو پہلے ہی بہت حساس تھی گلریز کی شہادت کے بعد اپنے پروفیشن سے اور زیادہ جنونی ہو گئی اس نے جمشید خان کے تعاون سے اپنا ایک الگ چھوٹا سا پریس قائم کیا تھا نیوز رپورٹر اور ساتھ ساتھ اپ وہ چیف ایڈیٹر کے فرائض بھی بخوبی انجام دے رہی تھی اور ملک کے بڑے بڑے صرف اپنی اقتدار و اختیار کے فکر میں ڈوبے سیاستدانوں اور راتوں رات غریبوں کی خون کمائی سے بنائے گئے اونچے اونچے پلازوں اور شاپنگ مال کے مالکان اور سرمایہ داروں کی پراپرٹی کا راز بڑی جرات مندی سے کھولتی تھی اور جس کے خلاف کئی محاذ کھل

دوسرے پہاڑ پر آج



WWW.PAKSOCIETY.COM

لمحوں میں تھی خود سے سوال جواب کرنے سے باز نہ آئی۔
”بول رہا ہوں آپ کون؟“ دل جو چیخ چیخ کے
کہہ رہا تھا وہی سچ نکلا۔ ایک پل کے لیے اس کے
ہاتھ کانپ سے گئے۔

”عاصم! میں منال.....“ شدت جذبات سے
اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

”عاصم! آج ایک سال ہو گیا ہے تمہیں مجھ سے
روٹھے دیکھو میں تمہیں بھول نہیں پائی اور میں جانتی
ہوں کہ تم بھی مجھے یاد کرتے ہو گے۔ آج یکم دسمبر
ہے۔ پچھلے سال کے اسی اداس اور منحوس مہینے میں اسی
سرد دن تم نے مجھ سے سارے ناتے توڑے تھے ناں
اور دیکھو آج پھر سے ویسی ہی اداسی ویسی ہی ٹھنڈ
ہے۔ جیسی تب تھی۔“ اس نے اپنی ساری ہمت جمع کر
کے آج سب کہہ دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ آج اس کے
پاس پہلا اور آخری موقع تھا اپنی خوشی جیت جانے
کا۔ اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے اس کی نظر اپنے پیروں
پر پڑی جو جوتے کی قید سے آزاد لیکن ٹھنڈ کی شدت
سے سرخ تھے۔ پھر بھی اسے سردی نہیں لگ رہی تھی۔
بس پیروں کی سرخی دیکھ کے ایک جھرجھری ہی آگئی۔

”کون منال میں کسی منال کو نہیں جانتا۔ اگر
پہلے کبھی جانتا بھی ہوں گا تو اب بھول گیا ہوں اور
اب دوبارہ سے جاننے کا خواہش مند نہیں ہوں۔ اس
لیے آئندہ مجھے فون کرنے کی زحمت مت کرنا۔“

دوسری طرف سے اپنی کہہ کے فون بند کر دیا گیا۔
آنسو جنہیں اس نے بے پردی سے رگڑ رگڑ کے
خشک کرنے کی کوشش کی تھی۔ دوبارہ سے جاری
ہو گئے۔ اسے لگا کہ وہ پھر سے اسی دورا ہے پر
آکھڑی ہوئی ہے۔ جہاں ایک سال پہلے آج کے
دن کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی ایسا ہی سچ بستہ دن تھا
جب اس سنگدل نے 2 سال کے دعدوں کو بھلا کے
اپنے راستے اس سے جدا کر لیے بناء وجہ بتائے بغیر
اس کے کسی بھی جبر کے۔ یونیورسٹی کے اس پر ہجوم

آج وہ پھر اداس تھی بے تحاشہ اداس، یوں تو وہ
اس سال کے پورے 365 دن ہی بلا ناخدا اس رہی
تھی لیکن آج کی اداسی حد سے سوا تھی۔

”آج یکم دسمبر کو پورا ایک سال ہو گیا اسے مجھ
سے دور گئے ہوئے۔“ آنسو ایک تسلسل کے ساتھ
اس کے دامن کو گھیلا کرتے جا رہے تھے۔

”کیا تھا اگر وہ میری زندگی سے یوں نہ جاتا۔
اگر وہ مجھے اپنی زندگی میں شامل کر لیتا تو آج میں
یوں اس کے غم میں نہ بیٹھی ہوتی۔ اس ایک سال میں
”میں“ نے اسے ایک ہزار بار یاد کیا ہوگا۔ کیا اسے
بھی میں یاد ہوں گی یا پھر بھول گئی ہوں گی۔“ وہ اپنی
سوچوں میں گم خود سے سوال جواب کر رہی تھی۔
جب اچانک اس کی سوچ کا زادیہ بدلا وہ چونک کے
حال میں لوٹی پھر جیسے کچھ یاد آنے پر وہ بھاگتی ہوئی
کمرے میں چلی گئی اور جب لوٹ کے واپس اپنی
غمگسار سیڑھیوں پر بیٹھی تو اس کے ہاتھ میں موبائل
تھا۔ اس نے کامیکٹ لسٹ کھول کے اپنا مطلقہ نمبر
نکالا اور انگلی کی پور سے ہلکا سا دبایا۔ ایک لمحے کو اس کا
دل سکڑ کے پھیلا تھا۔ آنکھوں کی نمی کو اس نے ہاتھ کی
پشت سے رگڑ کر خود کو بٹاش محسوس کروایا۔ آخر ملائی
گئی کال پر بات کرنے کے لیے اسے نئی ہمت اور
توانائی کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف پہلی بیل کے
اختتام پر کال ریسیو کر لی گئی۔

”ہیلو.....“ منال کو ایک ہیلو کہنے میں اپنی پوری
توانائی استعمال کرنی پڑی۔

”ہیلو کون بول رہا ہے اور کس سے بات کرنی
ہے؟“ دوسری طرف سے ایک سخت اور کھردری سی آواز
نے اس کے اوسان پھر سے خطا کروانے چاہے۔

”کیا میں عاصم سے بات کر سکتی ہوں؟“ اس کا
دل چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا کہ مخاطب ہی اس کا عاصم
ہے۔ لیکن اتنی سخت اور بے حس آواز۔

”نہیں نہیں یہ میرا عاصم نہیں ہو سکتا۔“ وہ ان چند

”میری مانتو تو تم اب عاصم نام کے خول سے باہر آ کے حقیقت کی دنیا میں جیو۔ تم اب آنٹی کو اور نہ ستاؤ اپنی زندگی کا فیصلہ انہیں کرنے دو۔ وہ تمہارے لیے اچھا ہی کریں گی۔ کیونکہ کوئی بھی ماں اپنی بیٹی کے لیے برا تو کر ہی نہیں سکتی۔ اس لیے یہ مان تم انہیں بخش دو۔“ وہ ایک بار پھر اسے بچے دل کے ساتھ سمجھا رہی تھی۔ ”شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ عاصم نام کی مالا جیتے جیتے میں اپنے سے وابستہ رشتوں کو پریشان کر رہی ہوں۔ لیکن اب اور نہیں بچھلے برس کے دسمبر نے مجھے جس کرب اور اذیت میں دھکیلا۔ اس دسمبر مجھے خود کو اس اذیت اور اس بے مول ڈور سے آزاد کروانا ہے اور میں یہ کر کے رہوں گی کیونکہ میرے لیے میرے اپنے پریشان رہیں یہ میں اب اور نہیں ہونے دوں گی۔“ اس نے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے ایک نئے عزم سے کہا تو ارم نے اسے خود سے لگالیا۔ اسے یقین نہ آیا کہ منال اتنی آسانی سے بات سمجھ جائے گی لیکن نہیں اتنی آسانی سے کہاں وہ سمجھی تھی۔ بلکہ ایک سیدھی سی بات سمجھنے میں بھی اسے پورا ایک سال لگا۔ پورا سال اس نے خود کو اپنے حصے کی خوشیوں سے محروم رکھا یہ کوئی معمولی قیمت تھوڑی ہی تھی۔ منال کو گلے لگائے اس نے اپنی ہی سوچ کی سچ کی تھی جب اپنے گھروں کو لوٹتے پرندوں نے بھی شور مچا کے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ضروری تو نہیں ناں کے ہر سال کا دسمبر بھیکا بھیکا ہی ہو۔ ہر سال ہی دسمبر میں صرف جدائی کا راج ہو بلکہ یوں بھی تو ہو سکتا ہے ناں کے کبھی دسمبر لوٹ کے آئے تو اپنے ساتھ صرف خوشیوں کی بارات لائے اور غموں کے بادلوں کو ہوا کے دوش پر اڑا کے دور لے جائے دور بہت دور۔ جہاں کسی کی پہنچ نہ ہو۔ ایسے ہی جیسے منال نے اپنے غموں اور خود ساختہ دکھوں سے نجات حاصل کر کے خوشیوں کی جانب پہلا قدم بڑھایا۔ تو دسمبر نے مسکرا کے اسے خوش آمدید کہا۔

☆.....

ماحول میں بھی اسے اس لمحے اپنا آپ ایسا تنہا اور بے مول لگا کے کوئی حد نہ تھی۔ اس بیچ پر وہ کتنی ہی دیر اکیلی ساکت بیٹھی رہی۔ آنسو دل پر یوں گر رہے تھے گویا آج ہی سیلاب لے آئیں گے۔ وہ تو اچھا ہوا جب اس کی سکھی اس کی ہر ازارم اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں تک پہنچی اور اس کی بھری حالت دیکھ کے گلے لگا بیٹھی۔ تب اس کا بند بھی ٹوٹا اور وہ دل کھول کے روتی بلکہ ایک سال گزرنے کے باوجود آج تک رو رہی تھی۔ ارم کے لاکھ سمجھانے پر بھی اس کا دل اس سنگدل کے بارے میں الٹا سیدھا سوچنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ”تم مان کیوں نہیں لیتی کہ وہ تم سے فلرٹ کر رہا تھا اور جب تم زیادہ سیر لیں ہوئیں تو اس نے راستہ بدل لیا۔ آخر تم خود کو اس فریبی کے لیے کیوں ہلکان کرتی ہو۔ تم خود کو اپنے نصیب کی خوشیوں اور سکھوں سے کیوں محروم رکھنا چاہتی ہو۔ کیوں خود کو اس چھلاوے کی خاطر تنہا کرنے پر آمادہ ہو۔ آخر تم کیوں اپنے گھر والوں کو مسلسل پریشان کر رہی ہو۔“ سہہ پہر ڈھل کے شام کی آغوش میں چھپنے لگی تھی۔ جب ارم اس کے پہلو میں آ بیٹھی۔ ٹھیک اسی دن کی طرح آج بھی اسے ارم کی ضرورت اسی شدت کے ساتھ محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے یونیورسٹی کے اس بیچ پر بیٹھے ہوئے تھی۔ وہ اس کی گود میں سر رکھے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ ”ارم! دیکھو پھر سے دسمبر لوٹ آیا ہے مجھے اکیلا اور تنہا کرنے۔ میں کیا کروں میں اس کی یاد سے کب پیچھا چھڑاؤں۔ میں کیا کروں ارم میں کیا کروں کوئی طریقہ بتاؤں کے میں رونا چھوڑ دوں۔ میں رو رو کے تھک گئی ہوں۔ میں اب اور رونا نہیں چاہتی لیکن میں بے بس ہوں شاید اس ایک سال میں میری ان آنکھوں کو صرف رونے کی ہی عادت ہو گئی ہے۔ اب ہر وقت ان میں صرف نمی ہی رہتی ہے۔“ آج وہ بھی ضبط کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ جب ہی اپنے بال دونوں مٹیوں میں بھیجنے وہ اس سے مشورہ لے رہی تھی۔

دوسبر کی ایشی شام میں

زندگی میں تجربات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ دادی جان اپنی زندگی کے 80 سال گزار چکی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ رشتہ طے کرتے وقت ڈائریکٹ شادی کرو، مسئلہ تو ہرگز، ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ خوشی کا ڈھنڈورا پیٹنے سے



”کیا نام ہے آپ کا بیٹا؟“
 ”عروہ.....!“ تو پھول جھڑ پڑے اس کے ہونٹوں
 سے عشرت جہاں کی آنکھوں کے ستارے چمکے تو وہ
 بڑھ کر عروہ کی ماں سے بولیں۔

”آپ کی بیٹی ہے بہت پیاری۔“
 ”یہ سب اللہ تعالیٰ کی دین ہوتی ہے۔“ عروہ کی
 ماں انکساری سے بولیں۔

”بہن! آپ مجھے اپنا ایڈریس دے سکتی ہیں۔“
 عشرت جہاں بولیں۔
 ”لے لیجیے بہن!“ انہوں نے عروہ کو آنکھ سے

نظر لگتی ہے۔ پھول مرجھا کر گر جاتے ہیں۔ خوشی میں
 اچانک پت جھڑ کا موسم آ جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے
 شجر اور پھول مرجھا جاتے ہیں۔ کچھ نے دادی جان کی
 بات مانی کچھ نے نہ مانی۔ جونہ مانے سو گھاٹا۔ عشرت
 جہاں کا بڑا بیٹا شہریار منصور باہر سے پڑھ کر لوٹا تھا۔
 بڑی خوب روٹ کی اسے اچانک پسند آ گئی جو کام ماں بہنیں
 برسوں میں نہ کر سکیں ایک پل میں شاپنگ مال میں
 گزرتی ہوئی نو خیز کلی ”عروہ“ دل کو ایسا بھائی کہ عروہ
 نے بھی اسے پلٹ کر دیکھا تو عشرت جہاں کے
 چہرے پر بھی پھول کھل اٹھے۔ قریب جا کر بولیں۔



اشارہ کر دیا تھا۔
 ”لائیں آئی میں آپ کے سیل میں اپنا نمبر
 Save کر دیتی ہوں۔“ اس نے ان کے ہاتھ سے
 سیل لے کر اپنا نمبر Save کر دیا اور وہ ہنس کر مڑی تو
 مسلسل شہر یار منصور اسے دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆

دوسرے ہی دن عشرت جہاں نے عروہ کی ماں کو
 کال کی تھی۔
 ”بہن! مجھے تمہاری بیٹی عروہ بہت پسند آئی ہے اور

میرے ساتھ میرا بیٹا شہر یار منصور تھا وہ میرا بڑا بیٹا ہے
 اور حال ہی میں دہلی سے واپس آیا ہے اور وہیں اس کی
 جاب ہے۔ NED سے وہ انجینئرنگ کر کے گیا تھا میرا
 نمبر آگیا ہے آپ کے پاس، آپ میرے بیٹے کے
 بارے میں سوچیں اور پھر مجھے بتائیں۔ ہم لوگ آپ
 سے ملنا چاہتے ہیں۔“ عشرت جہاں نے سیدھے
 سادے لفظوں میں اپنے من کی بات بتادی۔

عروہ کی ماں نے بھی ہنستے ہوئے ان کو گھر آنے کی
 دعوت دے دی تھی۔ آنا جانا شروع ہوا، پھر درمیان میں
 بہت ساری ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ عروہ اور شہر یار ہر
 روز ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ کبھی کالی ڈنر کبھی
 شاپنگ کبھی کبھی کہیں۔ لیکن داوی جان کو اس بات
 پر اعتراض تھا۔ وہ عروہ کی ماں کو سمجھاتی رہیں۔

”دیکھو صبا! یہ بالکل اچھا نہیں ہے کہ وہ شادی سے
 پہلے ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے ہیں، پردہ
 رہے تو اچھا ہوتا ہے ایک دوسرے کے جتنے قریب
 آئیں گے اتنی ایک دوسرے کی باتیں کھلیں گی۔“

”اماں! آج کل دوسرا دور ہے، اچھا ہے انڈر
 اسٹینڈنگ ہوگی۔ ایک دوسرے کو یہ سمجھیں گے۔“
 ”سمجھتے سمجھتے پھر ایک دوسرے کے سارے بھید
 کھلیں گے تم کیسے ہو اور ہم کیسے ہیں؟“ داوی جان
 اختلافی لہجے میں بولیں۔

”اماں آپ بات کیوں نہیں سمجھتیں، اکیلا لڑکا ہے

دہلی میں رہتا ہے، ساس، نند کا کوئی چکر نہیں ہو گا بس
 عروہ ہوگی۔ آپ سمجھیں ناں ہماری بھی مجبوری۔ فہم اور
 جنید کو اسی کے ذریعے دہلی نکال سکوں گی۔ یہ تو اللہ نے
 بیٹھے بٹھائے ایک چانس دیا ہے۔“ دانش مندی کے
 سارے گروہ اماں کو بتا رہی تھیں۔

”صبا! قبل از وقت یہ باتیں صحیح نہیں ہیں۔ عروہ کے
 دماغ میں یہ باتیں تم نے ڈال دی ناں تو وہی فلمیں
 چلیں گی اس کے دماغ میں۔“ اماں اپنے تجربے کی بنیاد
 پر کہا۔

”اماں! چھوڑیں اب سب چلتا ہے اسی بہانے فہم،
 شہر یار کی ساری معلومات بھی لے لے گا، بہت ویل
 آف لگتا ہے کون آتا ہے یوں بار بار۔ وہ ٹین باز آچکا
 ہے ان مہینوں میں، اس بار تو میں کہہ رہی ہوں کہ کوئی
 چھوٹی سی رسم کر لیں وہ لوگ انگلی پیہنا جائیں عروہ کو۔“
 صبا مسکرا کر بولیں تو داوی جان خوفزدہ ہو کر بولیں۔

”نہ..... نہ ایسا مت کرنا۔ یہ گھر کی خوشی کی بات
 ہے۔ ساری دنیا کو خبر ہو جاتی ہے کچھ اچھے تو کچھ بد خواہ
 بھی ہوتے ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ کسی کے کان میں
 بھنک بھی نہ جائے بس بات کر کے بیٹھی رہو۔ ہم نے
 سعدیہ کی بار بڑے دھوکے کھائے ہیں ایک معنی کی تھی
 پورے زمانے کو خبر ہو گئی۔ جو بھی رشتہ آیا جاتا تو پہلے بتایا
 جاتا کہ بھائی اس کی ایک معنی ٹوٹ چکی ہے۔ معنی ہوئی
 ایک نکاح کی طرح ٹھپہ لگ گیا میری بیٹی پر۔ سعدیہ تو
 سوکھ کر کاٹا ہوئی جا رہی تھی، ہماری بھی نیندیں اڑ گئیں۔
 آج تک سعدیہ کو طعنہ ملتا ہے۔ اللہ جانے کیا ہوا تھا جو
 تمہاری معنی ٹوٹی۔ دو بچوں کے باوجود ابھی تک صادق
 میاں یاد دلاتے رہتے ہیں۔ یہ زہر کا پیالہ میں نے پیا
 ہے۔ یہ نصیحت ہر لڑکی والے گھر میں باندھ لیں باہر کیا
 خاندان والوں کو بھی رشتے کی بھنک نہ دو۔ میرا نے بھی
 یہی کیا میں سمجھاتی رہی کہ چپ کر جا اس کا رشتہ آیا ہے تو
 اس بات کو دبا کر بیٹھ۔ نہیں جی نہیں، بڑے بھائی ہیں۔
 انہیں تو بتانا پڑے گا۔ ورنہ برا مان جائیں گے۔ لڑکا

حدیث نہ مانے تو مسلمان کہاں سے ہوا۔“ سمیرا نے بات ختم کر دی۔

”بھلا بتاؤ ان کی سگی بہن پوچھنے بیٹھ گئی، دو سال بات رہی آنا جانا بھی ہوا ہو گا عیدی بھی آئی ہوگی۔ وہ لوگ چپ ہو کر بیٹھ گئے۔“

سمیرا بولیں۔ ”کیسی بات کرتی ہو بہن کون سا ہم نے رسم کی بھی جو وہ یہاں پر تھنے لے کر آتے۔“ مگر وہ پھر بھی بولیں۔ ”پھر بھی دو سال منگنی رہی وہ تھنے تھائف تو لاتے ہوں گے۔“

اپنی سگی بہن کی یہ بات سن کر سمیرا کا دل پھٹ سیانگیا لیکن یہ بات دادی جان کے مشاہدے میں آچکی تھی۔ تبھی وہ ٹکس کر بتائی تھیں کہ بیٹیوں کے نصیب جوڑتے وقت چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال کرو۔ گھر کے اندر جاؤ بیٹھو اگر گھر میں بہو ہے تو اس سے ملو جلوا کر بہو نہیں ہے تو دادا سے ملو۔

لیکن سننا کس نے تھا دادی جان بولتی رہیں اور عروہ ہوا میں اڑتی رہی۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ شہر یار کے ساتھ گھومتی وہ دو دو بجے رات کو گھر آئی۔ آنے والے دنوں کی پلاننگ عروہ اور شہر یار کرتے۔ شہر یار اس کی ہر بات مانتا، صابرا خوش تھیں کہ بڑا اچھا لڑکا پھاس لیا ہے اور ان کے گھر کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ پھر شہر یار ایک ہفتہ رہ کر واپس دہلی دلا گیا۔

عروہ ہر وقت اس سے کانٹکلیٹ میں رہتی، فیس بک، واٹس اپ، ٹوئٹر پر۔ صابرا کو کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ بے حد خوش تھیں کہ عروہ کی اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی کہ وہ ہر بات شہر یار سے ڈسکس کرتی۔ ”اب میں شاپنگ کر رہی ہوں، ساری کراکری خرید رہی ہوں، میں نے دیوار کی پیٹنگ لی ہیں۔ میں ڈرائنگ روم سجاؤں گی بیڈ روم میں ایسا رکھوں گی، سنا ہے وہاں چیزیں بہت مہنگی ہیں۔ اب آپ بیڈ روم کے ونڈو کا سائز بتا دیں تاکہ میں پردے سلوا لوں۔“

”یہ سب مت کرو۔“ شہر یار اسے منع کرتا لیکن وہ

شہر یار کی ایک نہ سنتی۔

”ولیمہ آپ کسی فائیو اسٹار میں کیجیے گا سب ہماری فرینڈز آئیں گی تاکہ سب کو پتا تو چلے کہ میری شادی کہاں ہو رہی ہے۔“

”دیکھو! میں کہہ رہا ہوں میں شادی بہت سادگی سے کروں گا میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی آپ اس ہفتے آرہے ہیں ناں تو میرے لیے ڈائمنڈ کی رنگ لے کر آئیے گا۔“ وہ لاڈ سے بولی۔

کچھ عرصے بعد شہر یار جب پاکستان آیا تو وہ ڈائمنڈ کی اچھی خاصی مہنگی رنگ لے کر آیا۔

☆.....☆

دیکھو صابرا! اگر وہ رنگ پہنانا چاہتا ہے تو وہ لوگ سادگی سے آجائیں کوئی دھوم دھام نہیں ہو۔ سادگی سے ہو سب کچھ۔“

”نہیں دادی جان! میں نے تو اس سے کہہ دیا ہے کہ ٹھیک ٹھاک لوگ آئیں گے ہمارے ہاں۔ میں دنیا کو دکھاؤں گی کہ رنگ اور رسم ایسی ہوتی ہے۔“ عروہ دادی کو دیکھ کر ہنسی اور کمرے میں چلی گئی۔

”صابرا! ایسا مت کرو وہ بڑے لوگ ہیں ہم غریب ہیں اور بیٹی والے ہیں۔ ہمیں قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہے۔ صابرا تم عروہ کی باتوں میں مت آؤ خود فیصلہ کرو۔ عروہ جو کر رہی ہے سب غلط ہے۔“

”اماں! یہ باتیں نہ کریں۔ دل میں ہول آتے ہیں اللہ نہ کرے اسے کسی کی نظر لگے۔“

”اسی لیے تو کہتی ہوں عروہ زیادہ نہ اچھلے نظر لگتی ہے۔“

پھر خوب دھوم دھام سے عروہ شہر یار کی منگنی بھی ہو گئی۔ عروہ کی ساری خالہ، ممانی لوگوں نے شہر یار کے ساتھ تصویریں بنوائیں سارے زمانے پر خبر ہوگئی۔ فیس بک، واٹس اپ، ٹوئٹر پر عروہ نے اپنی منگنی کی تصویریں لگا دی تھیں۔

ساتھ رہے۔“ عشرت جہاں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

☆.....☆

صبح چپ چپ گھر میں گھوم رہی تھیں۔ عروہ روم بند کیے بیٹھی تھی پورے ماحول میں اضمحلال طاری تھا۔

”اماں! ٹھیک ٹھاک بدنامی ہو گئی سب کو خیر تھی کہ ہم نے عروہ کی منگنی کر دی ہے۔ اب کیا ہوگا۔“

”کہا تو تھا بیٹا! کہ اتنا شور مت مچاؤ لیکن تم نے میری نہ سنی، جگ ہنسائی ہو گئی میری عروہ کی۔ وہی

سعدیہ والا حال ہوگا میرا بیٹا چپ چپ گھوم رہا ہے۔“

”اماں! چپ رہیں عروہ کا برا حال ہے۔“

”میں تو چپ ہو گئی ہوں صبا! مجھے معلوم تھا۔“ دادی جان اداس لہجے میں بولیں تو عروہ کمرے سے نکل کر آئی تو وہ بولی۔

”آپ یہی چاہتی تھیں ناں وہی ہو گیا، جو سوچو وہی ہوتا ہے۔“

”ارے ارے عروہ۔“ دادی اسے بلاتی رہیں مگر وہ کمرے میں چلی گئی۔ کوئی کسی کے لیے نہیں رکتا۔

چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ شہریار کو پھر ایک لڑکی نکرا گئی ایئر پورٹ سے نکلے ہوئے۔ اس کے حسن کی وجہ اس کے کلبے اور گھنے بال تھے جس کا شہریار ایک نظر میں اسیر ہو گیا۔ پھر چٹ منگنی پٹ میاہ والی بات ہو گئی۔

شہریار، مہوش کے بالوں کو چھو کر بول رہا تھا۔

”پہلی چیز جس نے مجھے اٹریکٹ کیا وہ تمہارے یہ لمبے گھنے بال تھے۔“ اس نے جھک کر بالوں کی خوشبو کو محسوس کیا۔

”واؤ! کیا خوشبو ہے کون سا شیمپو ہے، کیا چادو ہے تمہارے بالوں میں۔“ جس نے ایک جھلک میں شہریار

منصور کو تہہ ہارا اسیر کر دیا۔“

”واقعی میں شہریار! تمہیں اس خوشبو اور میرے بالوں نے اسیر کیا ہے؟“ یہ لائف بوائے شیمپو کا کمال ہے جس نے تمہیں میرا اسیر کر دیا۔“ واقعی اس وقت

مہوش کے خوشبو سے مہکتے بال شہریار کو بے خود کر رہے تھے۔ مہوش نے شرما کر اپنے بالوں کو سمیٹ لیا۔

☆.....☆

شہریار واپس چلا گیا مگر وہ بے حد ایک دوسرے کے قریب تھے۔ منٹ منٹ پر ہر بات کی خبر، صبا نے دیکھا کہ وہ عروہ کی ہر بات مان رہا ہے تو اس نے بھی سوچا کہ بہتی ہوئی گنگا میں، میں بھی ہاتھ دھو لوں۔

”عروہ! شہریار سے بول کہ وہ فہد کا ویزا اور ٹکٹ بھیجے وہاں سے۔“

”یہ تو کوئی بات ہی نہیں، میں فوراً شہریار سے بات کرتی ہوں کہ شہریار اپنی کمپنی کے نام پر فوراً فہد کا ویزا

نکلا دے گا بس کہنے کی دیر ہے۔“

”تمہاری دادی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔“ صبا نے دانش مندی سے کام لیا تھا۔ شہریار کی بات کے دوران ہی ایک لمبی فہرست عروہ نے بیان کر دی۔

”شہریار! مہندی کا پیکج دولا کہ تو ہوتا ہے وہ تو تم کرو گے۔“

”دیکھو عروہ! تم نہیں سمجھ رہی ہو تمہاری توقعات کچھ زیادہ ہوتی جا رہی ہیں۔“

”تو یہ کون سی بڑی بات ہے تم فہد بھائی کا ویزا اور ٹکٹ اسی ہفتے بھیجو، ورنہ میں تمہاری رنگ اتار دوں گی۔“ ویزے اور ٹکٹ کی بات اتنی بڑھ گئی کہ عروہ ضد پر آ گئی اور شہریار انکار کرتا رہا۔

ایک دن شہریار ماں کو فون کر رہا تھا۔

”اماں! اس کی توقعات بہت زیادہ ہیں، کبھی کہتی ہے کہ ولیمہ اور مہندی شاندار ہوگا۔ گولڈ اور ڈائمنڈ جیولری

چاہیے، ابھی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ وہ کہتی ہے فہد کا ٹکٹ اور ویزا بھیجو۔ میں کہاں سے بھیجوں۔ میں تو خود

شیر کر کے روم میں رہ رہا ہوں۔ میرا تو کام ہی ایسا ہے کہ مجھے بار بار پاکستان آنا اور جانا پڑتا ہے۔ وہ مجھشتی

ہے میں بہت لگژری اپارٹمنٹ میں رہ رہا ہوں۔ آفس کی گاڑی میری ملکیت ہے۔ اب ویزا دو اس بات پر

میری اس سے ٹھیک ٹھاک بحث ہو گئی۔ ہر روز نئی بات، میں نے تو عروہ سے ختم کر دی، اماں کوئی اور لڑکی دیکھ

لیں جو سیدھی سادھی ہو اور جو پاکستان میں آپ کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

رواڈ انجکشن 200 دسمبر 2016ء

دوسبر کی بارش اور وصلِ شب

نومبر کا مہینہ جان لیوا موسم، دل ویران، چہرہ پریشان تنہائی ایش ٹرے میں بکھرے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے، بکھرے بال، آف موبائل اور ان گنت شکنوں سے بھری پیشانی.....! یہ میں تھا۔ ارہیز دانی



اور میرے کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کے ساتھ میری شخصیت بھی بکھری سی تھی۔ میری ہر بات اور ہر خواہش پر لبیک کہنے والی میری ماں نے میری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ میری مرضی کے بغیر ہی کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ میری خواہش کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتی تھی اور اس بارے میں میری کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔

ہانیہ میری خواہش تھی میں نے اسے کئی بار خوابوں میں اپنا ہم قدم دیکھا تھا۔ میری اس کے ساتھ کسٹمنٹ تھی مگر امی نے اپنی کسی دوست کی بیٹی

سے میری بات چلی کر کے شادی کی تاریخ بھی طے کر دی اور ہانیہ مجھ سے سخت خفا ہو گئی تھی۔ وہ بڑی بھابی کی فرسٹ کزن تھی۔ گھر میں آتے جاتے ہم دونوں کی بہت انڈراشینڈنگ ہو گئی مگر وہ امی کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ بھیا اور بھابی کے دبی سیٹل ہونے کے بعد میں اس سے باہر ملتا تھا مگر اماں نے ایک جھٹکے سے میرے سارے خواب چکنا چور کر دیئے تھے۔

☆.....☆

شادی سے پہلے میں نے بہت کوشش کی کہ میرا

Downloaded From
Paksociety.com

اس لڑکی سے رابطہ ہو جائے مگر افسوس کوئی موقع نہ مل سکا۔ نکاح کے ٹائم جب میرا گھر اس لڑکی کے نام لکھا گیا تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ شادی کے بعد بھی میرا ارادہ اسے بھگانے کا تھا۔ اپنے برے سلوک سے اسے ہراساں کر کے گھر سے نکلنے پر مجبور کرنا تھا مگر افسوس..... یہاں بھی والدہ محترمہ اپنی چال چل گئیں میرا دماغ مزید منصوبے بنانے لگا۔ سوچتے سوچتے اور ہانیہ کو مناتے مناتے شادی کا دن آپہنچا اور میں گدھا.....! سوری دولہا بن کے اپنی دہن لے آیا۔ پھر میں جان بوجھ کر کمرے میں دیر سے آیا۔ کیونکہ مجھے حقیقی معنوں میں اپنی دہن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ خیر جملہ عروسی میں داخل ہوتے ہی میری نظر دہن بیگم پر پڑی۔ جو گھونگٹ الٹائے اپنے پرس سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ آہٹ پر سر اٹھایا۔ جلدی جلدی چیزیں پرس میں ڈالیں اور پھر سے گھونگٹ ڈال کے بیٹھ گئی۔ میرے لیے یہ ساری سچویشن بہت دلچسپ تھی مگر اس وقت میں انجوائے منٹ کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لیے بیڈ پر اس کے برابر بیٹھ کر بادل ناخواستہ میں نے اس کا گھونگٹ اٹھایا کہ اپنی بات اس تک پہنچا سکوں۔ پہلی نظر سرسری تھی دوسری نظر بے ساختہ تھی۔ وہ خوب صورت اور معصومیت کی شاندار مثال تھی۔

”ہیلو!“

”بولیے۔“ پٹ سے آنکھیں کھلیں اور جھٹ سے جواب آیا۔

”آپ کو یہ سن کے شاک لگے گا کہ میں کسی اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“

”اور آپ کو بھی یہ سن کر شاک لگے گا کہ میں بھی کسی اور لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی۔“

”کیا مطلب؟“ میں بے اختیار اچھلا۔

”پھر تم نے اپنے والدین سے کیوں نہیں کہا؟“

”آپ نے اپنی امی سے کیوں نہیں کہا۔“ دوبارہ

جواب آیا۔

”وہ میری بات سننے کو تیار نہیں تھیں۔“

”میرے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔“

”ویسے کون تھا؟“ میں نے کریدا۔

”چائے والا۔“ بڑی اداسی سے جواب آیا بے

اختیار ایک قہقہہ میرے منہ سے نکلا۔ خاصی دلچسپ لڑکی تھی۔

”سنو! تم میری زندگی سے چلی جاؤ تو پھر تمہیں

وہ چائے والا مل جائے گا۔“ میں نے تجویز دی۔

”سچ؟“ اس نے خوش ہو کر کہا۔

”لیکن ایک مسئلہ ہے۔“ وہ یکدم چپ سی

ہو گئی۔

”وہ کیا؟“

”یہ گھر تو میرے نام ہے پھر آپ کدھر جائیں

گے۔“ تب مجھے جھٹکا لگا۔ لڑکی بے وقوف نہیں تھی۔

مجھے بتا رہی تھی۔

”ویسے مسٹر ہزبینڈ ہر مسئلہ ایک بار کے مذاکرات

سے حل نہیں ہوتا۔ آپ کے مسئلے کا بھی کوئی حل نکالتے

ہیں۔ ویسے پاکستان کے مسائل کئی سالوں کے

مذاکرات سے بھی حل نہیں ہوتے۔ بس فکر مت کرو۔

زونیرہ کسی مسئلے کو لمبا نہیں لٹکاتی چٹکیوں میں حل کر

دیتی ہے مگر اس وقت تو مجھے فریش ہونا ہے۔“ اس نے

اپنے بھاری بھر کم لباس کی طرف اشارہ کیا۔

”اور اپنی کچھ پیٹ پوجا کرنی ہے۔“ میں نے

پرس میں چاکلیٹ رکھی تھی۔“ اور مجھے اس کے پرس

ٹولنے کی وجہ سمجھ میں آئی تو ایک بار پھر ہنسی آ گئی۔

”لڑکی ٹیڑھی ہے خیر ارہ بھی کم نہیں ہے۔“ اب

غصے سے نہیں نری سے کام نکلوانا تھا۔ ہلکا پھلکا ڈریس

پہن کر دھلے چہرے کے ساتھ وہ واش روم سے برآمد

ہوئی۔ سادگی میں وہ اور بھی آفت ڈھارہی تھی۔ میں

نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

”سنیں۔“ اس کی آواز پر میں نے اسے دیکھا۔

”پلیز اس جوڑے سے نہیں نکالنے میں میری مدد کریں۔ آخر میں بھی تو آپ کی مدد کروں گی۔ آپ کی خواہش پوری کرنے میں۔ ظالموں نے اتنی نہیں ٹھونکی ہیں۔ جیسے میرا سر نہیں کوئی لکڑی کا ڈبہ ہے۔“ میں نے اس کی مدد کی حقیقت میں بے تحاشہ نہیں تھیں اور وجہ تھے اس کے انتہائی لمبے بال جو گھٹنوں سے بھی نیچے تھے۔ میں نے آج تک اتنے لمبے بال نہیں دیکھے تھے۔ وہ مکمل حسن کا پیکر تھی۔ بالوں کو لاپرواہی سے ہل دیتے ہوئے وہ فریج کی طرف گئی۔ فروٹ اور مٹھائی لے کے واپس بیڈ پر آ گئی۔ میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے اس کی بغور کاروائی دیکھ رہا تھا۔ وہ دھان یان سی لڑکی منٹوں سیکنڈوں میں پلیٹ صاف کر چکی تھی۔

”میرے رب تیرا لاکھ شکر بس مجھے ہر اس نظر سے بچانا جو خفیہ مجھ پر نظر رکھے ہو۔“ اس کی دعا سے میں گڑبڑا گیا۔ دو ٹکے درمیان میں رکھ کے وہ سو گئی اور کچھ دیر کے بعد اس عجیب و غریب لڑکی نما بیوی کے بارے میں سوچتا ہوا نیند کی گہرائیوں میں چلا گیا۔

☆.....☆

ویسے پر میری دلہن کو دیکھ کے ہانیہ مزید ڈسٹرب ہو گئی۔ لگ بھگ تو پری رہی تھی۔ خود میری نظریں اس کے چہرے پر یار بار پھسل رہی تھیں۔ ہانیہ میں تو میری جان بندھی۔ میں اسے ناراض نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر حالات کے پیش نظر اس کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔ مارے باندھے فنکشن ختم کرنے کا انتظار کرنے لگا۔ رات گئے ریسپشن ختم ہوا۔ ہانیہ کے نمبر پر نرائی کیا بند آ رہا تھا۔ اس کا معاملہ صبح پر چھوڑ کر روم میں آ گیا۔ دلہن صاحبہ نبادھو کے کولڈ کریم چہرے اور ہاتھوں پر لگا رہی تھی۔ بلیک کاشن کے سوٹ میں سفید معدے جیسی رنگت لیے اور بالوں کی آبشار لاپرواہی سے ایک طرف ڈالے وہ کسی کا ایمان بھی

ڈمگ کا سکتی تھی اور پھر میں تو اس کا شو ہر تھا اور وہ میری شرعی بیوی۔

”زیادہ گھورنے کی ضرورت نہیں یہ کولڈ کریم میں ماں کے گھر سے لائی ہوں۔ تمہاری طرف سے نہیں ہے۔“ میری نظروں کے مفہوم کی بڑے مزے سے وضاحت دی گئی۔

”خیر سمیٹو یہ سب اور ہٹو بیڈ سے میں اکیلا سونے کا عادی ہوں۔“

”اچھا ہانیہ کے آنے کے بعد بھی۔“ استہزائیہ لہجے میں پوچھا گیا مگر میں نے تکیہ اور چادر نیچے کارپٹ پر پھینکی اور اشارہ کیا وہ شرافت سے اتر کے کارپٹ پر لیٹ گئی۔ میں سکھ کا سانس لیتا بیڈ پر لیٹ گیا۔ ساری لائن آف تھیں۔ ایک گھنٹے بعد اس کے چیخنے پر میں ہڑبڑا کے اٹھا۔ جلدی سے سائیڈ ٹیبل کا لمپ چلایا

”محترمہ! اب کیا مصیبت ہے؟“ میں نے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا جو پاؤں ہاتھ میں تھامے روئے جا رہی تھی۔ میں اٹھ کے اس کے پاس آیا۔

”آخر میری ماں کی چیتا تھی شکایت بھی لگا سکتی ہے۔“ پاؤں پر چھوٹا سا کٹ تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔

”مجھے جو ہے نے کاٹا ہے۔“ زور و شور سے رونے کے درمیان بتایا گیا۔

”مگر میرے کمرے میں تو چوہے نہیں ہیں۔“

”میں جہیز میں نہیں لائی۔“ رونے کے باوجود زبان چل رہی تھی۔

”اچھا چلو بیڈ پر آ جاؤ۔“ میں نے تھکے انداز میں کہا۔ تو وہ بیڈ پر آ کے بیٹھ گئی۔

”مجھے اس زخم پر مرہم بھی لگا دیں اور کوئی الرجی کی ٹیبلٹ بھی دے دیں اور رونے کی وجہ سے میری Energy ضائع ہوئی ہے۔ کچھ کھانے کو

بھی دیں۔“ میں نے ایک نظر کلاک اور کھا جانے والی نظر سے اسے دیکھا جو اپنا فرمائی مینو سنا کے میرا Cell چیک کر رہی تھی۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے۔“

”میں تو صرف ارشد خان کو دیکھنا چاہ رہی تھی کے اچھے اچھے خواب آئیں کنجوس انسان۔“ میں نے موبائل ڈرینگ ٹیبل پر رکھا اور اس کا حکم بجالانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”صرف جوس۔“ وہ جھکی۔

”اب اسی پر گزارا کرو۔ تم فریج میں کچھ چھوڑتی ہو۔“ میں نے امانت پیتے ہوئے کہا۔ نیند سے آنکھیں بے حال تھیں۔

”میرے کھانے پر نظر مت رکھا کریں اللہ تعالیٰ نے اس لیے تو ہمیں نعمتیں دی ہیں کہ جی بھر کے فیض اٹھائیں۔ نہ کہ صرف سونگھو۔“ اس نے مجھے چڑایا تو میں نے شریف شوہروں کی طرح ہتھیار ڈال دیے۔ لیمپ آف کر کے لیٹ گیا۔

”سین! تھوڑا کمبل مجھے دیں۔ شاید زخم سے مجھے بخار ہو گیا ہے۔“

”سانپ نے نہیں کاٹا۔“ میں بڑبڑایا اور کمبل کا کچھ حصہ اسے دے کے میں کروٹ بدل کے سو گیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو محترمہ نہیں تھی۔ سکھ کا سانس لے کے نہا دھو کے باہر آیا تو وہ اماں کے ساتھ مل کر زار و قطار رو رہی تھی۔ گھبراہٹ سے میری حالت تپلی ہو گئی۔ تصور میں اماں کے ہاتھوں اپنی درگت دیکھ رہا تھا۔

”ادھر آؤ ارد! اماں نے سپاٹ لہجے میں پکارا۔ تو دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے میں ان کے پاس آیا۔

”شاید محترمہ نے میری ساری باتیں اماں کو بتا دیں تھیں۔“

”چلو سلی دو دہن کو۔ میں تم لوگوں کے لیے ناشتہ

لگواتی ہوں۔“

”کیا ہوا کیوں رو رہی ہو؟“

”اس بے چاری کا بھولونوت ہو گیا ہے۔“ اماں نے اٹھتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”اوہ..... پتہ نہیں مرحوم کا اس سے کیا رشتہ تھا۔ آج کا سارا دن تجھیز و تدفین میں لگے گا۔ ہانیہ سے ملاقات پھر نہیں ہو پائے گی۔“ مجھے اپنی فکر لگ گئی۔

”تم ناشتہ کر لو پھر چلتے ہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

سوں سوں کرتی وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔ ناشتہ بھی اس نے برائے نام کیا اور ان ہی کپڑوں میں ہی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اماں مہمانوں کی وجہ سے رک گئی تھیں۔

”تمہاری ای کے گھر چلنا ہے۔“ میں نے اس سے پوچھا اور جواب ہاں میں پا کر گاڑی کا رخ سرال کی طرف کر دیا۔

”سمر کتنی بھی مرحوم کی۔“

”یہی کوئی تین مہینے۔“ آنکھیں پھر سے بھر گئیں۔

”خیر اللہ تعالیٰ کی امانت تھی اس نے لے لی۔“

”کہنا آسان ہے سہنا مشکل۔“ بھرائی آواز میں جواب آیا۔ میں نے ٹشو پیپر اس کی طرف بڑھائے شاید اس کا ہتھیجا تھا اور اس کو بہت پیارا تھا۔

”چلو میں بھی حاضری لگا کے ہانیہ سے ملنے چلا جاؤں گا۔ یہ محترمہ تو شاید دو تین دن رہے۔“ دماغ

میں خیالی پلاؤ پکاتے ہوئے میں نے عین اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکی۔ مجھ سے پہلے وہ جلدی سے اتر کے چلی گئی۔ ذہن میں تعزیتی الفاظ ترتیب دیتا

میں گھر کے اندر آیا تو وہ بھابی سے مل کے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ میں نے میت اور مزید لوگ تلاش کرنے چاہے مگر جائے وقوعہ کہیں نظر نہ آئی۔

”ارے ارے! آؤ آؤ۔“ یہ مشفقانہ آواز میری

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤلز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

✓ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

✓ See First
See new posts at the top of
News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

ساس کی تھی۔ میں نے جلدی سے سلام جھاڑا۔ وہ مجھے لے کے ڈرائنگ روم میں چلی آئیں۔
”میں نے کہا بھی تھا کہ اس جھلی کو مت بتاؤ۔ ہنگامہ مچا دے گی مگر ان لوگوں کے پیٹ میں بات کہاں بھرتی ہے۔“

”کیا مطلب۔“ میں نے الجھ کے اسے دیکھا۔
”بیٹا زونی نے تین مہینے پہلے مرغی انڈوں پر بٹھائی تھی۔ اس میں سے ایک ہی چوزا نکلا۔ جس کا نام اس نے بھولورکھا۔ وہ اسے اپنے پاس ہی رکھتی مگر براہوہی کا کہ ہمارا دھیان نہیں تھا اور کل وہ اسے کھا گئی۔“ پتہ نہیں B.P ہائی ہوا تھا یا Low مگر پسینہ میرے پورے جسم سے پھوٹ نکلا تھا۔

یہ پاگللوں کی ملکہ میرے نصیب میں لکھی تھی۔ چائے پی کے میں غصے سے باہر آ گیا۔ رش ڈرائیونگ کے دوران مجھے رہ رہ کے امی پر غصہ آ رہا تھا۔ ہانیہ سے ملنے کا ارادہ ترک کر کے میں اپنے دوست سیفی سے اس کے آفس ملنے چلا آیا۔

”ارے یہ تو کیا منہ اٹھا کے چلا آیا۔ جا گھر میں بیوی کو کہنی دے۔ نئی نئی شاوی ہوئی ہے تمہاری۔ پھر تو وہ ہی زندگی کے دھندے شروع ہو جائیں گے۔“ اس نے مجھے لتاڑا۔ تو مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے جلتے بھینتے اسے قصہ سنایا۔ تو اس کی ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑے۔ خود مجھے بھی ہنسی آرہی تھی۔

”مرحوم کی عمر کیا تھی؟“ سیفی نے میری نقل اتاری۔

”واہ واہ ارہم یزدانی نیشنل بینک میں منیجر کی پوسٹ اور موصوف بیوی کے ہاتھوں الو بن گئے۔“ اب کے اس کی ہنسی میں میری کھسانی ہنسی بھی شامل تھی۔ ہانیہ سے فون کر کے اس نے معافی تلانی کی اور جلد ہی اسے اپنانے کا وعدہ کر کے میں گویا ہلکا بھٹکا ہو گیا۔

شام کو گھر آیا تو وہ اماں کی گود میں سرسبز کے لیٹے تھے۔

اور زور شور سے باتیں جاری تھیں۔
اماں کے پیار پر قبضہ۔ میری جان جل گئی۔ میں پاس آیا۔

”اماں! چائے تو بنوادیں۔ سر میں درد ہے۔“
”میں بنا دیتی ہوں اماں اور میں بھی لی لوں گی۔“ وہ چھلانگ لگا کر اٹھی اور کچن میں چلی گئی۔ میں نے اماں کی گود میں سر رکھا اور صبح والا واقعہ سنایا۔ ہم دونوں ماں بیٹے کی ہنسی پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ رات کو سونے کے لیے لیٹے۔
”سنو!“ اس نے آہستگی سے پکارا۔
”بولو۔“

”آپ کے مسئلے کا حل میں نے سوچ لیا ہے۔“
”وہ کیسے؟“ میں مکمل اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔
میری ہر حس گویا سماعت بن گئی۔

”آپ اماں کے سامنے مجھ سے زیادہ پیار جتائیں زیادہ خیال رکھیں کہ اماں مطمئن ہو جائیں کچھ دنوں کے بعد تو اماں بڑے بھیا اور بھابی کے پاس دئی چلی جائیں گی۔ تو میں جھگڑے کا بہانہ کر کے گھر چلی جاؤں گی اور خلیج لے لوں گی۔“ اس نے بڑے سکون سے کہا میں نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا مگر وہ ہر فکر سے پاک تھا۔ میں نے سر کو جنبش دے کر اس کی بات مان لی۔

☆.....☆

صبح ناشتے کی میز پر میں اماں کے ساتھ اسے بھی ہر چیز سرو کر رہا تھا۔ آفس جانے سے پہلے میں نے اسے آواز دی کے مجھے ٹائی باندھ دو۔ کمرے میں آ کر اس نے ٹائی باندھی میرا سارا سامان دیا اور گیٹ تک آئی۔ تخت پر بیٹھی اماں کا پر سکون چہرہ دیکھ کے میرا دل خوش ہو گیا۔

”والیسی پر میرے لیے گجرے اور گول گے بھی لانا۔“ فرمائش سنائی گئی۔ میں سنی ان سنی کرتا بغیر خدا حافظ کے پورج کی طرف بڑھ گیا۔

”بس آخری آپ بھی میرے ساتھ شہر کریں۔“

چوتھی پلیٹ پر اسے میرا دھیان آیا تھا۔ میں نے بمشکل دوکھائے۔ کڑوے اور کھٹے سے تو میں ویسے ہی پرہیز کرتا تھا۔ مگر وہ جن کی اولاد ساری پلیٹ ہڑپ کر گئی اس کے اصرار پر میں نے گول گپے پیک کروائے اور گھر کی راہ لی۔ راستے میں اس کو گھرے دلائے۔ وہ سرخ ناک اور سرخ چہرے کے ساتھ گجروں کی خوشبو سے لطف اندوز ہوتی رہی اور میں اس کو خوش دیکھ کے خوش سا تھا۔ چہرے پر جھوٹی نہیں سادہ چہرہ خود اپنی خوب صورتی سے بے نیاز میری پاگل سی بیوی خود میں مگن تھی۔

☆.....☆

آفس سے واپسی پر اچانک میرے سر میں سخت درواٹھا۔ تو میں سیدھا گھبرا گیا۔ ہانیہ کزن کی شادی اٹینڈ کرنے اسلام آباد گئی تھی۔ وہ مجھے پندرہ دن دے گئی تھی۔ گھر میں اماں بھی نہیں تھیں۔ زنیہ پڑوس والوں کی تین سالہ بچی کے ساتھ کپ شپ لگا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اماں کدھر ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ آپنی کے گھر گئی ہیں (میری بڑی بہن) صبح آئیں گی۔“

”صبح مجھ سے تو ذکر نہیں کیا۔ سنو ایک کپ چائے بنا دو۔“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے اسے حکم صادر کیا اور لان میں ہی بیٹھ گیا۔ وہ بچی بغور مجھے دیکھ رہی تھی۔

”انکل آپ کے سر میں درد ہے۔“ مجھے کپٹی دباتے ہوئے دیکھ کے اس نے سوال پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”لایئے میں دم کر دوں۔“ وہ بے تکلفی سے میرا سر دبائے لگی اور کچھ پڑھ کے پھونک رہی تھی۔

”کیا پڑھ رہے ہو بیٹا۔“

”میں اللہ اللہ پڑھ رہی ہوں۔ اس سے بندہ

آفس سے واپسی پر میں ہانیہ سے ملنے چلا گیا۔ پارک میں بیچ پر بیٹھے میں اس کے ہاتھ تھامے اسے اپنی محبت کا بھرپور احساس دلارہا تھا۔

”وہ ٹھیک ہے ارہد! مگر تمہاری بیوی بہت حسین ہے اور حسن کے آگے تو بڑے بڑے سورا پاؤں ٹیک دیتے ہیں۔“

”مگر میرے لیے تمہارے علاوہ دنیا میں کوئی حسین نہیں ہے۔ میری محبت اور میری چاہت تو تم ہی ہو۔“ مجھے آج اپنا لہجہ اور الفاظ دونوں کھوکھلے لگ رہے تھے۔ تبھی تو ہانیہ کو بھی کھٹکا لگ گیا تھا۔ خیر ریسٹورنٹ میں چائے پی کے میں نے ہانیہ کو ڈراپ کیا اور گھر آ گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے محترمہ کی فرمائش یاد آئی مگر کوئی بہانہ سوچتا اندر آیا۔ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر اس نے بے اختیار منہ پھلایا اور ساتھ اماں سے شکایت بھی لگادی۔

”اماں میں نے پہلی بار ان سے کوئی فرمائش کی وہ بھی انہوں نے پوری نہیں کی۔“

”ارہد! ابھی بہو کو لے جاؤ اور اسے جو چاہیے دلا دو۔“

”مگر اماں! تھکا ہوا آیا ہوں کل لے جاؤں گا۔“ میں نے احتجاج کیا مگر امی نے ایک نہ سنی اور مجبوراً مجھے اسے لے جانا پڑا۔ گول گپے کی ریڑھی کے پاس میں نے گاڑی روکی۔ شام کا وقت خنسی کے باعث ریش کم تھا۔

”میں ادھر کھڑے ہو کے کھاؤں گی۔“ کہہ کر گاڑی سے اتر آئی۔ میں نے گول گپے کی پلیٹ کا آرڈر کیا۔

”بھائی کھنا زیادہ ڈالنا۔“ اس کی زبان میں پھر کھلبلی ہوئی گول گپے کی پلیٹ منٹوں میں چٹ کر گئی۔ تین پلیٹ کے بعد میں نے اور لینے سے انکار کر دیا۔

اس کی آنکھوں اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔

ٹھیک ہو جاتا ہے۔“ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے وہ میرا سر دبا رہی تھی۔ ایک عجیب سا احساس میرے اندر جاگا۔ اسی اثناء میں زبیرہ چائے کے ساتھ اسٹیکس اور ٹیبلٹ بھی لے آئی۔ ٹیبلٹ لے کے میں روم میں آرام کی غرض سے چلا گیا۔ کچھ وقت کے بعد کسی نے مجھے جگایا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔

”کھانا کھالیں۔ بھوکے پیٹ سونا اچھی بات نہیں ہے۔“ وہ زبیرہ تھی اور اماں کی پرتو لگ رہی تھی۔ میں ہاتھ دھو کے آیا تو وہ کھانا ٹرے میں رکھ کے روم میں لے آئی۔ میں نے نوالہ توڑا۔

”تم نے کھایا۔“

دوسرے دن اماں آگئیں۔ تو وہ اماں سے ایسے لپٹی جیسے اس کی سگی ماں ہو۔

”بس اماں! میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گی۔“

”مگر بیٹی تین دن بعد میری دہی کی فلائٹ ہے۔ میں کچھ عرصہ سرمہ اور بچوں کے ساتھ گزاروں گی پھر عمرہ کر کے واپس آ جاؤں گی تب تک تم مجھے ایک پیارا سا پوتا دے دو گی۔“ اماں نے پیار سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیا تو وہ بری طرح شرما گئی۔

”جو کچھ کہیں چاہیے مجھے بتا دینا۔“

”اماں مدینہ میں وہاں آب زم زم میں دھلے کفن ملتے ہیں۔ میرے لیے وہ لے کے آنا۔“ اس کی انوکھی خواہش پر جہاں اماں تڑپی وہیں میرے ہاتھ سے بھی گلاس ٹوٹ کے چکنا چور ہو گیا اور دل کی کیفیت تو مت پوچھو تین دن اس نے اماں کی خدمت کی خود میرے آگے پیچھے بھی گھومتی رہی۔ سارے گھر کا کام بہت خوش اسلوبی سے سنبھالا تھا۔ اماں اس سے بہت خوش تھیں۔ جاتے جاتے اسے بہت سیاری دعا میں اور مجھے بہت ساری نصیحتیں کر کے گئی تھیں۔ بہر حال اب بس میں آزاد تھا مگر اس گھڑی اور اس ساعت کا انتظار کرنے کے باوجود میرے دل و دماغ پر عجیب سا بوجھ تھا۔

☆.....☆

اماں کو ایئر پورٹ چھوڑ کے میں بلا مقصد گاڑی دوڑاتا رہا۔ موبائل بھی آف تھا اپنی کیفیت سمجھ نہیں پارہا تھا۔ سال کا آخری مہینہ چل رہا تھا۔ خزاں رسیدہ تھے ویران درخت، گہری خاموشی، فضا میں ٹھنڈ اور گرد و غبار اداسی کو مزید بڑھا رہا تھا۔ بے مقصد آوارہ گردی کے بعد میں لوٹ کر گھر آیا۔ میں جیسے گھر میں داخل ہوا زبیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور میرے گلے لگ گئی۔

”کدھر تھے آپ؟ یہاں پاس ہی شدید

”جی۔“ جواب مختصر تھا۔ میں نے تھوڑا سا کھانا کھا کے ٹرے اس کی طرف بڑھائی تو مجھے اس کے دائیں ہاتھ پر پٹی نظر آئی۔

”یہ کیا ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”وہ بے دھیانی میں میرا ہاتھ جل گیا تھا۔“

”اور تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے ناں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور لقمے بنا کے اس کے منہ میں ڈالنے شروع کیے۔ اس کے کھانا کھانے کے بعد میں جا کے ٹرے پکٹن میں رکھ آیا اور پٹی ہٹا کے جلے ہوئے حصے پر برنال لگایا۔

”ویسے میں نے کل رات خواب میں دیکھا تھا کہ چائے والا میرے منہ میں لقمے دے رہا ہے۔“

اس نے مزے سے اپنا خواب سنایا۔

”اب کے تم نے چائے والے کا نام لیا تو منہ توڑ دوں گا تمہارا۔“

”اور آپ نے بھی ہانیہ کے کسی sms کا جواب دیا تو میں آپ کا موبائل توڑ دوں گی۔“ دھمکی دے کر اس نے کروٹ بدلی۔ تو مجھے اس کی بے دھیانی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ گویا ہانیہ سے جیلنس ہے یک گونہ خوشی محسوس ہوئی۔

☆.....☆

لے رکھا تھا۔ رات کو سوتے وقت دونوں نے ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کیا۔ جانے کب سوچتے سوچتے ہم نیند کی آغوش میں جا سوتے۔ رات کے کسی پہر گھٹی گھٹی چیخوں سے ارہد کی آنکھ کھلی۔ زنیہ نیند میں ڈر رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اسے بیدار کیا۔ تو وہ اس سے لپٹ گئی ارہد نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

”اف خواب میں، میں نے ہمیشہ کے لیے آپ کو خود سے بچھڑتے دیکھا۔ اللہ نہ کرے آپ کو میری بھی عمر لگ جائے۔“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

”اللہ نہ کرے تمہاری عمر تمہارے پاس رہے کے تمہارے بعد میں کیا کروں گا۔“ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ باہر بارش ٹوٹ کے برس رہی تھی اور اندر ہم دونوں کے دل ایک دوسرے کی چاہت سے سرشار تھے۔

”ہانیہ۔“ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔
”میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ میں ایک پاگل سی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہوں اور چائے والا۔“ میں نے سرگوشی کی۔

”آپ سے پیارا اور ہینڈ سم نہیں ہے۔“ بے اختیار میں نے تہقہ لگایا۔

”میں نے رات کو کھانا نہیں کھایا۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے مجھے کچھ کھانا ہے۔“ اس نے منہ بسورا۔
”سوری جان ہم آل ریڈی وقت ضائع کر چکے ہیں اور سونے کی ضرورت نہیں کیونکہ سونے تو چھپتے نہیں دوں گا۔ آخر ہمیں اگلے سال خیر سے ای کو ایک پوتا بھی تو دینا ہے۔“ میں نے اسے گرفت میں لے کے اس کے چہرے کو خراج تحسین پیش کیا۔ پہلی مرتبہ شرما کے اس نے میرے سینے میں چہرہ چھپا لیا اور میری دیوانگی بارش سے مقابلہ کرنے لگی۔

☆.....

فائرنگ ہوئی ہے۔ دو گریڈوں کے مابین دونوں گریڈوں کے ارکان شدید تھی ہیں۔ میں بہت ڈر رہی تھی۔ آپ کا نمبر بھی بند آ رہا تھا اور شام کو اکیلے میں بہت ڈرتی ہوں۔“ وہ اتنے قریب تھی کہ سکون میری روح میں اتر گیا تھا۔ کچھ دیر میں خود اسے بانہوں میں لیے کھڑا رہا۔ کچھ ٹائم کے بعد وہ الگ ہوئی تو شرمندہ ہی تھی۔ جھکی جھکی نظروں سے وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے خوف کی وجہ سے میں اب جلدی آ جاتا۔ کبھی سر دبواتا کبھی تیل ڈلواتا۔ کبھی اچھے کھانوں کی فرمائش وہ خوشی سے پورا کرتی۔ اماں سے بھی اسکا پپر روز بات ہوتی۔ ہانیہ کو میں فراموش کر چکا تھا مگر ایک دن آفس سے واپسی پر میں نے اس کا چیک سامان دیکھا تو چونکا۔

”میں کل صبح گھر چلی جاؤں گی۔“ اس نے نم لہجے میں کہا۔ تو خوشی کے بجائے عجیب و غریب احساس نے جگہ لے لی۔ میں اٹنے قدموں گاڑی لے کے باہر نکلا۔ راستے میں ہانیہ کی کال آئی۔ میں نے اس سے بات کی اور فون بند کر دیا۔ کچھ ٹائم میں آسمان کو بادلوں نے گھیرا۔ گھٹا برسنے کے لیے تیار تھی۔ ہر طرف گھورا اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔

”میں ارہد پر دانی ہینڈ سم، گڈ لکنک، تعلیم یافتہ، اچھی پوسٹ، اپنا گھر، بینک بیلنس، گاڑی کیا میں زنیہ کو کسی طرح بھی متاثر نہ کر سکا۔ وہ اپنی حیثیت اور حق کے لیے لڑی کیوں نہیں۔ اتنی آسانی سے میدان چھوڑ کے بھاگ رہی ہے۔“ موٹی موٹی بوندوں نے دھرتی کا رخ کیا تو مجھے اس پاگل سی لڑکی کی یاد ستائی۔ گھر واپسی پر وہ ویسے ہی لان میں بیٹھی تھی۔ روٹی روٹی بھیک بھیک مگر آج وہ پاس نہیں آئی۔ رات کا کھانا دونوں نے برائے نام کھایا۔ ایک دکھ بھری خاموشی نے دونوں کو اپنے حصار میں

www.paksociety.com

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسرا

تھیں جبکہ میرے دماغ میں تو یکدم تیز تیز آنکھیاں
چلنے لگی تھیں، میں نے فوراً گفٹ پیک کر لیا اور تیزی
سے مارکیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔

☆☆☆☆

میں شہلا نواز خان ایک پرائیویٹ نیوز چینل پر
بطور صحافی فرائض سرانجام دے رہی تھی، اپنے ملک کی
خاطر کام کرنا ہمیشہ سے ہی میرے اولین خوابوں میں
سے ایک خواب رہا تھا، پاکستان کے دفاع کے لئے
میں جیسا بھی مشکل ترین کام کیوں نہ ہوتا کرتی اور
میں سوچتی ہوں پاکستان کے ہر باسی کو ایسا ہی ہونا
چاہئے اپنے ملک سے محبت کرنا اس کی عزت کرنا ہم
سب پر لازم ہے کل جو حادثہ ہوا میں اسے حادثہ ہی
کہوں گی مجھے جیسی محبت وطن کے لئے ایک بہت بڑا
دھچکا تھا، اصل میں دیکھا جاتا تو بات کچھ بھی نہ تھی، مگر
میرے لئے بہت کچھ تھی، مجھے ہمیشہ یہی دیکھ کر حیرت
ہوتی ہے اور افسوس اس سے بڑھ کر ہوتا ہے کہ
ہمارے پاکستان میں رہنے والے لوگ پاکستان کی ہی
برائیاں کرتے نظر آتے ہیں جو نقص نہ بھی ہو وہ بھی
ڈھونڈ نکالا جاتا ہے سب ممالک میں پاکستان واحد
ایسا ملک ہوگا جس کے اپنے لوگ ہی اسے تار تار
کرتے نظر آئیں گے میں حیرت زدہ ہوتی ہوں کہ
اپنے گھر سے ہی بیر رکھا جاتا ہے کیا۔

☆☆☆☆

شہلا دوسرے دن آفس آئی تو کافی اداس دکھائی
دی تھی اس کی ساتھی راحیلہ نے وجہ پوچھی تو وہ اسے کل

میں آج چھٹی سے پہلے ہی آفس سے نکل آئی
تھی کیونکہ مجھے آج کسی عزیز کی شادی پہ جانا تھا آفس
سے واپسی پر ہی میں نے گاڑی کا رخ مارکیٹ کی
جانب موڑ لیا، کیونکہ میرا ارادہ تھا اب گفٹ بے کر
ایک ہی دفعہ گھر جایا جائے خیر میں نے گاڑی پارکنگ
میں کھڑی کی اور مطلوبہ اسٹور میں داخل ہو گئی جہاں
ضرورت زندگی کی ہر اشیاء میسر تھیں۔ میں گفٹ سیکشن
کی جانب بڑھ گئی اور گفٹ دیکھنے لگی مجھ سے پہلے
وہاں دو خواتین موجود تھیں شاید وہ بھی گفٹ وغیرہ دیکھ
رہی تھیں میں شوکیں میں سے مختلف قسم کے کرشل پر
نظر دوڑاتی جا رہے تھے کہ کیا پسند کروں اچانک ہی
میری نظر ایک باکس پر پڑی جو کہ ایک کرشل پس تھا
اور دل کی شیب کا بنا ہوا تھا، شاندار بناوٹ کی وجہ سے
وہ مجھے بہت منفرد لگا میں نے اسے اد کے کر کے اٹھایا
اور وہاں سے نکلنے لگی ابھی میں نے اپنا پہلا قدم ہی
آگے بڑھایا تھا کہ اچانک ان دونوں خواتین میں
سے ایک کی آواز نے مجھے روک لیا میں فوراً بچتی تھی۔

”بہن آپ یہ کرشل پس نہ خریدیں، میڈان پاکستان
ہے اور آپ کو پتا ہی ہوگا پاکستان کی چیزیں ناپائیدار ہوتی
ہیں آپ یہ نہ خریدیں دوسرے“ وہ فری بول رہی تھی اور
میں آنکھیں پھاڑے نکر نکر اسے نکتے جارہی تھی۔

”جی یہ کر رہی ہیں آپ ویسے ہی اپنے پیسے
برباد کر رہی ہیں اس سے آگے ایک اور مارکیٹ ہے
وہاں فارن ورائٹی ہے آپ وہاں جائیں ہم بھی وہیں
جارہی ہیں“ وہ دونوں یہ کہہ کر اپنا راستہ ناپ بچتی

کی روداد سنانے لگی راحیلہ یہ سن کر ہنسنے لگی تھی۔

”اوکم آن شہلا! اتی چھوٹی ہی بات پر اداس ہو رہی ہو۔“
”یہ تمہارے لئے چھوٹی بات ہے میرے لئے ہرگز نہیں۔“ شہلا جواباً بولی تھی۔

”شہلا ہمارے ملک کے لوگ ایسے ہی ہیں سونے کے ڈھیر کو چھوڑ کر گند کے ڈھیر سے سونا ڈھونڈنے والے بہت ہی معمولی واقعہ ہے تم جانتی ہو اس سے بڑے بڑے واقعات اس ملک میں رونما ہوتے ہیں۔“ راحیلہ کی صاف گوئی پر شہلا نے سر ہلایا تھا۔

”بات پھر وہیں کی وہیں آ جاتی ہے کہ قصور ہمارے ملک کا نہیں ہمارے ملک کے لوگوں کا ہے دو نمبر چیزیں اپنے ملک کے لئے خود منتخب کرتے ہیں اور پھر خود ہی الزام دیتے ہیں یہ تو کھلا تضاد ہے مگر ہمیں سب کرتے کہتے وقت یہ اندازہ نہیں رہتا کہ یہ سب باتیں ہمارے ملک کو ہی نقصان پہنچا رہی ہیں ہمیں ہی ڈی گریٹ کر رہی ہیں مگر ہم خود ہنستے ہنستے یہ سب نقصان اپنے گلے سے لگا لیتے ہیں شہلا ہم لوگوں کی ذہنیت نفسیات نہیں بدل سکتے ہمارے لوگ فارن کنٹریز کے لئے اتنے کانشس ہو چکے ہیں وہ پاکستان کو اپنی دھرتی ماں کو ان لوگوں کے سامنے تار تار کرنے سے بھی نہیں شرمائیں گے یہ کوئی کمپیوٹر پروگرام یا سوفٹ ویئر نہیں ہے جو بدلا جاسکے یہ ذہن اور نفسیات کی گندگی ہے جو کوئی دوسرا نہیں ختم کر سکتا بشرط جب تک اپنے آپ کو خود ہی اس سے نہ نکالا جائے۔“ راحیلہ کی سچائی زدہ باتیں شہلا کی آنکھیں نم کر گئی تھیں۔

☆☆☆☆

کہتے ہیں ملک کی خاطر مال یا جان کی قربانی دینے تک دریغ نہیں کرنا چاہئے یہ بات سو فیصد درست ہے لیکن اس سب سے پہلے ملک کو عزت و احترام اور مان کی ضرورت ہوتی ہے وہ عزت وہ مان جو اس ملک کے رہنے والے باشندے اس ملک کو دیتے ہیں مگر ہم لوگ دعوے تو اتنے بڑے بڑے

کرتے ہیں پر عمل ندارد۔

ہم اپنے ملک سے محبت بھی اپنے مطلب کی خاطر مفاد کی خاطر کرتے ہیں جہاں مطلب مفاد پورا ہو وہاں ہم اپنی اوقات دکھا دیتے ہیں پر اصل میں ہم یہ سب نہیں جانتے کانٹوں بھری خاردار منزل ہی ہمارا مقصد رہنمائی ہے۔ شہلا آج راحیلہ کے ساتھ شاپنگ کرنے بازار آئی تھی سردیوں کی آمد آمد تھی اس لئے موسم کی مناسبت سے کپڑے خریدنے کا ارادہ تھا وہ دونوں ”آئیڈیاز“ میں ابھی داخل ہوئی تھیں کہ شہلا کو اس دن والی دونوں خواتین نظر آ گئیں اس نے راحیلہ کو اشارہ کیا تھا۔
”چلو آج میں بھی ان سے ملاقات کرتی ہوں۔“ راحیلہ یہ کہتی شہلا کے پیچھے ہوئی۔

”السلام علیکم! ارے آپ.....“ شہلا نے سلام کرنے کے بعد حیرت کا مظاہرہ کیا تھا۔

”اوہ..... میں آپ.....؟“ پہلی والی بولی۔

”جی ٹھیک شاپنگ کر رہی ہیں کیا؟“ شہلا نے پوچھا۔

”ہوں..... یہاں ورائٹی کالی اچھی ہے۔“

”جی بر Ideas تو میڈ ان پاکستان ہے تو پھر آپ یہاں کیسے؟“ شہلا آخر اسکرالی تھی۔

”جی وہ.....“ وہ دونوں یکدم گڑبڑائیں۔

”آپ کو Puma Addaise Nick کی شاپس پر جانا چاہئے آپ کو تو فارن کنٹری کی ورائٹی پسند ہے پاکستان کی ٹیگ والی چیزیں تو نا پسند آ رہی ہیں۔“ شہلا نے کہا تو وہ دونوں سر جھکا کر رہ گئیں۔

شہلا واپس پلٹی تھی پھر اچانک رک گئی۔

”ہمارے پاکستان کی چیزیں دو نمبر نہیں ہم لوگوں کی سوچ دو نمبر ہے۔“ شہلا یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی جہاں راحیلہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ آج اس کا دل مطمئن سا ہو گیا تھا کیونکہ آج اس نے پاکستان کے دفاع کے لئے اپنا حصہ پیش کیا تھا۔ پاکستان کی عزت حرمت مان پر آج نہ آنے دینا ہی تو پاکستان کے دفاع میں شامل ہے۔

☆☆.....☆☆

www.PAKSOCIETY.COM

214 دسمبر 2016ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY

FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1

f PAKSOCIETY

کدیرۃ عبرت نگاہ

روبینہ کے کہنے پر اس نے سر اثبات میں ہلا کر تخت پر پھلے کپڑوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھنا شروع کیا تھا۔
”ریڈی میڈ لے لیتیں یا کسی ٹیلر سے بنوا لیتیں اب تو ہر جگہ اچھے سے اچھا ٹیلر مل جاتا ہے اتنے پیسے کس لئے



دیئے ہیں کہ تم لوگ خود کو نہ تھکاؤ، مگر تم لوگ رہو گی وہی کنویں کے مینڈک۔“ وہ خفا ہو کر بولا۔ تینوں خواتین اس کی محبت و فکر پر خوش ہو کر مسکرائیں تھیں۔

”کرلی ناں تم نے اپنی سی اس معصوم اور شریف بچی کے سر خود کو مسلط کر ہی لیا“ اللہ کی آہ سے ڈرو اکبر! کتنا منع کیا تھا مگر تم میری مانتے ہی کب ہو سب کاں کھول کر سن لو اس گھر میں کوئی بارات نہیں اترے گی، میں ایسی زبردستی کی شادی نہیں ہونے دوں گا، نکل جاؤ میرے گھر سے غنڈے۔“ سلطان صاحب کمرے سے نکل کر سب سے گویا ہوئے اکبر کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

”اس بچی نے خود بھری مجلس میں مجھ سے شادی کرنے پر حای بھری تھی، اماں بھی گواہ ہیں پوچھ سکتے ہیں“

قسط نمبر 4



رہی یہاں سے نکلنے والی بات تو میں یہاں صرف اپنی ماں بہنوں کی وجہ سے ہوں یہاں صرف آپ رہتے تو کبھی دو منٹ بھی آپ کی صورت دیکھنے نہ آتا۔“ اکبر بھی دو بدوڑھٹائی سے گویا ہوا تھا۔

”باپ سے بات کرنے کا یہ طریقہ ہوتا ہے نا بنجار میں نہیں بخشوں گا تو جہنم میں جاؤ گے مردود۔“ وہ کف اڑاتے ہوئے۔

”ہونہہ..... مجھے آپ کی بخشش کی کوئی ضرورت نہیں میرے لئے میری ماں ہی کافی ہے آپ سے اچھی ہے کم از کم مجھ سے نفرت تو نہیں کرتی۔“ وہ باپ کے مقابل آکھڑا ہوا۔

”بہت پچھتاؤ گے تم میرا دل تو اس بچی کو سوچ کر تڑپ اٹھتا ہے جسے جانے کس طرح ڈرا دمکا کر تم نے اس شادی کے لئے مجبور کیا ہوگا، ورنہ وہ کسی طور تمہارے قابل نہیں تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔“ وہ دکھ سے بولے۔

”ہونہہ..... اکبر نے بڑے بڑوں کو پچھتانے پر مجبور کیا ہے مگر خود کبھی نہیں ہوا۔“ وہ نخوت سے بولا۔

”اللہ کی لائیں بے آواز ہے ڈھیل کو اپنی طاقت مت سمجھو۔“ وہ تاسف سے بولے۔

”مجھ پر یہ باتیں اثر نہیں کرنے والیں میں بہت خوش ہوں چند دن میں دولہا جو بننے والا ہوں آپ کی بہنو کو لے کر آؤں گا۔“ وہ انگریزی لیتا مزے سے بولا۔

”کاش..... تم پیدا نہ ہوئے ہوتے۔“ وہ دکھ سے کہہ کر پلٹے اور باہر کی طرف جانے لگے۔

”ابا میری شادی میں تو شرکت کریں گے نا؟“ وہ پیچھے سے مسکراتے لہجے میں ان کا دل جلا گیا۔

”مجھ سے یہ توقع مت رکھنا۔“ وہ بغیر مڑے ہوئے تھے۔

”کاش آپ آجاتے دیکھتے کہ اکبر کیا شے ہے ایسی دھوم دھام سے میری شادی ہوگی کہ لوگ پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہ جائیں گے۔“ وہ باپ کو دروازے سے نکلتا دیکھ کر قہقہہ لگاتے بولا۔ وہ ماں کی بہت پلٹا تینوں کے چہرے باپ بیٹے کی چپقلش سے اتر گئے تھے۔

”کیا ہوا کیوں ایسی رونی صورتیں بنائی ہیں شادی کی تیاری کرو خوش خوشی۔“ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بے فکری سے بولا۔

”اپنے باپ سے اتنی بدتمیزی مت کیا کرو تمہارے بھلے کے لئے کہتے ہیں۔“ روبینہ نے اسے سمجھانا چاہا۔

”جہیں ہے میرا کوئی باپ مجھے سمجھتیں مت کریں۔“ وہ غصہ ہوا اور سر جھٹکتا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا وہ تینوں دکھ کے گہرے دلدل میں اتر گئی تھیں۔

پیلے جوڑے میں پھولوں کے زیورات پہنے بچی بنی حرم کی آنکھیں آنسوؤں سے جو جھل ہو گئیں خاموشی کے اس طویل وقفے میں ایئر پیس سے ابھرتے شور اور مہندی کے گانوں کی دھوم نے فرحان کے زخم ہرے کئے تھے۔

”کاش یہ خوشی کے شادیانے حرم کی زندگی میں اس کے حوالے سے نہجئے، اکبر کی جگہ فرحان ہوتا!“ زبیدہ نے جب اس سے کہا تھا کہ حرم نے خود اکبر سے شادی کا اظہار کیا ہے تو اسے ذرا بھی یقین نہ آیا دو تین دن تو خود کو سمجھانے میں گزرے کہ یہ اچانک سے کیا ہو گیا تھا اس کی زندگی میں پہلے بھی کوئی رونق نہ تھی مگر اب تو ہر سو ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

”تم خوش تو ہو؟“ حرم کی سمت سے خاموشی محسوس کر کے اس نے بہت تکلیف سے پوچھا تھا۔

”وہ اب حرم سے کبھی آپ کہہ کر مخاطب نہیں ہوگا اسی آپ نے تو اسے میری زندگی سے دور کر دیا“ کاش میں محبت کا اظہار کر دیتا۔“ حرم کے آنسو بہنے لگے انگلیوں کی گرفت ریسور پر سخت ہو گئی بہت مشکلوں سے اس نے اپنی ہچکیوں کو کنٹرول کیا تھا۔

”میں بھی کتنے عجیب سوالات کر رہا ہوں ظاہر ہے تمہاری شادی ہے خوشی تو ہوگی ہی ٹھیک ہے تم انجوائے کرو اور ہو سکے تو اپنے فرحان بھائی کو..... اپنی خوشیوں میں تھوڑا سا یاد رکھ لینا۔“ فرحان کی آنکھیں نم ہوئیں اس نے فون شیخ دیا تھا۔

حرم نے فون رکھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا اسے آج ابو اور فرحان بے تحاشہ یاد آ رہے تھے زندگی سے ایک خواہش کی تھی وہ بھی نہ مل سکا اسے اپنی خواہشوں کا اظہار کرنا نہیں آتا تھا ایک اکبر تھا جو بار بار آ کر اسے ڈسٹرب کرتا خود کو اس پر مسلط کئے رکھتا ہر شے سے نفرت محسوس ہو رہی تھی کوئی اپنا نہ تھا جو اس کے دل کا حال جانتا یا آنکھوں کی اداسی کو پڑھتا جو تھا وہ بہت دور بیٹھا تھا۔

”تم یہاں ہو وہاں تمہارا سب انتظار کر رہے ہیں۔“ سعدیہ تیار ہوئی بہت اچھی لگ رہی تھی حرم نے جلدی سے منہ پھیر کر آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔

”تم روئی ہو؟ کیا ہوا؟ فرحان بھائی نے کیا کہا؟“ وہ چونکی۔

”کچھ نہیں۔“ حرم نے قدم بڑھائے۔

”ہوں..... تو فرحان بھائی سے کیا بات چیت ہوئی؟“ اکبر کی آواز پر جہاں حرم ساکت ہوئی تھی وہاں سعدیہ بھی ڈر گئی۔ اکبر نے سر جھکائے سرخ روئے چہرے والی حسین ی حرم کو دیکھا۔

”بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔“ وہ فرحان کا ذکر بھول گیا سعدیہ کو وہاں رکنا مناسب نہ لگا وہ خود ہی چلی گئی۔

”تم روئی ہو؟“ وہ چونکا۔

”فرحان نے ایسا کیا کہا کہ تم رونے پر مجبور ہو گئیں کہیں تم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تو نہیں اور میں درمیان میں آ گیا۔“ وہ کچھ قدم آگے آتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا۔ حرم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”جو بات ہم دونوں نے کبھی خود سے بھی نہیں کہی کیسے اک بیل میں اس نے بے باکی سے کہہ دی۔“

”کیا ہوا؟ سچ تو نہیں کہہ دیا میں نے؟“ اکبر نے اس کے سامنے چٹکی بجا کر بیٹھی بھائی۔ حرم جیسے ہوش میں آ کر دو قدم پیچھے ہوئی خوف نے سرے سے عود کر آیا اکبر جب ایک بات کے پیچھے پڑ جائے تو اٹکوا کر ہی دم لیتا ہے۔

”ا..... ایسی..... کک..... کوئی بات نہیں۔“ اگر جواب نہ دیتی تو تمام عمر نہ بخشتا خوفزدہ ہونے کے باوجود اس نے جواب دے دیا۔

”ایسی کوئی بات ہوتی بھی تو تمہارا فرحان..... بھائی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔“ وہ استہزاء سے ہنس کر بولا۔

”حرم بھی کہاں ہو جلدی آؤ۔“ زبیدہ بھی خوب تیار ہو کر وہاں آئی تو حرم کے پاس اکبر کو دیکھ کر چونک گئی تھیں۔

”تم..... کیوں آئے ہو؟ صبر نہیں ہوتا جانتے بھی ہو ہمارے ہاں کی مہندی میں عورتوں کے سوا کوئی مرد نہیں آتے عورتوں کی تقریب ہوتی ہے۔“ انہوں نے بغیر ڈرے کہا اور حرم کو پکڑ کر ساتھ لے گئیں۔

”مجھے بھی آپ کے ہاں بیٹھنے کا شوق نہیں حرم کو دیکھنے آیا تھا۔“ اس نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی۔

☆☆☆☆

”اماں کتنے مہنگے اور قیمتی ملبوسات ہیں یعنی کہ حرم کے لئے ہی نہیں ہمارے لئے بھی اہتمام واہ حرم تو بہت قسمت والی نکلی اکبر بھائی کتنی محبت کرتے ہیں اس سے شادی کی خوشی میں ہم سب کو بھی مہنگے مہنگے لباس اور جیولری جو تے وغیرہ بھی بھجوا دیئے ہمیں خود سے بازار جا کر ایب کچھ نہیں لینا پڑے گا۔“ سعدیہ اکبر کے بھجوائے قیمتی ساز و سامان کو دیکھ کر مبہوت تھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی قیمتی اشیاء ان کے لئے ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رواڈ انجسٹ 219 دسمبر 2016ء

f PAKSOCIETY

ہی نہیں دیا تھا۔

”ہیلو“۔ انہوں نے ریسنور کان سے لگایا۔

”ہاں خالہ! حرم کوفون دو“۔ دوسری طرف سے اکبر کی مطمئن خوش باش سی آواز ابھری۔

”ہیں..... باؤ لے ہو رہے ہو کیا آج کی رات ہے درمیان میں کل حرم تمہارے گھر آ جائے گی؟ کیوں بچی کو پریشان کر رہے ہو جانتے بھی ہو تم سے ڈرتی ہے بات کیا کرے گی وہ بہت اداس ہے بچیاں اسے مہندی لگا رہی ہیں وہ نہیں آ سکتی“۔ زبیدہ نے خوب لیکچر دیا۔

”میں کوئی بلا ہوں جو مجھ سے ڈرتی ہے اچھا خاصہ ہوں اور ہاں اس سے کہہ دیں اب یہ ڈر اور شرم چھوڑ دے اب تو وہ میری بیوی بننے والی ہے“۔ اکبر پر کہاں اثر ہوتا تھا جھٹ بتا دیا۔

”ڈر ادھمکا کر اسے شادی کے لئے راضی کیا ہے بچی ڈرے گی نہیں تو کیا کرے گی؟ کچھ دن تو لگیں گے یہ سب کچھ قبول کرنے میں“۔ زبیدہ افسردہ ہوئیں۔

”کیا ہوا خالہ؟ بہت مروڑا ٹھہر رہے ہیں حرم کے لئے حالانکہ سب سے زیادہ وہ تمہارے عتاب کا نشانہ بنتی رہی ہے“۔ حلق کا کاٹا ٹھنسی وہ تمہارے“۔ اکبر بے باکی سے بولا۔

”میرا نام مت ضائع کر دبا تمیں بگھارنا تو کوئی تم سے سیکھے“۔ زبیدہ نے فون بند کر دیا اور کچن میں چلی آئیں۔

”پھر سے فون بجنے لگا“۔ اب کے سیماب اٹھی تھی۔

”ہیلو“۔

”ہاں سیماب بیٹا! حرم کوفون دو“۔ اکبر کی خوشی سے معمور آواز ابھری تھی۔ اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ جمایا اور منہ ہٹا کر لڑکیوں کو ادنیٰ آواز سے مخاطب کیا۔

”لڑکیوں دو لہا بھائی کافون ہے کہہ رہے ہیں میری حرم سے بات کروادو“۔ اس کی بات پر کسی نے ڈیگ بند کر دیا اور نو جوان لڑکیاں فون کے ارد گرد جمع ہو کر کان لگانے لگیں۔

”اکبر بھائی وہ حرم تو نہیں آ سکتی“۔ وہ حرم کو دیکھتے شرارت سے بولی۔

”کیوں پاؤں میں مہندی لگائے بیٹھی ہے کیا؟“ وہ جل کر بولا لڑکیاں کھی کھی کر کے منہ پر ہاتھ رکھے ہنسنے لگیں۔

”جی پاؤں اور ہاتھ دونوں پر مہندی لگا رکھی ہے“۔ وہ دو بدو بولی۔ حرم کے آس پاس بیٹھیں اکبر کی بہنیں اور دیگر لڑکیاں بھی ماحول میں دلچسپی محسوس کر کے سیماب کی سمت متوجہ ہوئیں۔

”فون دو نہیں تو میں وہاں آ کر مل لوں گا“۔ اس نے دھونس بھری دھمکی دی۔ سیماب نے پھر سے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا۔

”کیا کہہ رہے ہیں؟“ سب کورس میں دلچسپی سے بولیں۔

”فون دو نہیں تو یہاں آ کر حرم سے مل لیں گے“۔ سیماب کی بات پر ہنسی کا طوفان اٹھ پڑا کہ اللہ اللہ۔

”اوہو“۔ ہر طرف سے حرم کو نشانہ بنایا جانے لگا وہ بیچاری رو ہاںسی ہو گئی۔

”اچھا اکبر بھائی! اگر آپ سے اک رات بھی صبر نہیں ہو رہا تو اک کام کرتے ہیں میں حرم سے پوچھتی ہوں اگر وہ مان گئی تو فون دے دوں گی“۔ سیماب شرارت سے بولی۔

”وہ انکار نہیں کرے گی“۔ اکبر بہت مان سے بولا۔ دراصل اپنی طاقت پر اعتماد تھا حرم کبھی بھی اس کی بات سے انکار نہیں کر سکتی۔ لڑکیاں پھر ہنسنے لگیں سیماب نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر حرم کو مخاطب کیا۔

”حرم اکبر بھائی کہہ رہے ہیں آکر مجھ سے بات کرو۔“
 ”میں..... نن..... نہیں..... بھلا میں کیا..... کہوں گی؟“ وہ روہانی ہو گئی۔
 ”جادو ناں بات کرو کتنے پیار سے بلا رہے ہیں۔“ لڑکیاں چھیڑنے لگیں۔ وہ رونے لگ گئی سب کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

”اکبر بھائی! آپ نے حرم کو زلا دیا ناں میں فون بند کر رہی ہوں اب مت کیجئے گا۔“ اس نے فون بند کر دیا ساری ہستے ہوئے بیٹھ گئیں ڈیگ پھر سے لگ گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ صحن سے کچھ لڑکیاں شور مچاتی آئی تھیں۔
 ”دولہا بھائی تو سچ بچ آ گئے۔“ حرم کے ہاتھ پیر پھول گئے دوپٹہ سر سے سرک کر گود میں پڑا تھا وہ مہندی کی وجہ سے گھٹنوں کو کھڑا کئے اس پر کہیاں نکائے بیٹھی تھی۔

”میرا دوپٹہ۔“ اس کی منمنائی سی آواز سن کر سیما ب نے آگے بڑھ کر دوپٹہ اس کے سر پر اوڑھنے کی بجائے گھونگھٹ کی طرح اوڑھ دیا یوں کہ پورا چہرہ چھپ گیا۔
 ”یہ کیا؟“ کورس میں پوچھا گیا۔

”ہم آج کی رات دولہا بھائی کو حرم کا چہرہ نہیں دیکھنے دیں گے، بھی تھوڑا سا تنگ کرنے کا تو حق ہے ناں؟“ اس نے آخر میں اجازت طلب نظروں سے اکبر کی بہنوں کو دیکھا اور چاروں سر اثبات میں ہلاتے متفق نظر آئیں۔
 ”یا ہو۔“ ان کی اعلیٰ ظرفی پر نعرہ پڑا تھا۔ اکبر نے لاؤنج میں داخل ہو کر ڈھیروں لڑکیوں میں سے حرم کو تلاش نظر اک جگہ گھونگھٹ میں چھپی ہاتھوں بیروں پر مہندی لگائے بیٹھی اک لڑکی پر بڑی وہ پہچان کر مسکراتا آگے بڑھا کہ تنگ کر رک جانا پڑا۔ لڑکیاں اس کا ارادہ بھانپ کر حرم کے گرد دائرہ بناتی بیٹھ گئیں۔

”ایک بار کہتا ہوں ہٹ جاؤ دوسری بات میں بات نہیں کرتا“ محلے کا بچہ بچہ میرا اصول جانتا ہے۔“ اکبر کو تپ چڑھنے لگی۔
 ”پلیز اکبر بھائی! آج کی رات تو ذرا سا مسکرا دیں، غصہ تو ساری زندگی آپ کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔“ سیما شوخ ہوئی۔

”تھیں بہت باتیں کرنا آ گئی ہیں۔“ اکبر مسکرایا جو گھبرائی ہوئی بیٹھی تھیں اب وہ بھی مسکرانے لگیں۔
 ”میں تو اپنی دلہن کو دیکھنے آیا تھا کیا یہ ساری رات ایسے ہی بیٹھی رہے گی؟“ اکبر نے حرم کو دیکھا۔ اس کی بات پر کچھ لڑکیاں کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں کچھ شرارت سے کھنکارنے وہ سر پر ہاتھ پھیرتا رہ گیا۔
 ”آج رات دیکھنے پر پابندی ہے ویسے بھی کل دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔“ فلک نے بھی اس پر لطف ماحول میں اپنا حصہ ادا کیا چاروں بہنوں نے تائید میں سر ہلایا اکبر اس طرح پارٹی بدلنے پر بہنوں کو گھورتا رہ گیا انہوں نے لا پرواہی سے کندھے اچکا دیئے۔ کسی نے پھر سے ہلکے سروں میں گانے لگا دیئے تھے۔

”بیٹھے ناں دولہا بھائی۔“ ایک شرارتی سی آواز آئی لڑکیاں تمام بیٹھ چکی تھیں اکبر کو بھی بیٹھنا پڑا۔
 ”ویسے دلہن ماہتاب ہے تو دولہا آفتاب ماشاء اللہ کیا جوڑی بنی ہے۔“ مجھے میں سے پھر کھٹکی آواز ابھری قہقہوں کا سلسلہ پھر سے اٹھ پڑا۔ گھونگھٹ میں چھپا حرم کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا یہ سب کچھ تو اس نے سوچا تک نہ تھا اب وہ کل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اکبر کی ہو جائے گی اب تک وہ اسے زچ کرتا رہا تھا پھر تو کھلی چھوٹ مل جائے گی اس نے خود کو اکبر کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر بار بار قدم لڑکھڑا جاتے کوئی ناں تھا جس کی مدد لے کر وہ اس ماحول سے دور بھاگ جاتی۔

”حرم کی مہندی تو بہت خوبصورت ہے۔“ اکبر مسلسل گھونگھٹ سے باہر مہندی سے سجے نازک دودھیا ہاتھ پاؤں کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ کہیں تو آپ کو بھی لگا دیں؟“ فلک چہکی۔

”تو پھر لگا دو۔“ اکبر نے ہتھیلی سامنے کی تھی لڑکیاں ہنسنے لگیں، فلک کھسیانی ہو گئی۔

”میں نے تو مذاق کیا تھا۔“ اسے مذاق مہنگا بڑ گیا کیونکہ اکبر ایک یار جو کہہ دیتا وہی کرتا۔

”مگر میں مذاق نہیں کر رہا۔“ وہ سنجیدہ تھا، ہتھیلی اب بھی پھیلی ہوئی تھی۔ لڑکیاں چپ تھیں۔

”سانپ کیوں سونگھ گیا سب کو حرم کو جس نے مہندی لگائی ہے وہ آ کر میری ہتھیلی پر ایک پھول بنائے۔“

اب کے وہ ذرا غصے سے بولا۔ مہندی والی دو لڑکیاں خوفزدہ ہو گئیں، محفل میں مزہ لینے اور اکبر کے قریب جا کر

اسے مہندی لگانے میں بہت فرق تھا اگر گھر والوں کو بھگ بھی پڑ جاتی تو ان کی خیر نہ تھی آخر کو وہ محلے کا بد معاش تھا۔

”کرن آ کر دو لبہا بھائی کے ہاتھ پر پھول بنا دو، اندر حرم کا نام بھی لکھ دینا۔“ سعدیہ مسکرائی۔

”حرم سے محبت اپنی جگہ، مگر اب اتنا بھی زن مرید نہیں کہ بیوی کا نام ہتھیلی پر لکھوا لوں۔“ جلال پھر غود کر

آیا۔ لڑکیاں کرن کو اٹھنے پر اکساتی رہیں، اکبر منتظر سا اسے دیکھ رہا تھا، ناچار اٹھنا پڑا، اکبر کا کیا بھروسہ فائر نہ

چلا دیتا ای ڈر سے اٹھی اور کچھ دوری پر آ بیٹھی۔ اکبر نے ہتھیلی پھیلا کر ہاتھ دراز کیا دونوں ہاتھوں سے کون

پکڑے بغیر اس کا ہاتھ چھوئے مہندی لگا رہی تھی۔

”اکبر بھائی کے سامنے اتنی خوبصورت لہن بیٹھی ہے کرن، اب تم پر نظر نہیں پڑنے والی، ریلیکس ہو کر

لگاؤ۔“ کسی نے پھر شرارت سے جملہ داغا۔ سب کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں کرن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شاید شرم غصے یا

خوف سے، اکبر نے اس کے سر پر دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔

”ڈرو نہیں، ان کو یوں لے دو، تم میری بہن ہو، بالکل فلک کی جیسے۔“ وہ مسکرایا کرن کو ڈھارس ملی۔

”اکبر بھائی تو بہت اچھے ہیں لوگوں نے خواہ مخواہ ان کو برا مشہور کر رکھا ہے۔“ وہ بہت متاثر ہوئی تھی۔ کچھ

ہی دیر میں زبیدہ اور خاندان و محلے کی دیگر بزرگ خواتین بھی لاؤنج میں چلی آئیں، اکبر تو کچھ دیر میں

چلا گیا لڑکیوں نے آدھی رات تک ادھم مچائے رکھا تھا۔

☆☆☆☆

آخر وہ گھڑی آ پہنچی جس کا اکبر اور اس کے گھر والوں کو بے صبری سے انتظار تھا۔ اکبر نے حرم اور اپنے لئے

ڈیزائنر سے بہت مغز ماری کے بعد اپنی پسند کے سوٹ اور جوتے، جیولری بنوائے تھے، حرم آج شہزادی لگ رہی

نئی بایوکلر کے لائنگ کا میض شلوار کے ساتھ آف دہانٹ جھلملاتے دوپٹے اور موتیوں والے سفید و آف

دہانٹ جیولری میں مہندی لگائے بغیر میک اپ کے وہ بے تحاشہ حسین لگ رہی تھی۔ اکبر بھی آف دہانٹ شیروانی

میں ہمرنگ کھسے بنے، نواہز ادھ لگ رہا تھا۔ نکاح اور رخصتی کے اس موقع پر ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، نکاح کے وقت

حرم بہت رو رہی تھی اکبر کے اندر ابال اٹھ رہے تھے جی چاہ رہا تھا پستول نکال کر اتنے فائر کرے کہ حرم کا دم نکل

جائے، اشفاق صاحب اس کے رونے کو سعید صاحب کی یاد پر محمول کر رہے تھے، مگر زبیدہ رو بینہ اور دیگر اس کا

رونا خوب جانتے تھے۔ بالآخر اس نے دستخط کر دیئے، نکاح ہو گیا، اکبر نے کچھ ڈانس کا پروگرام بھی منعقد کروایا

تھا، ڈانس شروع ہو گیا حرم اب بھی وقفے وقفے سے رونے لگتی۔ حرم کا چہرہ آدھا گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا، وہ رو

رہی تھی جبکہ اکبر اس کے پہلو میں سرشار سا بیٹھا کبھی تالیاں بجانے لگتا، کبھی سیٹیاں، کبھی ہاتھ اٹھا کر ہوا میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ مجھے 223 دسمبر 2016ء

لہرانے لگتا وہ بہت خوش تھا۔
 حرم کا دل پھٹنے کو تھا بے آواز اشک بہہ رہے تھے ایک آدھ بار کی لہجی کو اکبر نے بھی سنا تھا مگر وہ ہنس رہا تھا گا
 رہا تھا بیٹھے بیٹھے ہاتھ اٹھا کرنا جنے لگا۔
 ”مشکل اشکوں کو چھپانا لگتا ہے
 وہن کا تول دیوانہ لگتا ہے
 پلی بھر میں کیسے بدلتے ہیں رشتے
 اب تو ہر اپنا بیگانہ لگتا ہے
 میں تیری بانہوں کے جھولے میں پلی بابل
 جارہی ہوں چھوڑ کے تیری گلی بابل
 خوبصورت یہ زمانے یاد آئیں گی
 چاہ کے بھی ہم تمہیں ناں بھول پائیں گی
 ضبط کا دامن چھوٹ گیا حرم ٹپ ٹپ کر رونے لگی۔ باپ کے ساتھ گزرا ہر پلی یاد آنے لگا تھا اکبر کو اس
 کے دوست ڈانس کے لئے اشارے سے بلانے لگے تھے۔
 اکبر اب اٹھ کر ہاتھ آگے کئے حرم کو بھی اٹھنے کا کہہ رہا تھا تا کہ ساتھ رقص کر سکے مگر وہ تو اپنی افتاد میں گم تھی
 ایک ٹک اکبر کے بڑھے ہاتھ کو سراٹھا کر بہتی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔
 ”اٹھو۔“ وہ تھوڑا سا جھکا۔ حرم کی نظروں میں اکبر کے ہاتھوں مرتے سعید صاحب کا ٹپا وجود گھومنے لگا۔ وہ
 اٹھی اور اس کے بڑھے ہاتھ کو نظر انداز کر کے دوسری طرف سے بھاگتی ڈریسنگ روم کی طرف گئی تھی۔ اکبر اپنے
 خالی ہاتھ کو دیکھ کر سنائے میں رہ گیا تھا اتنی سبکی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا حاضرین کی طرف اس کی پشت تھی مگر اسے
 سب خود پر منتے محسوس ہوئے تھے۔ شاید دل میں چور تھا اسی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی محسوس کر گیا۔
 ”بیٹھو اکبر! بچی کو ماں باپ یاد آگئے ہوں گے یہ وقت بہت مشکل ہوتا ہے تم بیٹھو میں چپ کروا کے لاتی
 ہوں اسے بیٹھو۔“ زبیدہ نے ماحول کی نزاکت محسوس کر کے حالات سنبھالے تھے زبیدہ تیزی سے اندر آئی تھیں
 حرم شیشے کے سامنے کرسی پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔
 ”حرم..... یہ کیا بچپنا ہے اکبر کو تم جانتی ہو اگر میں ناں سنبھالتی تو طیش میں آ کر جانے کیا کر بیٹھتا۔“ وہ
 ناگواری سے ڈانٹتے ہوئے بولیں۔
 ”اٹھو شہاباش! مہمان منتظر ہیں کھانے میں تھوڑی دیر ہے پھر رخصتی کا شور اٹھے گا چلو بری بات حرم اٹھو۔“ وہ
 نری سے کہتیں پاس آئیں تھیں۔
 ”چچی! مجھے نہیں جانا چچی مجھے بچالیں میں اکبر کے ساتھ نہیں جانا چاہتی وہ بہت ظالم ہے۔“ وہ ان سے
 لپٹ کر بہت شدتوں سے رونی کہہ رہی تھی۔
 ”بچوں والی باتیں نہ کرو اچھی طرح سے جانتی ہو کہ ایسا ممکن نہیں تمہارا نکاح ہو چکا ہے اب ایسا سوچنا بھی
 مت خود کو سنبھالو اور چلو میرے ساتھ۔“ انہوں نے سمجھایا۔
 ”کیا ہوا بچی ٹھیک تو ہے ناں؟“ روبینہ کے ساتھ خاندان کی دیگر عورتوں بھی سن گن لینے آن پہنچی انہی میں
 سے ایک نے پوچھا تھا۔

”تین مہینے پہلے باپ کا انتقال ہوا ہے یاد آگئے ہوں گے بچاری کی ماں بھی نہیں اسی لئے اداس ہے۔“
 روبینہ نے بروقت مداخلت کر کے ان کی زبانیں بند کروائیں۔ سمجھا بجھا کر اسے اٹھایا گیا رخصتی کے وقت بھی وہ
 اشتاق صاحب کے سینے سے لگی بہت روئی تھی۔

☆☆☆☆

”حرم! جلدی ناشتہ لاؤ“ مجھے نکلنا ہے ایک تو یہ جانے کس کے خیالوں میں رہتی ہے بیٹھے بٹھائے سو جاتی
 ہے۔ اکبر نے کچن کی طرف دیکھ کر اونچی آواز میں کہا اور پاس بیٹھی ماں کو جھنجھلا کر دیکھا۔
 ”اسے یہ بات کھٹک رہی تھی کہ حرم نے پہلے سلطان صاحب کو ناشتہ دیا تھا جو اب انہوں نے شفقت سے سر
 پر ہاتھ رکھ کر عادی اور اکبر نے پہلی بار حرم کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی وہ اس بات پر اب اسے زچ کرتا کہ
 اس نے سلطان صاحب کو اکبر پر ترجیح دی اور پھر مسکراہٹ سے بھی نوازہ حالانکہ یہ خصوصی عنایت کبھی اس پر
 نہیں کی گئی تھی۔“

”تم نے ابھی سے میری بہو کو کام پر لگا دیا“ میں نے سوچا تھا اک دو مہینے خوب آرام کرواؤں گی۔“ روبینہ
 نے اکبر سے شکوہ کیا۔

”میں نے اس لئے شادی نہیں کی تھی کہ جوان بیوی آرام کرے اور بوڑھی ماں کام۔“ وہ بھی فوراً بولا
 نظریں کچن کے دروازے پر تھیں۔ حرم نظریں جھکائے اس تک آئی اور جھک کر لوازمات سے بچی ٹرے اکبر کے
 سامنے تخت پر رکھیں۔

”پراٹھے پورے ہیں؟ جانتی ہوں میں صبح تین پراٹھے اور ساتھ کھن چائے لیتا ہوں یہی میرا ناشتہ ہوتا ہے۔“ وہ
 پراٹھے گنتے ہوئے بولا۔ حرم خاموش کھڑی تھی مڑی ہی تھی کہ اکبر کی آواز نے رک جانے پر مجبور کر دیا۔

”یہ تم کیا سفید کپڑے پہنے میرا سگ منارہی ہو، بیوہ ہو گئی ہو کیا“ میں مرا نہیں جو شادی کے دسویں روز اس
 طرح اجاڑ بچھاڑ چلے میں گھوم رہی ہوں اتنے مہنگے لباس اور زیورات میں نے ایسے ہی نہیں خریدے مہینے کے
 لئے ہیں۔“ وہ پھر سے غصہ ہوا یعنی ابھی توجہ دی تھی سلطان صاحب ناشتہ کر کے چھڑی پکڑتے اٹھ کر اندر چلے
 گئے وہ آنسو جیتی سرائیات میں ہلا کر کچن میں چلی گئی۔

”ذرا جو اس میں خوبصورتی کے سوا کوئی خوبی ہوا ایسے لگتا ہے میں نے گھوگی بہری لڑکی سے شادی کی ہے ناں
 ہنستی ہے ناں کھل کر بولتی ہے حد تو یہ شادی کے ان دس دنوں میں اس نے میری شکل تک نہیں دیکھی گویا زمین پر
 ہیرے موتی بکھرے ہوں جنہیں ہر پل یہ تلاشتی ہے۔“ وہ نوالہ پہ نوالہ چائے کے ساتھ چباتا ایک ہاتھ کو نچانچا کر
 ماں سے مخاطب تھا۔ کس قدر اونچی آواز میں حرم کو سنا تا اس کے کانوں تک۔ بخوبی یہ ارشادات پہنچ رہے تھے۔

”یہ تو اچھی تربیت کا اثر ہے تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ اتنی حیا والی اچھی بچی تمہیں ملی ہے۔ ملی کیا ہے تم نے
 زبردستی اپنی زندگی میں شامل کی ہے۔“ آخری جملہ وہ کہہ نہ سکیں۔

”ہونہہ..... آج کل شرم و حیا نہیں چھٹی زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے مجھے مٹی کا مادھو نہیں جیتی جاگتی ہنستی
 بولتی بیوی جانے جو مجھے خوش رکھے۔“ جھٹ دو سرا گلہ آ گیا روبینہ خاموش رہیں اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی۔

”صبح کون آ گیا حرم ادھر آؤ بھی۔“ وہ جھلایا۔

”جی۔“ حرم بوتل کے جن کی طرح حاضر تھی۔

”جا کر دروازے پر دیکھو کون ہے؟“ وہ لاپرواہی سے نوالہ کھن پر لگتا ہوا بولا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ انجسٹ 225 دسمبر 2016ء

”مم..... میں؟“ وہ گھبرائی۔

”ہاں تو اور کون؟“ اکبر نے آنکھیں دکھائیں۔

”بچی کو کیوں پریشان کرتے ہو؟ جاؤ بیٹا میں دیکھ لوں گی۔“ روبینہ اس کی جھک محسوس کر کے چل اڑتی تھیں۔

”جپ پولیس..... آئی ہے اکبر۔“ روبینہ کی گھبرائی ہوئی آواز آئی تھی۔ حرم کا دل اچھل کر حلق تک آ گیا۔

دھڑکن گویا ہاتھوں پیروں میں دھڑکنے لگی۔ اکبر نے آرام سے نوالہ ٹکڑا سڑپ سڑپ کر کے تین گھونٹوں میں

چائے ختم کی اور چپل پہن کر ساکت کھڑی حرم کے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ صاف کرتا دروازے تک گیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اکبر نے باوردی چار اہلکاروں کو گھورا۔

”اوپر دیکھ کیا رہے ہو؟“ ٹھٹھکی لگاؤ خطرناک مجرم سامنے کھڑا ہے۔ ایک نے ٹھٹھکی پکڑے اہلکار کو ڈپٹا۔

”کس خوشی میں کوئی مائی کالا ہے جو اکبر کو ٹھٹھکی لگائے؟ ایسی جرات آج تک کسی نے نہیں کی۔“ اکبر

آگ بگولا ہوا۔

”ہمارے پاس آرڈر ہے گرفتاری کے۔“ اس نے ورائٹ دکھائے۔

”ایک منٹ۔“ اکبر نے جپ سے موبائل نکال کر آئی جی اکرام کے نام پر سیونمبر ملا یا۔

”ہیلو اکرام صاحب! کیسے ہیں؟“ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ اہلکار چونک گئے۔

”میں ٹھیک ہوں خیریت اتنی صبح صبح جناب اکبر جنگجو نے کیسے یاد کیا؟“ وہ اچنبھے سے گویا ہوا۔

”یہ کچھ پولیس والے میری دروازے پر گرفتاری کے وارنٹ لئے کھڑے ہیں آپ بتائیے انہیں آج تک

کسی کی ہمت ہوئی ہے کہ اکبر کو ٹھٹھکی لگا کر حوالات لے چلے؟“ اکبر کی بات پر آئی جی حیران ہوا۔

”اچھا بات کرواؤ کون ہے یہ اناڑی جو اکبر کو نہیں جانتے؟“ اکبر نے آگے کھڑے اہلکار کو فون دیا۔

”جی سر؟“ اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور ارٹ ہو گیا۔

”جی..... جی.....“ دوسری طرف کی بات سنتے وہ جی جی کی گردان کر رہا تھا۔

”سوری سر! غلط فہمی ہو گئی تھی۔“ وہ فون اکبر کی طرف بڑھاتا شرمندہ سا بولا۔

”اوپر دیکھ کیا کر رہے ہو معافی مانگو سر جی سے۔“ اس نے پیچھے کھڑے تینوں اہلکاروں کو ڈانٹا۔

”کوئی بات نہیں جاؤ معاف کیا، مگر اگلی بار اکبر جنگجو کے دروازے میں آ کھڑے ہونے کی غلطی مت کرنا۔“

آج سلامت جانے دے رہا ہوں آئندہ نہیں۔“ وہ کہہ کر ان کے منہ پر دروازہ بند کرتا اندر آیا۔ روبینہ اور حرم

سب گنگنوں چکی تھیں حرم اکبر سے مزید خوفزدہ ہوئی وہ تو بہت پہنچا ہوا تھا۔

”میرے کپڑے نکالو جلدی۔“ وہ کمرے کی سمت بڑھتا حرم سے بولا تھا۔

☆☆☆☆

”تمہارے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟“ حرم کے ہاتھ سے ہینگ کئے کپڑے پکڑتے ہوئے اس کی نگاہ

ہاتھوں کی کیکیاہٹ پر ٹھہر گئی۔ حرم نے تھوک ننگتے ہوئے ہاتھ تیزی سے دوپٹے میں چھپائے تھے۔

”میری طرف دیکھ کر بات کیا کرو کھا نہیں جاؤں گا تمہیں۔“ اب کے دہ ذرا غصے سے پورا رخ اس کی سمت

موڑتے ہوئے بولا حرم کی آنکھوں میں نمی جھلما گئی۔

”کون ہے وہ جس کی یاد تمہیں میری طرف دیکھنے نہیں دیتی میں نے تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کیا تم ہو کہ

مجھ سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتیں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کیا کرو۔“ وہ دو قدم پاس آیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ انجسٹ 226 دسمبر 201

”میں تمہاری طرف نہیں دیکھ سکتی“ کیونکہ میں تم سے خوفزدہ ہوں، تمہارے چہرے میں مجھے اپنے باپ کا قاتل نظر آتا ہے میرا کوئی نہیں، تم نے مجھے اکیلا کر دیا، مجبوری ہے بغیر تمہیں دیکھے ہی زندگی اب ایسے گزارنی ہے ایک ناپسندیدہ شخص کے ساتھ زندگی گزارنا کتنا کٹھن ہوتا ہے یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ وہ خوفزدہ سی دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”جی تو چاہتا ہے ایک لٹے ہاتھ کا دوں تمہیں۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے واقعی میں ہاتھ الٹا کر کے اٹھایا تھا جیسے جڑی دے گا، حرم نے ہاتھ چہرے کے آگے کر کے چہرہ موڑا تھا۔

”مگر کیا کروں، کبخت تمہارا چہرہ اتنا حسین ہے کہ ہاتھ جڑتے ہوئے دل کو کچھ ہوتا ہے۔“ وہ افسوس سے کہتا مڑ کر واش روم کی طرف گیا تھا وہ تو کچھ دیر میں تیار ہو کر چلا گیا، حرم دوپہر کے لئے سالن بنا رہی تھی کہ اشفاق صاحب آگئے وہ ان کے گلے سے لگ کر بہت روئی، چچا اسے دلاسا دیتے رہے بہت دیر تک وہ لوگ سعید صاحب کو یاد کرتے رہے حرم ان کی ہر بات اشفاق صاحب کے سامنے دہرائی رہی، روبینہ خود ان کے لئے چائے بنا کر لائی تاکہ وہ دونوں خوب باتیں اور یادیں تازہ کرتے رہیں تقریباً آدھا گھنٹہ وہ وہاں موجود رہے حرم نے بہت اصرار کیا دوپہر کے کھانے میں شرکت کرنے کی مگر وہ چلے گئے گھر والوں نے شکوہ کیا تھا کہ وہ شادی کے بعد ان سب کو بھول گئی ہے وہ یہاں بتا سکی کہ اکبر نے سختی سے منع کر رکھا ہے شادی ہوگئی تو اب وہ اپنے گھر رہے وہ اس کے چچا کا گھر ہے اور اکبر اس بات کے حق میں نہیں کہ حرم اب وہاں جائے ہمیشہ کی طرح دوسروں کا حکم ماننے والی حرم کوئی اعتراض نہ کر سکی ویسے بھی اکبر کے آگے کسی کی چلتی کہاں تھی۔ بہتری چپ چاپ اس کی بات ماننے میں ہی تھی۔

☆☆☆☆

سیماب کی طرف سے ایم ایم ایس کی گئی دہن بنی حرم کی تصاویر دیکھتے فرحان عجیب سے احساسات میں گرا ہوا تھا بے یقینی سی بے یقینی تھی حرم کی شادی ہوگئی؟ وہ کسی اور کی دہن بن گئی؟ یقین کرنا مشکل تھا۔

”تو کیا وہ سب میری نظر کا دھوکا تھا؟ بھلا ایک پیار کرنے والا دل دوسرے پیار کرنے والے کی آنکھوں میں اپنے لئے ایسا جذبہ دیکھنے میں دھوکا کیسے کھا سکتا ہے وہ کہتی نہیں تھی دیکھتی بھی نہیں تھی مگر اس کا ایک ایک نقش ہر حرکت بتاتی تھی کہ وہ مجھ سے یہاں تک آ کر اس کی سوجھ بوجھ ہو جانی، تو پھر وہ کیسے اکبر سے شادی پر رضامند ہوئی کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے اظہار کر کے اکبر سے شادی کر سکتی ہے پھر وہ سب کیا تھا؟ میری نظر کا دھوکا نہیں، مگر یقین کیوں نہیں آتا کاش میں اس رات اسے شادی کی مبارکباد کے بجائے ہمت کر کے پوچھ لیتا وہ اتنی چپ کیوں تھی؟ کیا واقعی وہ اپنی خوشی سے یہ شادی کر رہی ہے؟ میں نے کیوں لوگوں کی زبانوں پر یقین کر لیا؟ اگر وہ قائل ہو جانی کہ ہاں وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے تو ساری دنیا سے ٹکر لے کر اسے اپنا لیتا، مگر اب کچھ تاوے کا کیا فائدہ وہ سر پکڑے بیٹھا تھا کہ اشفاق صاحب کی کال آگئی۔

”السلام علیکم بیٹے کیسے ہو؟“ وہ خوشی سے چپکے آج حرم سے ملے تھے شاید اسی لئے لہجہ بٹاش تھا۔

”وعلیکم السلام ٹھیک ہوں ابا آپ کیسے ہیں؟“ وہ کچھ بچھا بچھا سا لگا۔

”ہمیشہ کی طرح سب کا حال احوال نہیں پوچھتا تھا۔“

”میں ٹھیک ہوں تم کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ وہ پریشان ہوئے ان کا فرمانبردار بیٹا جو بہت کم عمری سے گھر کی ذمہ داری خوش اسلوبی سے اٹھانے لگا تھا آج وہ اس بیٹے کی بدولت اپنا بڑھاپا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



عیش و آرام سے گزار رہے تھے۔

”ٹھیک ہوں، بس کچھ سر میں درد تھا۔“ اس نے بوجھل لہجے میں کہتے کنپٹیاں دبائی تھیں۔
”اپنا خیال رکھا کرو، صحت کے معاملے میں لاپرواہی مت کرنا، اتنی کم عمری میں تو بندہ بہت قوت محسوس کرتا ہے ڈاکٹر کو دکھا دینا۔“ انہوں نے سمجھایا۔
”ٹھیک ہے ابا۔“

”میں آج حرم کے ہاں گیا تھا۔“ وہ بخوشی بتانے لگے۔

”کک..... کیسی ہے خوش تو ہے ناں؟“ اس کا دل دھڑکا زبان لڑکھڑا گئی۔

”ہاں، بہت آسودہ ہے، میں تو مطمئن ہو گیا، اس کی ساس اور سر دونوں حرم کو بہت چاہتے ہیں، بیٹیوں کی طرح اس کا خیال رکھتے ہیں۔“ وہ حرم کے لئے ان دونوں کی محبت سے بہت متاثر ہوئے تھے۔
”اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔“ لہجہ خود بخود دھیمہ پڑ گیا۔

”میرا تو ارادہ تھا حرم کو اپنی بہو بناؤں، مگر تمہاری ماں کے مزاج سے ڈر لگتا تھا۔“ اشفاق صاحب نے پہلی بار ایسی بات کی تھی۔ فرحان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”تمہارا بابا ہوں، جانتا ہوں تم کچھ کہتے نہیں مگر میں جانتا ہوں حرم تمہیں کتنی عزیز تھی میں دیر کرتا رہا، شاید قسمت میں یہی لکھا تھا، وہ اکبر کا ہی نصیب تھی۔“ وہ بھی آبدیدہ ہو گئے۔

”آج حرم کو بچا سنو رہا اور لئے اکبر کے آنگن میں دیکھ کر تشنہ خواہش بہت حسرت دلا گئی مگر قسمت پر کس کا بس چل سکا ہے۔“ فرحان کی برداشت بس یہاں تک گئی وہ مزید نہ سن سکا، لائن کاٹ دی، اشفاق صاحب ہیلو ہیلو کہتے رہ گئے۔

”شاید لائن کٹ گئی۔“ انہوں نے تھک کر ریسور کر یڈل پر ڈال دیا تھا۔

☆☆☆☆

”میں..... حرم سعید بہت خوبصورت مگر بہت کم نصیب میں نے کبھی رب سے شکوہ نہیں کیا کسی بات کے لئے بھی کیونکہ شکوہ وہ کرتے ہیں جنہیں امید کی روشنی میسر ہو، میرے پاس امید یا دوسرا راستہ نہیں، شکوہ کر کے امید کے بل پر فرار بھی ہو جاؤں تو زندگی میں میرے لئے زندان کے سوا کچھ نہیں، ایک قید سے فرار ہو کر بھی دوسری قید میں جانا ہو تو بہتر ہے کہ اپنی اصل اور پہلی حالت پر صبر کر لیا جائے، میرے پاس اللہ کے سوا کوئی رشتہ نہیں بچا، آج سب بے تحاشہ خوش ہیں، صبح سے مبارکبادوں کا سلسلہ ہے جو رکنے کو نہیں۔“ چچا، چچی، سویرا، سونیا، لائیب، باجی، فلک سب اپنے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آئی تھیں، سلطان صاحب بھی خوش تھے جنہوں نے بیٹے کی شادی میں شرکت تک گوارا نہ کی تھی، روبینہ اور اکبر تو پھولے نہیں سارے تھے، حرم یاں بننے والی تھی اس خوش خبری نے ہر کسی کا چہرہ کھلا دیا تھا۔ حرم چپ گئی بے حد اس اپنی کیفیت کو وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی، جس شخص کے ساتھ زندگی کے پل مجبوراً کاٹ رہی تھی اب اس کے بچے کی ماں بننے کا احساس شدید تکلیف دہ تھا، زندگی کا اک ایسا کڑوا سچ جو کبھی سوچا تک نہ تھا۔

☆☆☆☆

”ہٹو یہاں سے، کیا ہر وقت اس کی خدمتوں میں لگی رہتی ہو، کچھ اپنی حالت کا ہی خیال رکھو، اپنی پرواہ ہے نہیں، دوسروں کی فکر میں لگی رہتی ہے محترمہ۔“ اکبر نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر پیچھے اپنی طرف دھکیلا۔ وہ اپنے دھیان میں مگن اس افتاد پر توجہ نہ دے پانی اور اکبر کے سینے سے اس کی پشت لگ گئی تھی، اک پل میں ہی حواس

بحال ہوئے تو وہ کرنٹ کھا کر اکبر سے دور ہوئی تھی مگر اس کا ہاتھ اب بھی اکبر نے پکڑ رکھا تھا۔
 ”ہاتھ..... چھوڑ..... چھوڑیں“ وہ دوسرے ہاتھ سے دوپٹہ درست کرتی نجل سی بولی تھی سلطان صاحب کی موجودگی بھی خفت میں مبتلا کر رہی تھی اکبر کو تو کسی کا لحاظ نہ تھا۔
 ”کھا نہیں جاؤں گا تمہارے ہاتھ کو دو پل کو کیا پکڑ لیا تم پر تو موت آ جاتی ہے بیوی ہو میری اب کیا ہاتھ بھی نہ پکڑوں۔“ وہ غصے سے جل کر کہتا اس کا ہاتھ چھوڑ گیا۔ حرم کی لوں تک اس کی بات پر سرخ ہو گئیں بوڑھا بیمار باپ بستر پر پڑا ہے اور اسے کوئی پرواہ ہی نہیں کتنی بے باکی سے بات کرتا ہے۔
 ”چلو۔“ وہ اسے گھور کر دیکھتا حکم صادر کر کے مڑ گیا حرم سر جھکائے خوفزدہ کھڑی انگلیاں مروڑتی رہی۔
 ”اب کیا ہوا کس لئے کھڑی ہو؟“ وہ پھر کاٹ کھانے کو دوڑا۔

”وہ اباجی نے..... سوپ..... پورا نہیں..... پیا۔“ اس نے سوپ کے پیالے کی طرف دیکھتے وہی آواز میں ڈر کر بتایا۔

”اچھا تو خیال رکھا جا رہا ہے طاقت کی خوراکیں دی جا رہی ہیں تاکہ مزید شیر ہو جائیں وہ میرا باپ نہیں دشمن ہے اور تم یہ بات سمجھتی نہیں یہ وہ شخص ہے جس نے ہماری شادی میں شرکت نہیں کی تھی لوگ پوچھتے پھر رہے تھے اور ہم جھوٹی وضاحتیں دے دے کر تھک گئے یہ میرا باپ جو مجھے بزدل بنائے دیتا ہے ایسے ہوتے ہیں باپ۔“ وہ سلطان صاحب کی سمت ہاتھ بڑھائے انگلی اٹھائے حرم کو کم انہیں زیادہ سنا رہا تھا۔ حرم ہر تحر کا پنے لگی اب اس کی خیر نہیں تھی۔ سلطان صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے حرم کو اپنا باپ یاد آ گیا وہ سلطان صاحب کی خدمت اس لئے نہیں کرتی تھی کہ وہ اکبر کا باپ تھا بلکہ اس لئے کرتی تھی کیونکہ اسے سلطان صاحب میں اپنا باپ نظر آتا تھا بہار بے بس ولا چار بوڑھا باپ۔

”اباجی کی کچھ لگتی اب تم کیوں رو رہی ہو کیا میرا جنازہ گھر آیا ہے مری گیا ہوں میں؟“ وہ دھاڑا اس کے رونے میں مزید شدت آ گئی اس سے پہلے کے حرم کو کچھ اور کہتا روینہ اندر آ میں تھیں۔
 ”اکبر کیا شور مچا رکھا ہے پھر کیا افواہ ان پڑی؟“ وہ کمرے کا منظر دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھیں کہ اکبر کس بات پر غصہ ہوا ہوگا۔

”اپنی اس معصوم بہو سے پوچھیں میں اس لئے اسے اپنے گھر لایا تھا کہ یہ بھی میرے باپ کے ساتھ مل کر میرا دل جلائی رہے وہ کم تھا ناں۔“ اکبر پھر بگڑنے لگا۔

”حرم کتنی بار تمہیں منع کیا ہے میں ہوں ناں تم کیوں اپنے لئے مشکلات کھڑی کرتی ہو اگر اپنی خوشی سے کچھ بنا لیتی ہو تو مجھے بتا دیا کرو میں اکبر کے ابا کو کھلا دیا کروں گی کم از کم تم دونوں میں اختلاف تو نہیں ہوگا ناں جاؤ شاباش۔“ وہ اکبر کا اپنے باپ سے بیر جانتی تھیں اسی لئے مصالحت آمیز لہجے میں بولیں۔ سلطان صاحب پر کیا گزر رہی تھی کسی کو معلوم ہی نہ تھا صرف ایک حرم تھی جو ان کا درد سمجھ رہی تھی وہ اکبر سے بلاوجہ خفا نہیں تھے حق بجانب تھے مگر اکبر کو کون سمجھاتا؟ باپ بیٹے کی ایسی دشمنی کہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے۔

”چلو۔“ اب کے اکبر نے اسے سرخ سرخ نظروں سے گھورا حرم اس کے پیچھے سر جھکائے چل پڑی۔
 ”آہ..... وقت کی ستم ظریفی کیسے کیسے وقت اور حالات دکھاتا ہے کہ بیٹی باپ کے قاتل کا حکم ماننے پر مجبور ہے۔“ روینہ نے شوہر کو دیکھا جن کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو جمع تھے اور وہ بہو بیٹے کی پشت کو حسرت و

افسوس سے تکر رہے تھے۔
 ”جس دن یہ شخص مر بھی گیا، مجھے ذرا برابر دکھ نہ ہوگا کہ میرا باپ مرا ہے۔“ اکبر کی حرم سے کہی بات کو والدین نے سنا تھا۔ بوڑھا فاج زدہ باپ بیٹے کی بات پر آدھا مر گیا تھا۔

☆☆☆☆

”بیٹا تم کب تک ہمیں ٹالتے رہو گے چار برس کا عرصہ کم تھوڑی ہوتا ہے پہلے تم کہتے تھے سعدیہ اور سیماب کی رخصتی ہو جائے تو میں پاکستان آ کر شادی کر لوں گا اب تو وہ بہانہ بھی نہیں رہا، وہ اپنے گھر بار میں بہت خوش اور آسودہ ہیں بیٹے کب یہ جلا وطنی کی سزا ختم کرو گے، بوڑھے ماں باپ کی آنکھیں ترس گئیں، علی بھی تمہیں بہت یاد کرتا ہے، تم آؤ گے تو ہماری تہائی دور ہو جائے گی۔“ زبیدہ کی آواز میں اب وہ دب دبا اور دھونس نہیں ہوتا تھا، فرحان کا دل کر لایا تھا۔

”اور میری تہائی کون دور کرے گا۔“ پاگل دل آج بھی حرم کو بھلانے میں ناکام تھا، پہلے روز کی طرح دل کے اونچے مسند پر براجمان تھی۔

”چھٹی ملے گی تو آ جاؤں گا۔“ وہ بے دلی سے بولا، زبیدہ اس کی بے نیازی پر تڑپ اٹھیں۔
 ”یہ تو عرصہ ہوا تم کہتے آرہے ہو، بہنوں کی شادی پر بھی نہ آئے آخروقت تک وہ تمہاری راہ دیکھتی رہیں پیسے بھجوا کر تم سمجھتے ہو ہم بھل جائیں گے، بیٹا مت کرو ہمارے ساتھ ایسا، ہمیں پیسہ نہیں بیٹا چاہئے بس تم آ جاؤ۔“ وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ فرحان خاموش سا ہو گیا تھا، چاہے کچھ بھی ہو تھا تو بیٹا ماں کے دکھ نے اس کو دیا تھا۔

”کاش میں نے حرم کو بہو بنا لیا ہوتا، میرا بیٹا آج یوں اجاڑ اور ویران تو نہ ہوتا، اس کی خاموشی اور ناراضی بجا ہے میں نے کوئی کم ظلم تھوڑی کیا ہے اس سے اس کی محبت چھینی ہے، ظالم سانچ کا کردار تو لوگ ادا کرتے ہیں اور میں خود ہی بیٹے کی دشمن بن گئی۔“ زبیدہ بے آواز روتے ہوئے خود کو خطا وار ٹھہراتی رہیں۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اپنی سوچوں میں گم تھے۔

”فرحان بیٹے! جس کا جوگ لئے تم ہم سے دور رہے خود کو سزا دیتے رہے وہ اپنے گھر میں بس چکی ہے اکبر سے اس کے تین بچے ہیں وہ بہت مطمئن ہے بیٹا، اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر بھول جاؤ۔“ جس موضوع سے وہ ہمیشہ کتراتے تھے بالآخر آج خود ہی بیٹے کے سامنے بیان کر دیا تھا ایک ماں کی بے بسی کا اعتراف۔

”آہ اماں تو آپ جانتی تھیں اور پھر بھی۔“ فرحان کی سانس آہ کی صورت نکلی، دل کا درد آنکھوں میں جھللا گیا، وہ بہت بہادر تھا زندگی میں بہت کم آنسو روئے تھے مگر حرم کے معاملے میں وہ بے بس ہو جاتا تھا، آج بھی حرم کی یاد اس کی آنکھیں نم کر دیتی تھی۔

”مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں، غلطی میری تھی ناں، کیوں محبت کے اظہار سے ہچکچاتا رہا۔“ اب اس ٹاپک پر بات کرنا فضول ہے۔ دل کڑا کر کے اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

”اچھا بیٹا اپنا خیال رکھنا، تمہارے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں وہ سو رہے ہیں ورنہ تم سے بات کرتے، بہت یاد کرتے ہیں تمہیں اپنا خیال رکھنا، خدا حافظ۔“ زبیدہ نے اس کی بے دلی محسوس کر کے خود ہی فون رکھ دیا۔

”خدا حافظ۔“ وہ بھی ٹھنڈی سانس لیتا فون بند کر گیا، دروازے پر نیل بجی تھی وہ کوفت سے اٹھا دروازے کے پار صوفیہ کھڑی مسکرا رہی تھی ہاتھ میں سندھی بریانی اور کھیر سے بھری ٹرے پکڑے۔

”مجھے پتہ ہے فرحان تم مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گے مگر پڑوسیوں کا تو السلام میں بہت حق ہوتا ہے اور میں

بہت خیال رکھنے والی لڑکی ہوں، خود ہی اندر آ جاؤں گی۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اس کا نام بگاڑتی اندر چلی آئی۔ لیکن کی سلیب پر اس نے ٹرے رکھی اور کوریڈور سے ہوتے ہوئے بیرونی دروازے تک آئی جہاں اب تک فرحان دروازے کا کھلا پٹ پکڑے کھڑا تھا۔

”یاد سے کھا لینا، بہت دل سے بنائے ہیں۔“ وہ کہہ کر چلی گئی۔ فرحان نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ صوفیہ اس کے سامنے والے فلیٹ میں کئی برسوں سے اپنی بوڑھی ایرانی ماں کے ساتھ قیام پذیر تھی، چند سال پہلے ہی ان کا انتقال ہوا تو صوفیہ گیلی ہو گئی وہ ماں بیٹی فرحان کا بہت خیال رکھی تھیں، صوفیہ کا پاکستانی باپ اس کی پیدائش کے بعد اس کی ماں کو طلاق دے کر چھوڑ گیا تھا، صوفیہ کی ماں نے ایک بار اس سے بات کی تھی کہ وہ چاہتی ہیں فرحان صوفیہ سے شادی کر لے مگر اس نے سختی اور بدچالپی سے جواب دیا تھا، اس کے بعد بھی صوفیہ کی ماں نے اس کا پک کو نہیں چھیڑا، مگر فرحان کو صوفیہ کی محبت مستقل پریشان اور ڈیپر کئے رہی، وہ بہت خیال رکھتی تھی فرحان کا، وہ اس سے بہت روڈی ہو کر رہتا تھا مگر صوفیہ جانے کس مٹی کی بنی تھی ہر وقت ہنسی مسکراتی حاضر ہو جاتی، اس کی خاموش محبت اس کی لیشی حسین آنکھوں سے پھٹکتی تھی اور یہی چیز فرحان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

”روشنی بھر گئی نگاہوں میں

ہو گئے خواب بے ماں جاں

حال یہ ہے کہ خواہش پر تش حال بھی نہیں

اس کا خیال بھی نہیں اپنا خیال بھی نہیں

میرے زمان و ذات کا ہے یہ معاملہ کہ اب صبح

فراق بھی نہیں، شام وصال بھی نہیں“

☆☆☆☆

”چھ سال کا عرصہ کیسے میں نے اس پاگل شخص کے ساتھ گزار دیا، سمجھ ہی نہیں آتا، محبت کی ایسی قسم سے تو میں واقف نہیں تھی، اکبر جنگجو نے مجھے واقف کر دیا، ایک وہ شخص تھا جس نے بھی اظہار نہیں کیا مگر اس کی محبت نے ہر سو بہار اگا دیئے تھے میرے اندر اور ایک یہ شخص جس نے میری ذات کو خزاں بنا دیا ہے، لگتا ہی نہیں کہ میں زندہ ہوں، میرا دل مر چکا ہے، کس شے کی تمنا کوئی خواہش دل میں جاگتی ہی نہیں، میرے دونوں جڑواں بیٹے جو بالکل باپ کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں خدا کرے وہ مزاج میں باپ پر نہ جائیں اپنے باپ کی طرح نہ بنیں اور میری تیسری اولاد میری بیٹی حور پہ جو بالکل مجھ پر گئی ہے، بیٹیوں کو دیکھ کر ڈر جاتی ہوں، مگر بیٹی کو دیکھ کر دل مسرت سے بھر جاتا ہے، ابھی صرف تین سال کی ہے مگر ڈر رہی ہوں خدا اس کی قسمت کو میری طرح نہ بنائے، وہ جوان ہو کر کسی اکبر جنگجو کی محبت کی بھیٹ نہ چٹھے، وہ اپنے باپ کے قاتل کے ساتھ مجبوری اور لا چاری کی زندگی نہ بسر کرے۔“ حرم آج بھی پہلے دن کی طرح معصوم اور حسین تھی، اکبر سے اس کا خوف اب تک نہیں نکلا تھا اس کی ایک آواز پر وہ بھاگی بھاگی جاتی کہ ایک منٹ کی دیر اکبر کو آگ بگولا کر کے اس کے قبر کو آواز دے گی، وہ اس سے اب بھی بہت محبت کرتا تھا، مگر کوئی چھوٹی سی خطا بھی اس کی ڈکٹری میں قابل معافی نہ تھی۔ وہ اتنے سال اکبر کے نکاح میں رہ کر اس کے بچوں کی ماں بن کر بھی اکبر سے مانوس نہ ہو سکی تھی کسی جابر و ظالم آقا کی طرح اس سے دب کر اور خوفزدہ ہو کر رہتی تھی میں بھی بہت عجیب ہوں اتنی عجیب ہوں کہ بس خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں۔

مال ہوتا بھی تو کس کے لئے؟ وہ جو بہت دور بیٹھا کسی معجزے کا منتظر لب سے ساری زندگی حرم کی محبت کے نام پر گزارنے والا تھا۔ کبھی اپنے ساتھ کالپنے ہونے کا یقین نہیں دیا تھا ایک دو بار جو اس نے فرحان کی نظروں میں محسوس کیا تھا وہ بھی اب جھوٹ اور فریب لگتا تھا اگر وہ سچ تھا تو پھر حرم کو کسی امید کسی عہد میں کیوں نہ باندھا؟ ایک بار تو کہتا اشاروں کنایوں میں ہی اپنے ساتھ کالپنے دیتا تو آج وہ اتنی مایوس اور تنہا نہ ہوتی، اکبر نے گھر میں داخل ہو کر کمرے تک آتے ہوئے کئی بار حرم کو آواز دی تھی اور یہ پہلی بار تھا کہ کوئی جواب نہیں آیا تھا وہ کمرے کے دروازے تک پہنچا تو حرم گلے میں پہننے نازک سالاکٹ چین نازک انگلیوں میں دبائے نم آنکھوں سے شیشے میں دھبھتی گہری سوچ میں گم تھی۔

”یہ وہی چین تھی جو فرحان نے سعدیہ اور سیما کے ساتھ ساتھ اس کے لئے بھی خریدی تھی اور اتنے سالوں میں اکبر نے کسی ایک بل بھی اسے حرم کے گلے سے اتارے نہیں دیکھا تھا۔“

”کیا ہو رہا ہے؟ اکبر نے پاس آ کر وائیں پہلو کی طرف کھڑے ہو کر سوچ میں گم حرم کو بھاری گھمبیر لہجے میں مخاطب کیا تھا وہ اچھل کر دل پر ہاتھ رکھتی دو قدم پیچھے ہوتی تھی آج بھی تم مجھ سے ویسے ہی ڈرتی ہو جیسے پہلے دن ڈرتی تھیں۔“ وہ افسوس سے بولا لہجہ عجیب سا تھا۔ وہ خاموش رہی ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

”ویسے..... اکثر میں سوچتا ہوں کہ ناحق تم پر ظلم کیا زبردستی ڈرا دھا کر تم سے شادی کی میں ناں ہوتا تو آج تم فرحان کے ساتھ مطمئن خوشحال زندگی گزار رہی ہوتیں۔“ ہمیشہ کی طرح اس نے حرم کا دل جلا دیا تھا۔

”وہ میرے بھائی کی طرح ہیں۔“ حرم نے نم آنکھوں سے اکبر کو دیکھتے بھرائی آواز میں کمزور سا دفاع کیا تھا اپنا۔

”اچھا.....“ وہ ستہزاسیہ ہنسا۔

”بھائی کی طرح ہیں بھائی تو نہیں ہے ناں۔“ اکبر کی بات پر حرم کا سر روتے ہوئے زور و شور سے ملنے لگا تھانی میں۔

”محبت تھی..... مگر میں نے مہلت نہ دی ورنہ شادی تو لازماً کر ہی لیتے۔“ اس نے ایک ہی بات پر اکتفا نہیں کیا تھا چہ کے ابھی باقی تھے۔

”ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں تھا فرحان بھائی ایسے نہیں۔“ حرم نے پہلی بار فرحان کے دفاع میں براہ راست اس کا نام لے کر کچھ کہا تھا۔

”تم دونوں کے درمیان محبت تھی جس سے تم مکر نہیں سکتیں میں درمیان میں آیا تھا یہ تو حقیقت تھی جسے چھپایا نہیں جاسکتا اگر محبت نہ ہوتی تو آج تم جیسی ڈرپوک لڑکی میرے سامنے فرحان کے لئے نہ بولتیں ایسی جرات پہلے تو تم نے کبھی نہیں دکھائی۔“ اکبر کی مدلل دلیل پر حرم چپ رہ گئی تھی۔

”نہیں ہے ناں کوئی جواب؟ اچھا ایک بات کا جواب تو دو؟“ اس نے چہنتر ابدلا۔ اچانک اس تبدیلی نے حرم کو مزید خوفزدہ کر دیا تھا۔

”بھئی تم میرے سامنے نہیں مسکرائیں میرے باپ کے پاس بیٹھ کر تم ایسی کیا گفتگو کرتی تھیں کہ دونوں کا میوڈ خوشگوار ہو جاتا تھا؟ یقیناً میری برائی، مگر ہو سکتا ہے تم ان سے فرحان کے بارے میں بات چیت کرتی ہوگی تبھی چہرے پر مسکان آئی تھی میں نے باپ کی موت کے بعد تمہیں پھر سے پہلے کی طرح سنجیدہ اور سوگوار دیکھا ہے وہ میرا باپ تھا یا تمہارا مجھے کبھی کبھار حیرت ہوتی ہے فرحان تم سے رابطہ کیوں نہیں کرتا تم دونوں کو جب ایک دوسرے کی یاد آتی ہے تو پھر چوری چھپے ایک دوسرے کے لئے آنسو بہانے اور یاد کرنے کی کیا ضرورت ملو بات کرو کسی نے منع توڑی کیا ہے۔“

(باقی آئندہ)

رواکی ڈائری

فرحت کی ڈائری سے

ایک نظم

میں آج بھی تنہا ہوں
اس راہِ محبت میں
بس سرد سے موسم میں
کچھ سرد سے آنسو ہیں
کچھ سرد سے لمحے ہیں
کچھ سردی آہیں ہیں
تاریک سا کمرہ ہے

اور

دیواروں پہ یہ نقشِ عبارت ہے
یادوں میں ٹھہرتا سا
یہ ماہ ہے دسمبر کا

ایم جے قریشی کی ڈائری سے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی نظم

دسمبر
جب بھی آتا ہے
وہ بچی پھر سے روتی ہے
پرانے خط پڑھتی ہے
کہ جن میں اس نے لکھا تھا
میں لوٹوں گا دسمبر میں
نئے کپڑے بناتی ہے

عائشہ کی ڈائری سے

خوب صورت نظم

دسمبر کی ٹھہرتی رات
غیالی چاندنی
دھند میں سمٹی تمہاری یاد کی سرسرائی
چادر جب میرے شانوں سے ڈھلکنے لگی
تو اس پل کھڑکی سے لپٹی
سرد مدھم، بے لباس ہوا کہنے لگی
دسمبر لوٹ آیا ہے

اسے اب لوٹ آنا چاہیے
ہاں!

اسے اب لوٹ آنا چاہیے

تانیہ کی ڈائری سے

خوب صورت نظم

دسمبر کی آخری شام
یہ شام یاد رکھنا
تیری نگاہ سے جب میں اپنی نگاہ
چھڑا کے پلٹ رہی تھی
تو تم نے کچھ بھی نہیں کہا تھا
نہ میں نے کچھ سنا تھا
مگر ہوا میں نمی اچانک بڑھ گئی تھی

جہاں پر ریت کے زرے ستارے ہیں
گل و بلبل مدد انجم وفا کے استعارے ہیں
جہاں دل و سمندر ہے کئی جس کے کنارے ہیں
جہاں قسمت کی دیوی
مٹھیوں میں جگمگاتی ہے
جہاں دھڑکن کی لے پر
بے خودی نغمہ سناتی ہے

دسمبر! ہم سے نہ پوچھ ہمارے شہر کی بابت
یہاں آنکھوں میں گزرتے
کارواں کی گرد دھبہری ہے
محبت برف جیسی ہے یہاں
اور دھوپ کے کھیتوں میں اُگتی ہے
یہاں جب صبح آتی ہے تو
شب کے سارے پہنے

راکھ کے اک ڈھیر کی صورت میں ڈھلتے ہیں
یہاں جذبوں کی ٹوٹی کرچیاں
آنکھوں میں چھپتی ہیں
یہاں دل کے لبو میں اپنی پلکوں کو
ڈبو کر ہم سنہرے خواب سیتے ہیں
پھر اُن خوابوں میں جیتے ہیں
انہی خوابوں میں مرتے ہیں۔
دریدہ روح کو لفظوں سے سینا گونہیں ممکن
مگر پھر بھی؟

دسمبر اب کے آؤ تو.....؟
تم اس شہر تمنا کی خبر لانا
دسمبر اب کے آؤ تو؟

☆.....

وہ سارا گھر سجاتی ہے
دسمبر کے ہر ایک دن کو
وہ گن گن کے بتاتی ہے
جو نمی پندرہ گزرتی ہے
وہ کچھ کچھ ٹوٹ جاتی ہے
نہیں معلوم پر اس کو
بیتے وقت کی خوشیاں بہت تکلیف دیتی ہیں
مختص دل کو جلاتی ہیں

یونہی دن بیت جاتے ہیں
دسمبر الوٹ جاتا ہے
مگر وہ خوش فہم لڑکی
دوبارہ سے کیلنڈر میں
دسمبر کے مہینے کو موڑلاتی ہے
پھر سے دسمبر کے سحر میں ڈوب جاتی ہے
کیونکہ اس نے لکھا تھا
میں لوٹوں گا دسمبر میں
میں لوٹوں گا دسمبر میں

شائقہ کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

دسمبر اب کے آؤ تم!
تم اس شہر تمنا کی خبر لانا
کہ جس میں جگنوؤں کی کہکشا میں جھمکتی ہیں
جہاں تلی کے رنگوں سے
فضا میں مسکراتی ہیں
وہاں چاروں طرف خوشبو وفا کی ہے
اور جو اس کو پوروں سے نظر سے چھو گیا
پل بھر مہک اٹھا
دسمبر اب کے آؤ تو!
تم اس شہر تمنا کی خبر لانا

اشعار

ترے خیال کی چھاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں
ملک جواو نواز — ڈی آئی خان
دسمبر جب بھی لوٹا ہے میرے خاموش آنگن میں
میرے بستر پہ بکھری ہوئی کتابیں بھیگ جاتی ہیں
اسماء جمشید — ڈی آئی خان
ٹھنڈی ہوئی شب سیاہ وہ بھی طویل تر
ہجر کے ماروں پر قیامت ہے دسمبر
عامر نواز — ڈی آئی خان
اے قاصدان سے کہنا ان دنوں ہم سے رابطہ بحال رکھے
سنا ہے اکثر لوگ دسمبر میں پچھڑ جاتے ہیں
سیمانا صر — ڈی آئی خان
ٹھنڈی ہوائیں کیا چلیں میرے شہر میں فرحت
ہر طرف یادوں کا دسمبر بکھر گیا
سمیع اللہ — ڈی آئی خان
کوئی بڑا نہیں ہے جو اسے روک سکے
راتوں سے کھیلتا ہے بد معاش دسمبر
روبینہ سجاد — ڈی آئی خان
یادوں کی شال ادڑھ کے ادارہ گردیاں
ہم بھی کاٹ رہے دسمبر کی سردیاں
آسیہ احمد — کراچی
اس خوشی کے موقع پر کیا تحفہ پیش کروں
سوچا پیار بھرے خلوص کا نذرانہ پیش کروں

مار یہ یاسر — کراچی
تیری جھیل سی گہری آنکھیں مجھے بے گانہ کر دیتی ہیں
اگر میں ان میں ڈوب جاؤں، مجھے ساحل پہ چھوڑ تم آنا
مس فرحت — کھاریاں
دسمبر جب بھی لوٹا ہے میرے خاموش آنگن میں
میرے بستر پہ بکھری ہوئی کتابیں بھیگ جاتی ہیں
مس طیبہ — کھاریاں
اے قاصدان سے کہنا ان دنوں ہم سے رابطہ بحال رکھے
سنا ہے اکثر لوگ دسمبر میں پچھڑ جاتے ہیں
مس تانیہ — کھاریاں
ٹھنڈی ہوائیں کیا چلیں میرے شہر میں
ہر طرف یادوں کا دسمبر بکھر گیا
مس اسماء — کھاریاں
پچھڑ جانے کی مایوسی ملن کی آس لگتا ہے
دسمبر کس لیے آخر ہمیشہ خاص لگتا ہے
مس عائشہ — کھاریاں
پچھلے دسمبر میں کہا تھا کہ لوٹ آؤں گا
دیکھو تم نہیں لوٹے دسمبر لوٹ آیا ہے
عانیہ نیازی — ربوہ
اس سے بچ کر گھٹائیں میں بیٹھ جاتے ہیں
گئے ہوؤں کی صداؤں میں بیٹھ جاتے ہیں
ہم ارد گرد کے موسم سے جب بھی گھبرا میں

دل میں بسی تمہاری محبت اور چاہت
پیار بھرے دل میں دعاؤں کا خزانہ پیش کروں
لا ریب نور ————— حیدر آباد

بے فائدہ ہے زندگی میں لوگوں کا ہجوم
پر خلوص جو آپ جیسے مل جائیں تو بس
محمد بلال ————— کوئٹہ

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ انتظار دیکھ
آمنہ زیدی ————— کراچی

ہمارے چمن میں پھولوں کی کمی تو نہیں
وہ اک صرف تم ہو جسے ہم گلاب کہتے ہیں
حناف رحان ————— کراچی

اک گزارش ہے میری اے میرے حسن
کہ مجھ پیاری سی کو بھی دعاؤں میں یاد رکھنا
نمرہ مسکان ————— پشاور

میرے چہرے پر ستارے وہ چنا کرتا تھا
میری آنکھوں کو گنول پھول کہا کرتا تھا
اس کو معلوم نہیں یاد ہو بھی کہ نہ ہو

وہ جو پیمان محبت میں کیا کرتا تھا
ماہا طارق ————— لاہور

چھوڑ جاؤ یہی مناسب ہے
پھر نہ آؤ یہی مناسب ہے
عشق پاگل ہے، عشق اندھا
ڈوب جاؤ یہی مناسب ہے

ایمن مختار ————— جھنگ

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جس گل اداس کر کے مجھے
میں سو رہا تھا کسی یاد کے شہستان میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

صوبہ رضوی ————— کراچی

یوں رشتہ بھی تجھ سے نبھایا ہے میں نے
تیرے غم کو اپنا بنایا ہے میں نے
اسے بھول جانے کا سوچا جو میں نے
تو مشکل سے دل کو منایا ہے میں نے

صوبہ رضوی ————— کراچی

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے
کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے
ہر ایک لب پہ ہیں میری وفا کے افسانے
ترے ستم کو ابھی لازوال ہونا ہے

عائشہ پرویز ————— منڈی بہاؤ الدین

انہی پلکوں سے بلائیں تو غضب ہوتا ہے
آنکھ سے آنکھ ملائیں تو غضب ہوتا ہے
روٹھ جاتی ہیں دعائیں تو غضب ہوتا ہے
درد پھر ہاتھ بڑھائیں تو غضب ہوتا ہے

سنبل خان ————— کوہاٹ

ترک محبت کر بیٹھے ہم ضبط محبت اور بھی ہے
ایک قیامت بیت چکی ہے ایک قیامت اور بھی ہے
ہم نے اسی کے درد سے اپنے سانس کا رشتہ جوڑ لیا
درد نہ شہر میں زندہ رہنے کی صورت اک اور بھی ہے

راؤ تہذیب حسین ————— رحیم یار خان

نہ ان کا مذہب دمسلمک نہ دین ہے کوئی
یہ آدمی ہیں مگر آدمی کے دشمن ہیں
یہ صرف کھیل سمجھتے ہیں کھیلنا خون سے
عجیب لوگ ہیں جو زندگی کے دشمن ہیں

رزمیہ حیدر ————— کراچی

کوئی وعدہ وفا نہ کر کے مجھے
بے وفا لوگ اچھے لگتے ہیں



اس ماہ میں

اس ماہ کے اقتباس

غلاموں کا الزام لگانا

حضرت لقمان ایک شخص کے غلام تھے۔ وہ امیر اپنے تمام غلاموں میں لقمان ہی کو بہت کمزور اور بد رو پاتا تھا۔ وہ امیر سب غلاموں کو میوہ چھنے کے لیے باغ روانہ کیا کرتا تھا۔ لقمان بھی ان سب غلاموں کے ساتھ ساتھ جاتے تھے۔ سر سے پیر تک عقل مجسم مگر صورت گالی رات کی طرح سیاہ تھی۔ وہ غلام جو میوے جمع کرتے ان میں سے خود بھی کھا جاتے تھے۔ ایک بار امیر کو خبر ہو گئی اس نے دریافت کیا تو غلاموں نے جواب دیا کہ لقمان کھا گیا۔ امیر، لقمان پر خفا ہوا اور ان پر سختی کرنے لگا۔ جب حضرت لقمان نے عرض کی کہ اے مالک! خدا کے پاس بے ایمان بندے کی بخشش نہیں لہذا بہتر یہ ہے کہ آزمائش کی جائے اس کی صورت یہ ہے کہ گرم پانی سب کو پلایا جائے اور ایک جنگل میں آپ سوار ہو کر گھوڑا دوڑائیں اور ہم سب آپ کے گھوڑے کے ساتھ دوڑیں۔ اس کے بعد بھیدوں کے کھولنے والے خدا کی مدد سے تو اصلی چور کو پا جائے گا۔

امیر نے گرم پانی تیار کرایا اور سب غلاموں کو خوف کے مارے پیٹا پڑا اور پھر ان کو جنگلوں اور کشتزاروں میں خوب دوڑایا۔ اس دوڑ

دھوپ سے ان کا جی متلا نے لگا اور آخر کار سارا کھایا پیا نکل گیا اور لقمان کے جوتے ہوئی وہ صرف پانی نکلا۔

جب لقمان کی حکمت یہ کچھ کر سکتی ہے تو مالک الملک کی حکمت کھوٹے کھرے کو الگ کر کے دکھانے میں کیا کچھ نہیں کر سکتی۔

حکایت رومی سے اقتباس

عانیہ نیازی۔ ربوہ

میرادل

میرے دل نے مجھ سے کہا کہ میں ان چیزوں سے محبت کروں جن سے دوسرے لوگ نفرت کرتے ہیں اور ان لوگوں سے دوستی کروں جنہیں دنیا ملامت کرتی ہے۔

میرے دل نے مجھ سے کہا کہ جب دوسرے لوگ سو رہے ہوں تو میں پہرہ دوں اور وہ جاگتے ہوں۔ تب مجھ کو خواب ہو جاؤں کیونکہ میں عمر بھر ان لوگوں کے خواب نہ دیکھ سکا اور نہ انہوں نے میرے خواب دیکھے لیکن اب میرے خواب دن کے وقت پیدا ہوتے ہیں اور جب وہ سوتے ہیں تو میں انہیں رات کی فضا میں آزاد دیکھتا ہوں اور ان کی آزادی پر خوش ہوتا ہوں۔

کلیات خلیل جبران سے انتخاب

نور بانو۔ کوئٹہ

انسان پریشان اس وقت ہوتا ہے جب اس کے دل میں کسی بڑے مقصد کے حصول کی خواہش ہو لیکن اس کے مطابق صلاحیت نہ ہو پر سکون رہنے کے لیے ضروری ہے کہ یا تو خواہش کم کی جائے یا صلاحیت بڑھادی جائے۔
نوسین مدر۔ لاہور

شعر لکھنے سے بات کرنے سے
حق بھلا کس طرح ادا ہو گا؟
عمل بہیم ہی جب نہیں ہم میں
ملک کیونکر پھر کھڑا ہو گا؟
سباس گل۔ رحیم یار خان

☆ عورت کا مطلب ہے چھپی ہوئی چیز۔ لہذا
جتنا چھپ کر رہے گی اتنی ہی افسوسناک ہوگی۔
☆ کسی سے رخ ہوتے ہوئے اتنی گنجائش ضرور
رکھو کہ اگر واپس آنا پڑے تو راستہ کھٹن نہ ہو۔
☆ شک ایک آگ کی طرح ہے جو اچھی
سے اچھی چیز کو بھی جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔
☆ ہماری قسمت کا فیصلہ ہماری زبان کی
نوک پر ہوتا ہے۔
☆ ہر آنکھ دیکھتی ضرور ہے مگر ہر آنکھ محسوس
کرنے والی نہیں ہوتی۔
☆ ہر ایک کی سنیں اور ہر ایک سے سیکھیں۔
☆ کیونکہ ہر کوئی سب کچھ نہیں جانتا۔ لیکن ہر ایک
کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔ اگر قسمت میں سب
کچھ لکھ دیا جاتا تو اللہ سے دعا کا رشتہ کون نبھاتا۔
☆ کبھی کسی کو مت آزمائیں۔ ہو سکتا ہے وہ

مشکل میں ہو اور آپ کی آزمائش پر پورا نہ اترے
تو دکھ صرف آپ کی ذات کو ہوگا۔
فرزانہ شوکت۔ کراچی

ابھی ہجر کا قیام ہے اور دسمبر آن پہنچا ہے
یہ خبر شہر میں عام ہے اور دسمبر آن پہنچا ہے
آنگن میں اتر آئی ہے مانوس سی خوشبو
یادوں کا اثر دھام ہے اور دسمبر آن پہنچا ہے
خاموشیوں کا راج ہے خزاں تاک میں ہے
اداسی بھی بہت عام ہے اور دسمبر آن پہنچا ہے
تیرے آنے کی امید بھی ہو چلی معدوم
نئے برس کا اہتمام ہے اور دسمبر آن پہنچا ہے
خنک رات میں تنہائی بھی چوکھٹ پہ کھڑی ہے
جاڑے کی اداس شام ہے اور دسمبر آن پہنچا ہے
تم آؤ تو میرے موسموں کی بھی تکمیل ہو جائے
نئی رات تو سر بام ہے اور دسمبر آن پہنچا ہے
شاعرہ: ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ
انتخاب: ملک جواد نواز۔ ڈی آئی خان
اس ماہ میں کام کی باتیں

☆ ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھا
کرو۔ ہو سکتا ہے کسی کا بہت بڑا کام تمہاری چھوٹی
سی دعا کا محتاج ہو۔
☆ دل کے درد ازلے کبھی کسی پر مکمل بند نہیں
کریں۔ غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔
بعض لوگ واپس لوٹنا بھی چاہتے ہیں لیکن انہیں
درد ازلے بند ملتے ہیں۔
☆ ادب کا درد ازلہ اتنا چھوٹا اور تنگ ہوتا
ہے کہ اس میں داخل ہونے کے لیے اپنا سر جھکانا
پڑتا ہے۔

☆ سچے دوست خوشیوں میں زینت اور
پریشانیوں میں سہارا ہوتے ہیں۔
☆ شکر ہے صرف گری ہے، ورنہ اعمال تو
عذاب دالے ہیں۔

☆ میں (ایم بی بی ایس) اور (بی ایچ ڈی)
بھی کرلوں تو اپنی ماں کا چہرہ دیکھ کر بھی اس کی
پریشانی نہیں بتا سکتی۔ مگر میری ماں بے شک اسے
اپنا نام بھی لکھنا نہیں آتا مگر پھر بھی وہ میری
منگراہٹ کے پیچھے چھپا دہ دکھ اور میری آنکھوں
کے اندر رکھی ہوئی پریشانی پڑھ لیتی ہے۔

I Love you Maa

شائقہ یاز۔ لیہ

اس ماہ میں محبت

بہت بے بس بنا گئی ہے
محبت وحی کی صورت
کیوں دل پر نازل ہوتی ہے
محبت ابر کی مانند
کبھی تو برس جاتی ہے
کبھی اپنے پیاسوں کو
پیا سے ہی دشت میں بھٹکاتی ہے
محبت وحی کی صورت
کیوں دل پر نازل ہوتی ہے
ہمیشہ بہت تڑپاتی ہے
کسی کی یاد دلاتی ہے
کبھی تو اس آجائے
کبھی یونہی ستاتی ہے!

سحر مبین۔ فیصل آباد

اس ماہ کی ہری مرچیں

شوہر نے کار چلاتے ہوئے بیگم سے کہا۔
”ذرا کار کی کھڑکیاں تو کھول دو گری سے برا حال
ہو رہا ہے۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”چپ چاپ بیٹھے
رہو۔ پیچھے ہمارے پڑوسی اسلم صاحب کی کار
آ رہی ہے انہیں پتا چل جائے گا کہ ہماری کار میں
ایئر کنڈیشنر نہیں ہے۔“

☆

ایک آدمی نے اپنے نوکر سے کہا۔ تم سب کو
صاحب اور صاحبہ کہہ کر بلایا کرو۔ نوکر نے ادب
سے جی اچھا صاحب کہا۔ کچھ دنوں کے بعد نوکر
بھاگتا ہوا مالک کے پاس آ کر بولا۔ صاحب جی
صاحب! وہ ہمسائے کی بیلی صاحبہ نے ہمارے
چوزے صاحب کو دبوچ لیا ہے اور اسے کھا گئی ہے۔

فاطمہ ظہیر۔ کراچی

محبت وحی کی صورت
کیوں دل پر نازل ہوتی ہے
کبھی تھم جائیں سب دھڑکنیں
کبھی دل زردوں دھڑکاتی ہے
کبھی رکنے لگیں سانسیں
کبھی جینا سکھاتی ہے

محبت وحی کی صورت
کیوں دل پر نازل ہوتی ہے

پیارے ہی دنیا کے
حسین سنے سجاتی ہے

کبھی ستائے بے وجہ
کبھی پہرہاں رلاتی ہے

محبت وحی کی صورت
کیوں دل پر نازل ہوتی ہے

کبھی تو خیال ہی کافی
کبھی دیدار بھی کم ہے

عجب بے ربطی ہے یہ

خوشبو

”یہ ادھار میں اپنے پیٹ سے کیوں نہ کر لوں جس کو میں جنت میں اس سے بہتر غذا کھلا سکتا ہوں۔“
عروج فاطمہ۔ کراچی

16 دسمبر 2016ء

(آرمی بیلک اسکول پشاور کے شہید بچوں کو خراج عقیدت)

قلم، کتابیں، بستے خون میں لت پت ہیں
ننھے منے بچے خون میں لت پت ہیں
ماؤں نے جوتیوں میں دے کر بھیجے تھے
انڈے اور پرائے خون میں لت پت ہیں
سرخ ہوئی ہے پیٹوں شرٹوں کی رنگت
بوٹ، جرابیں، ٹکے خون میں لت پت ہیں
جن میں دن بھر بچے چہکا کرتے تھے
آج وہ سارے کمرے خون میں لت پت ہیں
معصوموں کی لاشوں کو اب کیا معلوم
ان کے کھیل کھلونے خون میں لت پت ہیں
ان ماں باپ کی آنکھوں کا اب کیا ہوگا
جن کے سارے سنے خون میں لت پت ہیں
خوشبو جیسی بیٹیاں لہو لہان ہیں اور
پھولوں جیسے بیٹے خون میں لت پت ہیں
چھوٹی چھوٹی بات پر لڑنے والوں کے
منے منے جھگڑے خون میں لت پت ہیں
کل سے لوٹ کر گھر نہیں آئے ہیں بچے
کل سے سب دروازے خون میں لت پت ہیں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
☆ حضرت انسؓ سے روایت ہے نبی کریم صلی
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص اس وقت
تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے
(مسلمان) بھائی کے لیے بھی وہ چیز پسند نہ کرے جو وہ
اپنے لیے پسند کرتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

☆ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے
کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”جو
شخص تم میں سے کسی برائی کو (ہوتے) دیکھے تو
اسے اپنے ہاتھ سے بدل (روک) دے۔ اگر
(ہاتھ سے روکنے کی) طاقت نہیں ہے تو زبان
سے (اس کی برائی کو واضح کرے) اگر اس کی بھی
طاقت نہ ہو تو دل سے (اسے برا جانے) اور یہ
ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔“ (مسلم)

سیدہ نورین۔ کراچی

حضرت علیؓ کا ادھار

قصاب آواز لگا رہا تھا۔ ”تازہ گوشت ہے
لے لو۔“

وہاں سے حضرت علیؓ کا گزر ہوا۔ قصابی نے
آپ کو بھی آفر پیش کی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا:
”آج میری جیب اجازت نہیں دیتی۔“

قصاب بولا۔ ”میں آپ سے ادھار کر سکتا
ہوں۔“ آپ نے حکمت آمیز جواب فرمایا۔

واصف آج فلک کو دیکھ کے لگتا ہے

سورج، چاند ستارے خون میں لت پت ہیں
شاعر: جبار و اصف
انتخاب: ایم جے قریشی

لفظوں سے خوشبو

☆ ہمسفر وہ نہیں جو آپ کا ساری زندگی
ساتھ نبھائے بلکہ ہمسفر تو وہ ہے جو آپ کو لمحوں
میں پوری زندگی دے جائے۔

☆ اچھا سوچیں اور اچھا بولے کیونکہ بدزبانی
اور بدگمانی دو ایسے عیب ہیں جو انسان کے کمال کو
زوال میں بدل دیتے ہیں۔

☆ انسان مکان بدلتے ہیں۔ رشتے بدلتے
ہیں دوست بدلتے ہیں لیکن پھر بھی دکھی رہتے
ہیں کیونکہ وہ اپنا رویہ نہیں بدلتے۔

☆ زندگی جینے کے دو راستے ہیں بھول جاؤ
انہیں جنہیں معاف نہیں کر سکتے اور معاف کرو
انہیں جنہیں بھول نہیں سکتے۔

☆ پریشانی خاموش ہونے سے کم، صبر
کرنے سے ختم اور شکر کرنے سے خوشی میں بدل
جاتی ہے۔

☆ قابلیت اور کردار زندگی میں ساتھ ساتھ
چلتے ہیں قابلیت آپ کو بلندی پر لے جاتی ہے
جب کہ اچھا کردار آپ کو ہمیشہ بلند رکھتا ہے۔

عانیہ نیازی۔ ربوہ

میرانا م محبت ہے

کیا نام ہے تیرا، کیوں شوخ ہے تو؟ کیوں
بے باک ہے تو؟ کسی کے دل کی امنگ ہے۔ کسی
کے سینے کی سانس ہے؟ تو کس ویس سے آئی
ہے؟ کس کی نگاہوں کی جستجو ہے؟ کس کی تمناؤں
کی یادگار ہے تو؟

میں نے اٹھلا کر غرور سے کہا۔
نقدس سے میری تخلیق ہوئی، ستاروں میں،
میں نے پرورش پائی، پھولوں سے میں نے رنگینی
لی، کلیوں کی سانس بنی اور موسیقی سے میں نے
ترنم لیا۔ ہر ذرے اور ہر فضا میں، میں ہوں،
پاکیزگی میں روح ہے اس دل کی جستجو کرتی ہیں
جہاں صداقت کے ہالے ہیں اور ان اجالوں
میں شرافت کی نگاہیں اور انتظار کی بانہیں ہوں
بے باک اس لیے ہوں کہ حسن سے نور حاصل کیا
ہے۔ میرا نام محبت ہے۔

ثناء کنول اللہ وتہ۔ لودھراں

مکافات عمل.....!

ہمارے معاشرے میں کئی گھرانوں میں
بوڑھے والدین کو اپنے اوپر بوجھ سمجھا جاتا ہے۔
ایسے ہی ایک شخص نے اپنے بوڑھے والد کو بیوی
کے ڈر سے کہا:

”ابا جی میں مجبور ہوں، میں آپ کو اب گھر
میں نہیں رکھ سکتا۔ میں آپ کو تھوڑی دور چھوڑ آتا
ہوں، کھانا وقت پر دے آیا کروں گا اور یہ ایک
کمبل رکھ لیجیے۔ رات کو اوڑھنے کے کام آئے
گا۔“

جب بوڑھے آدمی کا پوتا گھر آیا تو اس نے
دادا کے بارے میں پوچھا۔ والد نے جواب دیا
کہ ان کو فلاں جگہ چھوڑ آیا ہوں۔ پوتا فوراً اس جگہ
گیا اور بڑے میاں سے آدھا کمبل کاٹ کر واپس
لے آیا۔

والد نے کہا۔ ”یہ تم نے کیا کیا، تمہارے دادا
کے پاس تو صرف ایک کمبل تھا۔“
لڑکے نے جواب دیا۔ ”یہ آدھا کمبل میں
نے آپ کے لیے رکھا ہے جب آپ بوڑھے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہوں گے تو آپ کو دے دوں گا۔“

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

ہماری بھی سنئے.....!

☆ ”میں اپنی بیوی سے بالکل نہیں ڈرتا۔“

”کیا واقعی؟“

”ہاں، البتہ بیوی کے غصے سے بہت ڈرتا ہوں۔“

☆ ”سنو! آج ایک لڑکی مجھے دیکھ کر ہنسی

تھی۔“

”اچھا..... مگر کیوں؟“

”کیونکہ میں اس کے سامنے کچڑ میں پھسل

گیا تھا۔“

☆ ”کل میں نے ایک بچہ چوں کی دکان

کھولی تو پولیس مجھے پکڑ کر لے گئی۔“

”ارے ایسا کیوں؟“

”کیونکہ میں نے وہ دکان تالا توڑ کر کھولی تھی۔“

☆ ”آم کے آم گھلیوں کے دام کیسے وصول

ہوتے ہیں؟“

”جب خوب صورت بیوی کے ساتھ ڈھیر

سارا جہیز بھی ہاتھ آئے۔“

☆ ”محبوبہ کو چاند سے تشبیہ دی جاتی ہے

جب کہ بیوی کو؟“

”سورج سے..... وہ بھی سوانیزے والے۔“

امتیاز احمد۔ کراچی

مہکتی کلیاں

☆ جس کو جیسے حالات دنیا میں پیش آتے

ہیں وہ ویسے خیالات دنیا کو دے جاتا ہے۔

☆ عورت کا دماغ اتنا کم ہوتا ہے کہ اس کی

اپنی ضرورت بھی پوری نہیں کر سکتا۔

☆ دل تو میرا بہت بڑا ہے لیکن میرے پاس

پیسے بہت کم ہیں۔

☆ اندھا اندھے کو منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔

☆ دنیا کی کوئی شے کسی کی نہیں حتیٰ کہ جسم اور

روح بھی۔

☆ قدم بڑھا دیہ سڑکیں تمہارے لیے ہیں۔

☆ ردی سے کتابیں ڈھونڈ کر پڑھ لیا کرو۔

☆ دنیا میں اگر کوئی شے سجا کر رکھنے کے

قابل ہے تو وہ کتابیں ہیں۔

☆ جہالت بیماریوں کی موجب ہے۔

☆ میرے رشتے داروں کو میں نہیں میرا

مکان پسند ہے۔

ایم جے قریشی۔ ڈی آئی خان

محبت

خواہش کم ہے

مگر عادت چھوٹی نہیں

دل

آج بھی بے تاب ہے

تجھے سب سے چرا لینے کو!

محبت میں ایک ہی بات تو زیادہ ایسی ہے

جو محبت کو منواتی ہے کہ کتنی ہی صدیاں کیوں نہ

بیت جائیں، کیسی ہی بے وفا یاں کیوں نہ ملی

ہوں۔ کیسے ہی کھن مرا حل آگزرے ہوں۔

محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ محبت ہی تو ایسی شے

ہے جو ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ چاہے جیسا ہی رخ

اختیار کر لے مگر اپنا آپ منواتی رہتی ہے۔

ایک بار جس دل میں گھر کر جائے وہاں سے

فرار نہیں لیتی۔

سحر بین۔ فیصل آباد

☆.....

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ انجسٹ [242] دسمبر 2016ء

فردا پھر سے کہنا

نظم

دسمبر

وہ جذبات
جو میرے دل میں
تیرے لیے
شدت اختیار کیے جا رہے ہیں
ان کے اظہار کے لیے
میں چاہتی کہ
الفاظ خوب تر ہوں
جو میرے دل میں
شدت اختیار کیے جذبات کا
تم کو
اس قدر احساس ضرور دلا دیں
جتنے کے اہل
میرے جذبات واقعی ہیں

اور

پھر تم آگاہ ہو جاؤ گے
میرے دل و زندگی میں تیری اہمیت سے
اور تم جان جاؤ گے
کہ

تمہاری ہلکی مسکان کی خاطر
کوئی خود میں بخوشی حوصلہ رکھتا ہے
اپنی جان بھی لٹا دینے کا.....!

دن کے اجالے میں
رات کی تاریکی میں
سرمایہ کی پہلی بارش میں
خزاں کے پت جھڑ میں
محفل کی رونقوں میں
دسمبر کی اداسی میں
مجھے صرف تمہاری ہی یاد آتی ہے
دل کو بے چین کر جاتی ہے
انکھیوں میں نمی سی لے آتی ہے
خوابوں کا اک جہاں بسا بی ہے
تم سے صرف یہی بات کہنی ہے
کبھی تو لوٹ کے آؤ

دن کے اجالے میں
رات کی تاریکی میں
سرمایہ کی پہلی بارش میں
خزاں کے پت جھڑ میں
محفل کی رونقوں میں
دسمبر کی اداسی میں
کبھی تو لوٹ کے آؤ

ماریہ یاسر

سنو دوستو

جو بھی دنیا کہے

سحر مبین

WWW.PAKSOCIETY.COM
243 دسمبر 2016ء

کینوس کسی مصور کی بن جائے

معصوم بھولا پن

اس پر بل کھائی کالی سنہری زلفیں

ایک بار جو دیکھے مجھ کو

وہ میرا ہو جائے

اس پر یہ کالی آنکھیں

دل کو چھو جائیں

یہ میں جانوں مجھ میں

ایسا کیا ہے

کہ ہر روٹھے ہوئے کو کھینچ لائے

کبھی کبھی جو میں

چاہوں کچھ تبدیلی

اپنی خود میں

جان کر بھی نہ جانے کیوں

ایسا نہ کر پاؤں

ایسا کرنے کی لگن

جانے کیوں وہی دھیمی چال چلوں میں

جانے کیوں لبوں کو

سی لوں میں

نہ جانے کیوں

کبھی کبھی سوچ میں گہری

دانتوں سے ناخن کتروں میں

ایسا تو بے وجہ ہوتا نہیں ہے

پھر کیوں محفل میں

کیوں چپ چپ سی رہوں میں

موسموں سے زیادہ

رنگ بدلوں میں

ڈرتی ہوں کبھی کبھی

زروہ و صمان

اس کو پر کھے بنامان لینا نہیں

ساری دنیا یہ کہتی ہے

پرست پر چڑھنے کی نسبت اترنا سہل ہے

کس طرح مان لیں تم نے دیکھا نہیں

سرفرازی کی دھن میں کوئی شخص

جب بلندی کے رستے پر چلتا ہے تو

سانس تک ٹھیک کرنے کوڑکتا نہیں

اور اسی شخص کا.....

عمر کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے

پاؤں اٹھتا نہیں

اسی لیے دوستو جو بھی دنیا کہے

اُس کو پر کھے بنامان لینا نہیں

فرزانہ شوکت

نہ جانے کیا چاہوں میں

شبنم کی بومدوں

تم میرے رخسار کو یوں

چھو کر

میرے احساس کو نہ جگاؤ

میں خود میں رہتی ہوں مگن

نہ کسی کو مجھ میں مگن کراؤ

میں نٹ کھٹ سی

البیلی سی

شوخ چپقل رنگوں کی مانند

نکھری نکھری فضاؤں سی

میرا روپ تیکھا تیکھا

مسکان میری

ربائی سی

چپ ہوں تو سارا منظر

ایک لمحے کو ٹھہر جائے

جیسے کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

رواؤا بجسٹ 244 دسمبر 2016ء

غزل

دل دکھاتے ہو بات کرتے نہیں
مسکراتے ہو بات کرتے نہیں
کیا محبت کا یہ قرینہ ہے
پاس آتے ہو بات کرتے نہیں
پیار کا جب سوال کرتا ہوں
بھول جاتے ہو بات کرتے نہیں
ترجیحی نظروں سے دیکھنے والے
دل ملاتے ہو بات کرتے نہیں
دل لبھاتی ہے گفتگو تیری
کیوں ستاتے ہو بات کرتے نہیں
تم سے دیکھا نہیں کوئی شاطر
گھر نکالتے ہو بات کرتے نہیں

حکیم خان حکیم

غزل

غم کی ہواؤں میں ہم نے
یادوں کا چراغ جلایا ہے
روشن چہروں نے اب زمانے میں
کیا پھر سے طوفان اٹھایا ہے
آپ ذرا سی محبت کے لیے
دوستوں نے کیا دل دکھایا ہے
گزرے دنوں کی اب بات نہ کر
زمانے میں ہم نے یہ بھی فریب کھایا ہے
کسی کی ذرا سی جھلک کے لیے
ہم نے کیا کھوپا اور کیا پایا ہے
بھول بھی جاؤ پرانی باتیں اب جاوید
یہ کیسا روگ تو نے زندگی کو لگایا ہے

محمد اسلم جاوید

ہائیکو

کالی کالی گٹھا چھائی
تیرے مل جانے سے
مرے دل میں بہار آئی
☆
لمبی سڑک پہ چل لاری
کیوں آزماتے ہیں
ساجن کی وفاداری
☆
خوشیوں کو ترستا ہے
بھائی جب بھائی کو
بن سانپ جوڑتا ہے
☆
سب جھگڑے طے کرلو
دل کے ساغر میں
اب پیار کی مے بھرلو

غزل

جہاں میں جس شخص کا اک راز داں موجود ہے
سمجھ لو اس شخص کا سارا جہاں موجود ہے
ان کی حیران سی نگاہیں پڑھ کے کہہ سکتا ہوں میں
ان کی آنکھوں میں ہماری داستاں موجود ہے
حیف کہ ویرانیوں کی لذتیں تو نے نہ لیں
کیوں بہاروں کا ذکر جب تک خزاں موجود ہے
کیا شکایت نہ کروں، کیوں نہ کروں، پھر کیا کروں
بول سکتا ہوں ابھی میری زباں موجود ہے
وسعت کائنات کی تسخیر میں کھویا نہ ہو
وسعت دل میں بھی اک کون و مکان موجود ہے
میں بھری محفل میں غزل کیوں نہ کہوں امتیاز
کہہ رہا جن کے لیے میں وہ یہاں موجود ہے

ایس امتیاز احمد

WWW.PAKSOCIETY.COM

اچھا کیا تم نے

بہت اچھا کیا تم نے

کہ مجھے اک خواب کی انگلی تھا کر

راستے میں چھوڑ آئے ہو

بہت اچھا کیا تم نے

کہ

مجھے چاہت کے سب پننے دکھا کر
توڑ آئے ہو

بہت اچھا کیا تم نے

کہ میری زندگی کا راستہ تم

موڑ آئے ہو

بہت اچھا کیا تم نے

مجھے تم چھوڑ آئے ہو

سباس گل

دسمبر یادوں کا مہینہ

کبھی دل خوش کبھی اداس ہوتا ہے

دسمبر میں آخر کیا ایسا خاص ہوتا ہے

کبھی دل موسم کو سراہتا ہے

کبھی ماضی میں کھو جاتا ہے

دسمبر میں آخر کیا ایسا راز ہوتا ہے

کبھی بادلوں کو دلاتا ہے، کبھی سورج کو ہنساتا ہے

دسمبر کیوں آخر سب کو اتنا ستاتا ہے

کبھی اپنوں سے جدا کرتا ہے

کبھی پچھڑوں کی یاد دلاتا ہے

دسمبر کیوں آخر اتنا بے درو بے حس ہوتا ہے

مصباح مسکان رؤف

☆
تھکے ہیں اناروں کے
پھیکے پھیکے لگیں
قصے درد کے ماروں کے

☆

سر سبز پہاڑ ہوں گے
دکھیا لوگوں کے
دل کیوں نہ اجاڑ ہوں گے

ریاض حسین قمر

نظم

چلو آؤ، دور کنارے چلتے ہیں

خوابوں کی رنگین سپیاں چنتے ہیں

عشق لہروں سنگ ڈولتے ہیں

اک دوسرے کا ہاتھ تھامے

اس انوکھے منظر میں ڈوب جاتے ہیں

پر اب کیا ہوا

یہ سب منظر تو میرے حخیل کے کردار تھے

اک پاگل لڑکی کے مُردہ خواب تھے

وہ خواب جو اُس کی بے وفائی پر ریزہ ریزہ
بکھرے تھے

چاہ کی متلاش لڑکی کو

دکھوں کے جام ملے تھے

گھٹ گھٹ کر زندگی جینے والی لڑکی

آج بھی مجسمہ سوال بنی پوچھتی ہے

کہ مُردہ خواب زندہ کیسے ہوتے ہیں

آؤ دور کنارے چلتے ہیں

خوابوں کی رنگین سپیاں چنتے ہیں

آسیہ مظہر چوہدری

سیدہ عروج فاطمہ

محبت کی تھی ہم نے

عجیب ہے زندگی کا سفر
ہر قدم پہ آبلہ پائی ہے
قدموں میں لرزش سائی ہے
روح بے چین حال برا
زندگی کی دھول
ہاتھوں سے اڑاتی ہے
چلتے رہے تنہا!
ملا تھا سفر میں ہمسفر سا کوئی
پر نکلا وہ بھی ہر جاتی ہے
اک عمر کی رفاقت بھی جس سے
اک پر سکون کی محبت بھی جس سے
اب اسی محبت سکون نے لی ودائی ہے
وہ ساتھ ہے اب بھی
پاس ہے اب بھی
پھر کیوں
محسوس ہوتی تنہائی ہے
اپنا تو آغاز سے ہی انجام رہا
بس آس ہی جھوٹی لگائی ہے
جب رخصت کیا اسے
لگا خود کو خود سے جدا کیا
محبت کی تھی ہم نے!
تو سزا بھی ہم ہی نے پائی ہے

یا سمین آفریدی

☆

نظم

دھیر آچکا ہے

فضا دھواں دھواں ہے

دیارِ دل

پادوں میں دھل چکا ہے

نکل کر زگ رگ سے

تو سانسوں میں بس

چکا ہے

سوچا ہے تجھے پل پل

تکیے پہ دھرا ہر اشک گواہ ہے

چھائی ہے ہر سمت دھندی

دل کا کبر پکھل چکا ہے

بعد تیرے اے جاناں

بھیکا بھیگا

دھیر

دھکتا لاؤ بن

چکا ہے

شہلا گل سحر صالح

نظم

وہ اک مشرقی لڑکی

کیسے تم کو بتلاتی

اسے تم سے محبت تھی

اس کی زندگی تم تھے

تمہاری ان کہی باتیں

وہ محسوس کرتی تھی

تمہیں کھونے سے ڈرتی تھی

بڑی خاموش ہے اب رہتی

وہ اک مشرقی لڑکی

سندھ

وطن پر رحم فرما اور ان حکمرانوں کو نیک ہدایت دے۔
اللہ ہم سب پر رحم کرے، آمین۔

شہلا گل سحر — کراچی

ڈیر صالحہ اپنا السلام علیکم! غموں کی سرد ہواؤں سے اور دکھوں کی بارش سے اللہ کریم آپ کو محفوظ رکھے، آمین۔ پچھلے مہینے طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے کچھ ار سال نہ کر سکی اور نہ تبصرہ کر سکی۔ فریدہ فرید کے ناول کا اینڈ مزیے کا تھا۔ ثناء کا مکمل ناول متاثر کن تھا۔ روشانے کا ناول بھی اچھا جارہا ہے۔ ”حرم“ کا حسن ہی اس کے لیے مسئلہ بنا جارہا ہے۔ افسانے سارے سبق آموز تھے۔ میری غزل کو زینت بخشنے کے لیے شکریہ، نوازش۔ 2016ء جانے کو پر تول رہا ہے۔ زندگی نے بھاگنے کی ایک رفتار پکڑ لی ہے۔ دنیا اور مادی ضرورتوں نے ایسے دامن جکڑا ہے کہ اپنی اصل اور انسانیت کی پہچان کہیں نہ رہی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر گرم و سرد سے بچائے، آمین۔

ماریہ یاسر — کراچی

سندیسے میں کافی دنوں کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر سے آداب عرض ہے۔ امید کرتی ہوں نورین اور آپی بلکہ سارا پاکستان ٹھیک ٹھاک ہوگا اور عید الاضحیٰ پر خوب گوشت خوری کرنے کے بعد موٹا تازہ ہو گیا ہوگا۔ بی بی بی (جس ماں؟) غیر حاضری کی وجہ طبیعت کی خرابی رہی لیکن اب ہم پھر سے پرانی ٹون میں واپس آچکے ہیں یعنی شمارے پر تبصرہ کرنے کے لیے تیار شیار، بلکہ ہوشیار (بی بی)۔ سب سے

مصباح مسکان رؤف — جہلم

ڈھیروں دعاؤں اور محبتوں کے ساتھ مصباح مسکان رؤف کی طرف سے پیارے پاکستان کی پیاری بہنوں کو السلام علیکم اور موسم سرما کی آمد کی مبارک کے بعد عرض ہے کہ ہم خیریت سے ہیں (تھوڑا بہت فلو، کھانسی ہے) اور آپ سب کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ سب سے پہلے ردا کا شکریہ کہ ماہ نومبر میں میری تحریر کو موقع دیا گیا۔ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف۔ کیا کہنے حورینہ سعد کے ”لائف بوائے کی خوشبو“ کے ساتھ ہر ماہ بڑے ہی عمدہ طریقے اور منفرد انداز میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ویل ڈن حورینہ۔ اس کے علاوہ ”ہم چاہتوں کی دھن بجائیں گے“ اور ”تیری چاہت میں“ زبردست افسانے تھے۔ ”کوہِ عشق“ اختتام پذیر ہوا اور ثناء گلخان سکندر کا بہت افسوس ہوا لیکن اچھا ہوا کہ ارسل کو خیال آ گیا۔ سلسلے وار ناول بھی اچھے جارہے ہیں۔ مکمل ناول ”تم میری دعا ہو“ بہت اچھا لگا۔ وقت کی کمی کے باعث ابھی اتنا ہی پڑھا ہے لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اوور آل سب تحریریں عمدہ ہیں اور جوابی نہیں پڑھیں وہ بھی یقیناً اچھی ہی ہوں گی کیونکہ سب کے عنوان دلچسپ ہیں۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں تو سب ہی کا بہت خوب صورت انتخاب رہا۔ اچھا جی اب اجازت دیں۔ اللہ نے چاباز زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گے۔ جاتے جاتے وطن عزیز کے حالات کی بہتری کے لیے دعا کہ اے اللہ! ہمارے

ہمیشہ ترقی کی سیرھیاں طے کرتا جائے گا۔

ثوبیہ جواد — کھاریاں

ڈھیر ساری چاہت، نیک تمناؤں اور پر خلوص دعاؤں کے ساتھ محبت سے بھرپور سلام۔ ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا ہزاروں خوشیاں نکھیرتا ردا ڈائجسٹ ہاتھوں میں آیا۔ ”گوشہ آگہی“ کا ہر لفظ دل میں اتر گیا۔ ”ردائے جنت“ دل و دماغ کی شمعیں روشن کر گیا۔ سلسلے وار ناول میں ”دیدہ عبرت نگاہ“ بہت اچھا ہے۔ مکمل ناول میں ”تم میری دعا ہو“ ثوبیہ ملک کا بہت پسند آیا۔ ناولٹ میں سائرہ مشعال آف دی منٹھ رہیں۔ افسانوں میں مصباح مسکان آف دی منٹھ رہیں۔ نظیر قاطمہ، سیدہ عروج، دعا محمد ایوب کے افسانے بھی پسند آئے۔ ”ردا کی ڈائری“ میں کرن ناز کا انتخاب بیسٹ تھا۔ اشعار میں اقصیٰ ڈی آئی خان بیسٹ رہیں۔ اس ماہ کے اقوال میں سعدیہ جواد اور غزل میں ایم جے قریشی اور فلک شیر تابش بیسٹ رہے۔ ”خوشبو“ میں تمام بہن بھائیوں نے بہت خوب لکھا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں جبار واصف بازی لے گئے۔ میری اور میری فرینڈز، عروہ، تانیہ آصف، عائشہ، فرحت، اسماء اور آنسہ احسان اللہ کی طرف سے ردا ڈائجسٹ کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔

افشاں علی — کراچی

نومبر کی خنک دار راتوں اور ٹھنڈی ٹھنڈی صبح کا آغاز ہوتے ہی ماہ نومبر کا شمارہ بھی ہمارے ہاتھوں میں آپہنچا۔ ہلکی ہلکی سی ٹھنڈک، سرسراہٹ ہو اور ردا کی چٹ پٹی تحریریں کیا خوب صورت سی شروعات ہے موسم سرما کی! بھاپ اڑانی کافی اور گرم گرم سوپ کی طرح گرم ماہٹ بھرا سلام سب کو قبول ہو۔ ماہ نومبر کا ٹائٹل نومبر کی طرح بہت خوب صورت سا تھا۔ ”گوشہ آگہی“ تو ہر بار ہوتا ہی بہت خاص ہے۔ ہماری رہنمائی کرنی سبق دیتی صالحہ ایسا کی خوب صورت ساتھی قابل احترام بھی ہیں اور قابل تعریف

سہلے تو ہیں بات کروں گی فریدہ فرید جی کی جنہوں نے ستمبر کے شمارے میں ”عید سروے کے نام“ میں میرے لیے پیغام دے کر مجھے بھی یاد رکھا، شکریہ فریدہ جی۔ اس کے بعد میں جا رہی ہوں پیاری بلکہ منفرد لفظوں کی مالک منفرد انداز اپنائے ہوئے ریما جی کا بڑھا ہاتھ تھا منے کے لیے۔ بالکل ریما میں آپ کا یہ دوستی بھرا ہاتھ تھا منے کے لیے ہی آئی ہوں۔ ایک بات بتاؤں آپ اور مجھ میں ایک چیز کا من ہے وہ یہ کہ ہم دونوں ہی ایک ایک عدد بیٹی کی والدہ ہیں اور میری پری کا نام ہے حورین ایمان۔ تو پھر ہماری دوستی پکی (ٹھیک ہے؟) اب بڑھتے ہیں اکتوبر کے شمارے کی طرف تو ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سارا ردا ہی اعلیٰ تھا۔ فریدہ فرید کا مکمل ناول تو بہت ہی زبردست رہا۔ مریم شیراز کا نام مجھے کچھ نیا سنا لگا۔ افسانے سارے ہی بہترین تھے۔ غرض سارے کا سارا ردا ہی نہایت جاندار اور شاندار تھا۔

فرزانہ شوکت — کراچی

السلام علیکم! صالحہ آئی آپ کیسی ہیں۔ آپ کے انٹرویو نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ آپ کی جدوجہد کی کہانی پڑھی اور خود میں ایک عزم اور حوصلہ پایا کہ کوئی چیز ناممکنات میں سے نہیں ہے اگر ہم سچے دل، خلوص اور لگن سے کسی چیز کے لیے کوشش کریں۔ ہمارے ردا کو دن دو گنی اور رات چو گنی ترقی طے، آمین۔ میری سب لکھاری بہنوں کو میرا پیار بھرا سلام۔ میں کم ہمتی ہوں میرا رابطہ آپ لوگوں سے دل اور خلوص کا ہے۔ سب بہنوں کو خدا خوشیاں اور رحمتیں عطا کرے (آمین)۔ سب بہنیں بہت اچھا اور بہت پیارا تحریر کرتی ہیں۔ اول صفحے سے اینڈ تک سب کی کوششیں دل خوش کر دیتی ہیں اور شدت سے انتظار رہتا ہے ردا کا کب کیم آئے اور ردا ہاتھ آئے۔ میری طرف سے سب بہنوں کا شکریہ جو میری لکھی ہوئی تحریروں کو پسند کرتی ہیں۔ آئی انعام اللہ ہمارا ردا

بھی۔ دو حصوں پر مشتمل مکمل ناول ”کوہِ عشق“ بہت خوب صورت ناول رہا۔ پیاری سی شہناز بہت ہی کمال لکھا آپ نے۔ گلہان کے جانے کا افسوس رہا مگر بالآخر سروس کو اپنے سفر کا ہمسفر مل ہی گیا۔ بہت ہی خوب صورت منظر نگاری کے ساتھ مکمل ناول اختتام پذیر ہوا۔ خوب صورت الفاظوں کا چناؤ لیے مون شاہ کا ناولٹ ”موسمِ ہجر“ بھی اچھا رہا۔ ”تم میری دعا ہو“ مکمل ناول بھی بہت عمدہ تھا جب کہ ”میرے درد کی دعا کرے“ اف! سارہ مشعال رلا دیا آپ نے۔ لفظ لفظ درد میں ڈوبا، نامعلوم کب بنت حوا کے درد کو درماں ملے گا نہ جانے کب بنت حوا کو اس ظالم معاشرے سے رہائی و انصاف ملے گا۔ تینوں مستقل سلسلے وار ناول ابھی پڑھے نہیں اس لیے تبصرہ نہ دینے پر معذرت۔ اب آتے ہیں افسانوں کی دنیا میں ”وہ بے چارے“ ہلکا پھلکا مزاح سے بھرپور افسانہ تھا۔ ”میں تم اور فیس بک“ سیدہ عروج فاطمہ نے بھی اچھا لکھا۔ ”تیری چاہت میں“ چاہتوں سے بھرپور افسانہ اچھا تھا۔ ”اعتبارِ محبت شرطِ ٹھہری“ اعتبارِ دلا تا شہلا گل سحر کا افسانہ بھی پسند آیا۔ انقلاب کے در وا کرتے تین افسانے قصور کس کا، مجبوری، بھتان بہت ہی عمدہ پیرائے میں لکھے گئے سبق آموز افسانے رہے۔ ”ہم چاہتوں کی دھن بجائیں گے“ یہ افسانہ تھوڑا کنفیوژ سا لگا۔ ”کوہِ سدرہ شاہین کے قلم سے لکھا بہت ہی عمدہ افسانہ اور ٹاپ آف دی افسانہ رہا۔ مختصر پیرائے میں آپ نے بہت خوبی سے غربت جیسی بیماری کو واضح کیا۔ دعا گو ہوں اللہ سے کہ وہ پاکستان کے ہر کوئے کوئے سے غربت و مفلسی ختم کر دے، آمین۔ اکتوبر کے شمارے میں ”ہمیں مار گئی تیری چاہ پیا“ بہت خوب صورتی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا تھا۔ فریدہ فرید نے واقعی بہت شاندار لکھا۔ اکتوبر میں ”دوستوں کے نام پیغام“ میں شہناز کی طرف سے اپنے نام پیغام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پیاری لڑکی یاد

آوردی کے لیے بہت شکریہ۔ بہت اچھا لگتا ہے جب کوئی اپنا یوں دل سے یاد رکھے۔ بہت ساری دعا میں اور پیار آپ کے نام۔ ماہ نومبر میں ”کرن ناز کی ڈائری“ پسند آئی۔ ”اس ماہ میں“ تو سبھی زبردست تھا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں فرزانہ شوکت، شہناز کنول اللہ دتہ، ایس امتیاز احمد، جبار و اصف اور سید بشارت شاہ کی شاعری پسند آئی۔ ردا کی شان ”سندیے“ تو ہر بار ہوتے ہی ہیں جاندار۔ رابعہ افضال، زاہدہ ہاشمی، رضوانہ آفتاب، کیمتی آرا نے سندیے کو خوب رونق بخشی۔ نور بانو! ڈیڑھ اتنا مختصر سندیہ؟ اگلی بار تفصیلی تبصرہ ہونا چاہیے۔ صبا عبدالغنی، فریدہ فرید، فرزانہ شوکت آپ سب کہاں غائب ہیں؟ دل عزیز زاہدہ زاہی! آپ کا سندیہ پڑھا، دل چھوٹا نہ کریں امید اچھی رکھیں، اللہ آپ کو اولاد جیسی انمول نعمت سے جلد نوازے گا، انشاء اللہ۔ آخر میں تمام قارئین بہنوں، لکھاری بہنوں اور تمام دوستوں سمیت صالحہ اپنا اور نورین ملک کے لیے ڈھیروں دعا میں اور پر خلوص محبتوں کے سنگ افشاں علی کو اجازت۔

جواب: آپ کی ایڈوائس کا بہت شکریہ۔ ہر ادارہ اپنی پالیسی کے مطابق کام کرتا ہے۔

سفینہ خورشید کوٹری

میری طرف سے پیاری صالحہ آپ اور پورے ردا اسٹاف کو چاہتوں سے بھر اسلام۔ سب سے پہلے آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں ردا میں شامل ہونے کا موقع دیا اور نورین ملک کو ہماری طرف سے ڈھیر سا راپار۔ ہمیں ”خوشبو“ سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ شازیہ مصطفیٰ اور روشانہ جی آپ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ سچ بہت مزا آتا ہے ردا تو ہماری جیلی کا حصہ ہی لگتا ہے اور آپ کیا ہمیں بھی اجازت ملے گی افسانہ وغیرہ لکھنے کی؟ ٹوہیہ ملک آپ نے بہت اچھا لکھا۔ ردا میں تو سب اچھا ہی ہوتا ہے، کس کس کی تعریف کریں۔ اب اجازت دیں انشاء اللہ پھر حاضر

ہوں گے، شکریہ۔

کر جگمگاتا رہے، آمین۔

☆ سوئیٹ سفینہ اردا آپ کا اپنا رد ہے ضرور لکھئے۔

عانیہ نیازی

ربوہ

پیاری آپ! اور ردا کی تمام پیاری لکھاری اور قاری بہنوں کو میرا چاہت میں لپٹا سلام الفت قبول ہو۔ مجھے یقین ہے کہ رب تعالیٰ کی رحمت سے آپ سب لوگ ٹھیک ہوں گے اور کافوں میں لپٹے دسمبر کی سرد مہری اور سنج ادائیاں برداشت کر رہے ہوں گے موندگ چھلی اور کانی کے مزے کے ساتھ۔ چلیں اب بات ہو جائے ردا کی۔ سب سے پہلے میں فریدہ فرید کو اتنا خوب صورت ناول لکھنے پر مبارک بادوں کی۔ لفظوں کی خوب صورت مالا سے سجا خوب صورت ناموں جذیوں سے سجا ایک منفرد ناول تھا جو تین اقساط پر مشتمل مسلسل تین ماہ تک میری توجہ سمیٹا رہا۔ عناس نام بہت خوب صورت تھا۔ فریدہ اس طرح کی تحاریر سے ہمیشہ یونہی سر پرانزدی رہا کریں۔ بہت سی دعائیں آپ کے لیے۔ سلسلے دار ناولز میں تینوں ناولز قمر و ش، شازیہ جی اور روشا نے بہت خوب صورتی سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ مکمل ناول میں شاء ناز نے ایک منفرد موضوع پر قلم اٹھایا اور آغاز سے اختتام تک سب یادگار رہا۔ ثوبیہ ملک ”تم میری دعا ہو“ خوب صورت نام کے ساتھ خوب صورت ناول تھا۔ ناولٹ دونوں کچھ اداس کر گئے۔ افسانوں میں سبھی افسانے بہترین تھے خاص کر کٹورہ، قصور کس کا، اعتبار محبت۔ ”وہ بے چارے“ بہت اعلیٰ افسانہ تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو میں چھی سوچ میں پڑ گئی کہ مرد بھی مظلوم ہوتے ہیں صرف خواتین نہیں ہیں۔ بیٹھے رونق لگاتی ہیں یوں لگتا ہے آسنے سامنے بیٹھے باتیں ہو رہی ہوں اور پیغامات کا سلسلہ بھی دلچسپ ہے۔ سب کے پیغام پڑھ کر اچھا لگتا ہے۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

☆.....

سیدہ فرزین حبیب۔ کراچی

محترمہ صالحہ آپ! نورین جی اور ردا اسٹاف کو فرزین کا محبت بھرا سلام! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ کے بعد اب سردی کی گلابی شاموں کی آمد آمد ہے۔ دعا ہے کہ آپ سب دوستوں کی زندگی پھولوں کی طرح مہکتی رہے۔ اب آتی ہوں اپنے پیارے ردا کی طرف۔ سب سے پہلے ان تمام قاری دوستوں کا شکریہ جنہوں نے میری نئی زندگی کے آغاز پر خوب صورت دعائیں ردا کے توسط سے مجھ تک بھیجیں اور میرے شادی احوال کو پسند کیا، خاص طور پر صبا عبد الغنی، فریدہ فرید، درخشاں ضیاء اور افشاں علی۔ فریدہ فرید جی! آپ نے جو دعائیں اشعار میرے لیے بھیجے اس کے لیے میں دل سے آپ کی مشکور ہوں اور مجھے خوشی ہے صالحہ آپ کی بدولت نہ صرف اتنا اچھا معلوماتی اور معیاری میگزین پڑھنے کو ملتا ہے بلکہ اس کے ذریعے آپ جیسی خوب صورت دل رکھنے والی دوستوں سے بھی آدمی ملاقات ہو جاتی ہے۔ ردا میں ہر ماہ نئے ناموں کا اضافہ دیکھ کر دلی راحت ہوتی ہے کیونکہ ردا کی دن بدن شہرت، ترقی کی علامت ہے۔ قمر و ش اور شازیہ مصطفیٰ کے نئے سلسلے وار ناول بھی ہمیشہ کی طرح پراثر اور دلوں کو چھو لینے والے ہیں۔ عائشہ ذوالفقار کا ناول ”چل اڑ جا اب تیری باری“ بھی کافی دلچسپ اور نصیحت آموز تھا۔ بانی شاعری اور کچن سلیکشن تو ہوتا ہی باکمال ہے۔ اپنی سوئیٹ سی صالحہ آپ کی تحریر ”میراں“ بہت ہی متاثر کن تھی۔ کانی دنوں تک اپنے سحر میں جکڑے رہی۔ دانیہ آفرین کو بھی شادی اور ڈینٹسٹ (Dentist) بننے پر دلی مبارک باد۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت، ردا ادب کے آسمان پر سب سے خوب صورت ستارہ بن

دوستوں کے نام سے بیغیہ

پیاری دوست ربیعہ کے نام

عظیم انسان عبدالستار ایدھی کے نام

میری دل سے دعا ہے کہ میری بچپن کی
دوست ربیعہ عرف ربی جہاں بھی رہے خوش
رہے، اور ہنستی مسکراتی رہے۔ پیاری ربیعہ تمہیں
دل سے سلام۔ تم میری لاکھوں میں سے ایک
دوست ہو۔ پتا نہیں کتنی محبت کرتی ہوں تم سے بس
یہ معلوم ہے اپنی ربی کے لیے جان بھی دے سکتی
ہوں۔ پیاری دوست! آپ کے لیے شعر
پتھر کی دنیا پتھر کے لوگ
ہماری دوستی سے جلتے ہیں لوگ
او کے بائے کھڑوس، رب بلیس یو۔
سمیرا گل ناز۔ کراچی
پیارے دوستوں کے نام

مسافر! شہر خموشاں میں
وہ جو ایک تازہ قبر روشن ہے
یہ پھولوں سے محبت
اور دلوں پر حکمرانی کرنے والے
بادشاہ!
ستار ایدھی کا مقام استراحت ہے
عجب انداز سے یہ دل زدوں کا تاجور
رخصت ہوا ہے
کہ اشکوں اور پھولوں کا تفاوت مٹ گیا ہے
زندگی اور موت کی تفریق اوجھل ہو گئی ہے
مسافر!

ہر بیگی شام کا منظر بہت دلگیر ہوتا ہے
عجب سے آبلہ پائی
میرے آنگن میں بکھرے زرد پتے بھی
تمہیں آواز دیتے ہیں
ہر کالی شام میں لپٹا ہوا معصوم چہرہ
ہونٹوں پر جمی پیاس برسوں سے
ہوائے سرد کے جھونکے
جو یہ تن من جلاتے ہیں
تو پھر تمہیں یاد کرتے ہیں
جاناں!

ہم زمین والے ہیں ایسے لوگ ہوتے ہیں
کہ جو چلتے ہیں تو پاؤں کے نیچے
خاک کی تکلیف بھی محسوس کرتے ہیں
بھلا یہ درد دل کی بے بہادولت
کہاں ارزانی ہوتی ہے؟
کسی مٹی کے پتلے پر
محبت اور عقیدت کی بہاریں کیوں برستی ہیں؟
اگر اس راز کو تم پاسکو تو
مجھ کو بھی ہمراز کر لینا
انتخاب: شائقہ ایاز۔ کھاریاں

صرف تمہیں ہی یاد کرتے ہیں
ہمیں تم یوں ستاؤ نہ
دسمبر لوٹ آیا ہے
تم بھی لوٹ آؤ نا

ملک جواد نواز۔ کھاریاں

میرے ہسپتال کے نام

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش رکھے، ان کی ہر خواہش پوری ہو جو وہ چاہیں وہ پا لیں اور مجھ سے ہمیشہ ایسے ہی پیار کرتے رہیں۔
سفینہ وکیل۔ حیدر آباد

اپنی سسر شفاء حسان کے نام

السلام علیکم! میری بہن محترمہ ثناء باجی کیسی ہو،
دل سے دعا ہے کہ اللہ پاک تمہاری ہر دعا قبول
فرمائے اور تم اپنیائف میں بہت خوش رہو۔ حسان
بھائی سے کہو۔۔۔ ہماری سسٹر کو گھر بھیج دیں
کیونکہ تم بہت دن میں آئی ہو۔ آئی مس یو میری بہن
تم مجھے بہت عزیز ہو۔ کیونکہ میں آپ کی چھوٹی سسٹر
ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھنا میری بہنا آئی لو یو۔“

سمیرا گل ناز یوسف - کراچی

یسارے بھائی کے نام

میرے پیارے بھائی بنیامین 26 دسمبر کو تمہاری سالگرہ ہے۔ اللہ کا الاکھ شکر جو ہمیں ہر سال یہ دن دکھاتا ہے۔ جب تمہیں ایک سال بڑا دیکھتے ہیں۔ بہت بہت سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے اور کامیابیوں سے نوازے، آمین۔

میڈم (آہم) بقول تمہارے خود کے باٹ،
گار جینس اینڈ etc گرل (با با با۔ اب اتنی
تعریفیں لکھتے ہاتھ ہی تھکنے تھے) سحرش رانا! 9

WWW.PAKSOCIETY.COM

.....★.....



تنگہ یوٹی

اروی کے پتوں

اجزاء

گوشت (بغیر ہڈی کا) : آدھا کلو
دہی کا

گرم مصالحہ : ایک چائے کا چمچ
اورک لہسن پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ

دہی : ایک چھٹا کلو

نمک، بہر خمرچ : حسب ذائقہ
سوکھا دھنیا پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ

سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچ
تیل : ایک کپ

اجزاء

اروی کے پتے : دو عدد

سرخ مرچ نمک : حسب ضرورت

پیاز : آدھا پاؤ

ہر ادھیا : آدھی گٹھی

بیس : ایک پاؤ

انار دانہ : دو کھانے کے چمچ

بہر خمرچ : چار عدد (باریک کٹی ہوئی)

خشک دھنیا : دو چائے کے چمچ

کوننگ آئل : حسب ضرورت

ترکیب: اروی کے پتوں کو دھو کر باریک کاٹ لیں۔ ہری مرچیں بھی دھو کر باریک کتر لیں پیاز کو باریک پھموں میں کاٹ لیں۔ دھنیے کو توڑے پر ہلکا سا بھون لیں۔ ہرے دھنیے کی پیتاں چن کر باریک کاٹ لیں۔ انار دانے کو چن کر صاف کر لیں۔ اب ان تمام اجزاء کو بیسن میں ملا دیں۔ نمک مرچ بھی ڈال دیں اور پانی ڈال کر اس آمیزے کی پیسٹ سی بنالیں کچھ دیر رکھا رہنے دیں۔ ایک کڑا ہی میں تیل گرم کر کے اس میں پہلے سے تیار کردہ آمیزے سے پتوں کا کر تیل لیں۔ گولڈن براؤن ہونے پر کڑا ہی سے نکال لیں اور ہری مرچ انار دانے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ترکیب: گوشت کے ایک ایک انچ کے چوکور ٹکڑے کٹوا لیں۔ گوشت ابال کر نیم گلا لیں اور پانی خشک کر کے اتار لیں (پانی اتنا ہی ڈالیں جو مناسب ہو) سب مصالحے پیس کر دہی میں ملا دیں۔ گوشت کے ٹکڑے ٹھنڈے ہو جائیں تو ان پر یہ دہی لگا دیں۔ اب یہ ٹکڑے سلاخوں پر پرو دیں اور دہکتے ہوئے کونکوں پر سینک کر سرخ کر لیں۔ ساتھ ساتھ تھوڑا تھوڑا سا گھی ٹپکاتے جائیں۔ جب وہ کونکوں پر گر رہا ہے اور اس کا دھواں ٹکوں کو لگتا ہے تو بہت مزے دار ہو جاتے ہیں۔ کئی ہوئی پیاز کے پھموں اور لیموں کی قاشوں کے ساتھ پیش کریں۔

چکن کاسینڈو جودگرلڈ پوٹیشوز

اجزاء

بریڈ سلائس

: آٹھ عدد (مکھن لگا کر
ٹوسٹ کر لیں)

چکن قلعے

: چار عدد

لیٹس لیف

: چار عدد

ادرک لہسن پیسٹ

: ایک کھانے کا چمچ

تندوری مصالحہ

: دو کھانے کے چمچ

دہی

: دو کھانے کے چمچ

لیمن جوس

: دو کھانے کے چمچ

آئل

: دو تین کھانے کے چمچ

گرین چٹنی

: چار کھانے کا چمچ

ٹماٹر

: چار سلائسز

پیاز

: چار یا چھ رنگز

گرلڈ پوٹیشوز کے لیے

: تین چار عدد (ابال لیں)

آلو

: ایک کھانے کا چمچ

آئل

: حسب ذائقہ

اجزاء

مٹن

: آدھا کلو

چاول

: آدھا کلو (دو کئی رکھ کر ابال لیں)

لیموں

: ایک عدد (رس نکال لیں)

تیز پات

: ایک عدد

بڑی الائچی

: دو عدد

پیاز

: دو عدد (سلائسز کاٹ لیں)

لونگ

: دو تین عدد

ہری مرچ

: دو تین عدد (کاٹ لیں)

اٹلے

: چار عدد (ابال لیں)

فرائیڈ پیاز

: پون کپ

دہی

: آدھا کپ

لہسن پیسٹ

: ایک کھانے کا چمچ

اجزاء

آلو

: ایک پاؤ

گاجر

: ایک پاؤ

ادرک پیسٹ : ایک کھانے کا چج
 زیرہ : آدھا چائے کا چج
 دار چینی : ڈیڑھ چائے کا ککڑا
 زردہ اور سرخ : ایک ایک چٹکی (تھوڑے سے
 رنگ : پانی میں الگ الگ حل کر لیں)
 ہر ادھنیا : آدھی گٹھی (چو پڈ)
 گٹھی سرخ مرچ : حسب ذائقہ
 نمک : حسب ذائقہ
 آئل : حسب ضرورت

فریش کریم : دو تین کھانے کے چج
 اجینو موتو : آدھا چائے کا چج
 کالی مرچ پاؤڈر : آدھا چائے کا چج
 نمک : آدھا چائے کا چج
 ترکیب : گرم مکھن میں پیاز اور لہسن ہلکا سا
 فرائی کر کے ٹماٹر ڈال کر پکائیں۔ پھر اسے پانی
 ڈال کر بلینڈ کر لیں۔ اب اس میں اجینو موتو، چکن
 کیوبز، نمک، کالی مرچ، کریم اور لیموں کا رس ڈال
 کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ بیس پچیس منٹ پکا کر
 کارن فلور ڈالیں اور تھوڑا سا گاڑھا کر لیں۔ تیار
 ہونے پر بادیاں پھول اور ہرے دھنیے سے سجا کر
 سرو کریں۔

سیلڈ سینڈویچ

اجزاء
 بریڈ : تین سلائسز (کنارے کاٹ لیں)
 انڈا : ایک عدد (بال کر سلائسز کاٹ لیں)
 ٹماٹر : ایک عدد (سلائسز)
 کھیرا : ایک عدد (سلائسز)
 بند گوشت (کس) : آدھا کپ
 کی گٹھی

سلاد پتا (چو پڈ) : آدھا کپ
 مایونیز : تین کھانے کے چج

کالی مرچ پاؤڈر : حسب ذائقہ
 نمک : حسب ذائقہ

ترکیب : پہلے سلائس پر مایونیز لگا کر انڈے، ٹماٹر
 اور سلاد پتے کی تہ لگائیں۔ دوسرے سلائس پر مایونیز
 لگا کر ادھر پر گٹھیں اور اس پر ٹماٹر، کھیرے اور بند گوشت کی
 تہ لگائیں۔ تیسرے سلائس پر مایونیز لگا کر نمک اور کالی
 مرچ پھٹرکیں اور ادھر پر رکھ دیں۔ تیار ہونے پر کاٹ کر
 سرو کریں۔

ترکیب : دار چینی، لونگ، بڑی الائچی، زیرہ اور
 تیز پات ڈرائی روٹ کر کے گرائنڈ کر لیں۔ آئل
 گرم کر کے پیاز، لہسن اور ادرک پیسٹ ہلکا سا فرائی
 کریں۔ اب مٹن، نمک، گٹھی سرخ مرچ، ہری مرچ
 اور آدھا ہر ادھنیا ڈال کر بھونیں۔ دہی اور گرائنڈ کیا
 گٹھیا مصالحہ شامل کر کے بھونیں پھر پانی ڈال کر
 گوشت گلا لیں۔ پین میں چاولوں کی تہ لگا کر اوپر
 مٹن پھیلائیں پھر چاول کی مزید ایک تہ لگا دیں۔
 آخر میں بقیہ ہر ادھنیا، فرائیڈ پیاز، لہسن جوس، زردہ
 اور سرخ رنگ ڈال کر دم لگا دیں۔ ابلے ہوئے
 انڈوں سے سجا کر گرم گرم سرو کریں۔

ٹماٹو سوپ

اجزاء
 ٹماٹر : آدھا کلو (چو پڈ)
 پیاز : ایک عدد (چو پڈ)
 بولین چکن کیوب : دو عدد
 لیموں : ایک عدد (رس نکال لیں)
 لہسن : پانچ جوے (چو پڈ)
 مکھن : دو کھانے کے چج
 کارن فلور : دو کھانے کے چج
 (تھوڑے سے پانی میں گھول لیں)

سنگھار

ہیں تو آہستگی سے برش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر آپ کے بال گھونگھریالے ہیں تو انہیں خشک ہونے پر برش نہ کریں، بلکہ پہلے ان میں ہاتھوں کی انگلیاں پھیر کر انہیں سلجھالیں، اس کے بعد برش یا کنگھا کریں۔

خواتین عموماً اپنے بالوں میں زیادہ کنگھا نہیں کرتیں۔ دراصل ہمارے بالوں کی عمر سات برس ہوتی ہے اور روزانہ ہمارے سر سے اوسطاً 120 بال گرتے ہیں، تاکہ ان کی جگہ نئے بال اگنا شروع کر دیں۔ اگر آپ بالوں میں زیادہ کنگھی نہیں کریں گے تو یہ بال ڈھیلے نہیں ہوں گے اور نئے بالوں کی جگہ نہیں بن پائے گی۔ سر کی کھوپڑی پر کنگھا کرنے سے سر میں جھج چکنائی بھی دور ہوتی ہے اور مسام کھل جاتے ہیں۔ بالوں کے لیے سیدھی ہموار سطح والا اور نرم دندانوں والا برش بہت مفید ہوتا ہے۔

کیونکہ اچھے دندانوں والا برش آپ کی کھوپڑی کے نشوز کو متحرک کرتا ہے، تاکہ صحت مند بال کی نشوونما ہو سکے، تاہم بہت خشک بالوں پر کنگھا کرنے سے تھوڑا اجتناب برتنا چاہیے، کیونکہ اس عمل سے ناصرف بال ٹوٹتے ہیں، بلکہ ان کی نوکیں بھی پھٹ جاتی ہیں۔

آپ کے بال گیلے ہوں تو برش کے بجائے کنگھی کا استعمال کریں۔ یہ ناصرف بالوں کی انگلیاں سلجھاتی ہے، بلکہ بالوں کو ٹوٹنے سے بھی بچاتی ہے۔ اگر آپ

اکثر خواتین بال سلجھانے میں بہت غلطی کرتی ہیں، جس سے بال گرنے کی رفتار میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ بالوں کی مناسب دیکھ بھال کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ آپ سر پر تیل لگا کر مساج کریں یہ عمل ہفتے میں دو بار کیا جائے تو بہتر ہے۔ ناریل یا سرسوں کا تیل بالوں کو موچھرا نر کرنے کے لیے بہترین ہے۔

یہ عمل آپ سر دھونے سے دو گھنٹے پہلے بھی کر سکتی ہیں۔ اسی طرح شیمپو اور کنڈیشنر کے انتخاب میں بھی احتیاط ضروری ہے۔ بالوں کی ساخت کو مد نظر رکھتے ہوئے شیمپو کا انتخاب کریں۔ کچھ فطری عمل کے علاوہ بہت سی خواتین برش کرتے ہوئے بھی اپنے بالوں کو توڑتی ہیں۔ پہلی غلطی جو عموماً خواتین کرتی ہیں، وہ ہے گیلے بالوں کو برش سے سلجھانا۔ برش اچھے ہوئے بالوں کو مزید توڑتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ گیلے بالوں کو بڑے دندانے والی کنگھی سے سلجھائیں اور سر سے بالوں پر کنگھی کر کے نکالنے کے بجائے بالوں کی نوک سے کنگھا کرنا شروع کریں۔

اگر بال زیادہ اچھے ہوئے ہیں تو پہلے اسے مختلف حصوں میں تقسیم کر لیں اور پھر آہستہ آہستہ کنگھے سے نکالیں بہت زور سے غصے میں آکر بالوں کو جھٹک جھٹک کر برش نہ پھیریں۔ سیدھے بالوں میں اگر گیلے

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

ملائیں اور بلیک ہیڈز پر لگائیں۔ یہ بلیک ہیڈز کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ایک بہت اچھا مونچھراڑز بھی ہے۔

☆ نمک کا پانی گلا صاف کرنے کیلئے بھی ایک بہترین گھریلو ٹونکا مانا جاتا ہے۔ یہ جلد کے داغ دھبوں کو صاف کرنے کیلئے بھی مفید ہے۔ نمکین پانی آپ کے چہرے کی جلد سے اضافی چکنائی کو بھی ختم کرتا ہے۔ نمک کے پانی کو روئی کی مدد سے بلیک ہیڈز پر لگائیں۔ اس کے روزانہ باقاعدگی کے استعمال سے بلیک ہیڈز سرے سے ختم ہو جائیں گے۔

☆ ٹوتھ پیسٹ کو ٹوتھ برش کی مدد سے بلیک ہیڈز پر لگائیں۔ ٹوتھ پیسٹ کو کچھ دیر کیلئے بلیک ہیڈز پر لگا رہنے دیں۔ اس سے چہرے کی اضافی چکنائی ختم ہو جائے گی اور یہ چہرے کو داغ دھبوں سے محفوظ رکھے گا۔ ٹوتھ پیسٹ جلد کو نرم و ملائم بھی کر دے گا۔

☆ شہدنا صرف آپ کے چہرے کو جلد کی جھریوں سے محفوظ رکھتا ہے، بلکہ اس کو اگر ماسک کی طرح چہرے پر لگائیں تو بلیک ہیڈز بھی صاف ہو جاتے ہیں۔ ماسک بنانے کیلئے شہد میں دار چینی کا پاؤڈر ملائیں اور اسے کچھ گھنٹے کیلئے چہرے پر لگا رہنے دیں، پھر بعد میں نیم گرم پانی سے منہ دھولیں۔ چہرے کی جلد تازہ اور ملائم ہو جائے گی۔

☆ ایک سے دو انڈے کی سفیدی میں ایک چمچ شہد شامل کریں اور اسے آدھے گھنٹے تک بلیک ہیڈز پر لگائیں۔ یہ بلیک ہیڈز صاف کرنے کے ساتھ ساتھ چہرے کی جلد کو نرم بھی بناتا ہے۔

☆ ہلکا سا گرم دودھ لے کر اس میں میدہ مکس کر کے پیسٹ بنالیں اور بلیک ہیڈز پر لگائیں۔ تھوڑی دیر بعد دودھ میں بھگوئی ہوئی روئی سے صاف کر لیں۔ جنتے میں دو یا تین دفعہ استعمال کریں۔

.....☆.....

ہموار سطح والا اور نرم دندانوں والا برش استعمال کر رہے ہیں تو آپ کو بہت زیادہ کنگھا کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اسی طرح بالوں کو جنتے میں دو مرتبہ، اگر بہت گرمی ہے ورنہ خشک موسم میں چار روز بعد دھولیا جائے تو کوئی مضا لقمہ نہیں ہے۔ کنڈیشنر اور ہیر ماسک بالوں کی نمی کو محفوظ رکھتا ہے اور انہیں نرم و چمکدار بناتا ہے۔

بالوں کو الجھنے سے بچانے کے لیے رات کو چوٹی بنا کر سوئیں۔ یاد رکھیے بہت زیادہ برش کرنا بھی بالوں کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کے بال بہت خشک اور بھر بھرے ہیں تو انگلیوں کی پوروں پر تھوڑا سا تیل لگا کر بالوں میں پھیریں پھر انہیں سنواریں اس طرح ان کی چمک اور نرمی برقرار رہے گی۔

بلیک ہیڈز کو ختم کرنے کے گھریلو ٹونکے

بلیک ہیڈز جسے کیل مہا سے بھی کہتے ہیں۔ ناک اور گال پر نکلنے والے کالے نشان ہوتے ہیں، جو بہت بدنما لگتے ہیں۔ کافی مہنگی اور اچھی معیاری کریموں کے استعمال سے بھی چھٹکارہ نہیں ملتا۔ اس لیے آج کچھ ایسی گھریلو چیزوں کے بارے میں بتاتے ہیں، جن کے ذریعے اپنے گھر میں بلیک ہیڈز کو مکمل صاف کر سکتی ہیں۔

☆ لیموں کا رس جلد کے ہر مسئلے کے حل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چہرے پر دانے یا اینٹی لیموں کے رس سے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ بلیک ہیڈز کو صاف کرنے کے لیے لیموں کے رس کو دو طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک چمچ چینی میں چار قطرے لیموں کا رس شامل کریں اور اسے بلیک ہیڈز والی جگہ پر لگائیں اور اچھی طرح سے رگڑیں۔ اس سے بلیک ہیڈز بھی صاف ہو جائیں گے اور جلد چمک اٹھے گی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لیموں کے رس میں دہی، شہد اور نمک